حضرت عثمانؓ

تاریخ اور سیاست کی روشنی میں

مصنف:

مصر کے مشہور نقاد اور نامور محقق

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

اردو ترجمہ

علامہ عبد الحمید نعمانی

نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی

جملہ حقوق اردو ترجمہ
کتاب حضرت عثمانؓ
قانونی دائمی بحق
چوہدری طارق اقبال گاہندری
مالک نفیس اکیڈمی کراچی محفوظ ہیں

نام کتاب : حضرت عثمانؓ
تالیف : ڈاکٹر طٰہٰ حسین
ترجمہ : علامہ عبدالحمید نعمانی
ناشر : نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی
طبع : ستمبر ۱۹۸۷ء
ایڈیشن : آفسٹ
ضخامت : ۲۴۰ صفحات

ٹیلیفون
۲۱۳۳۰۳

مطبوعہ : احمد برادرز پرنٹرز۔ ناظم آباد کراچی

فہرست مضامین

حضرت عثمان ـــ صرف تاریخ کی روشنی میں

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
تعارف ـــ محمد اقبال سلیم گاہندری	۵	حضرت عثمانؓ خلافت سے پہلے	۵۷
کتاب کے ماخذ	۱۰	نظام شوریٰ پر تنقید	۶۸
مصنف کا نقطۂ نظر	۱۱	حضرت عثمان رضؓ کا خلیفہ ہونا	۷۱
سیاسی تجربہ	۱۲	خلافت کے بعد سب سے پہلی آزمائش	۷۳
اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد مساوات پر ہے	۱۶	حضرت عثمان رضؓ کے فرمان	۷۷
اسلامی نظام حکومت الٰہی نہ تھا	۲۸	عہد فاروقیؓ کے گورنر جن کو حضرت عثمان رضؓ نے باقی رکھا	۸۲
اسلام کا نظام حکومت جمہوری نہ تھا	۲۴		
اسلام کا نظام حکومت شخصی بادشاہی نہ تھا	۲۶	وظیفوں میں اضافہ	۸۳
اسلام کا نظام حکومت خالص عربی نظام تھا	۳۸	وظیفوں میں اضافہ اور وفود کی طلبی	۸۵
اسلامی نظام حکومت کے عناصر، پہلا عنصر دین	۳۹	صحابہ کبار رضؓ کو عطیات	۸۶
اسلامی نظام حکومت کا دوسرا عنصر مدنی سیادت	۴۰	حضرت عثمانؓ کی رعایا	۸۸
قریشی سیادت	۴۲	قریش رعایا	۸۹
نظام حکومت کے عناصر میں انقلاب	۴۵	انصار رعایا	۹۴
نظام حکومت کی راہ میں پہلی مشکل	۶	حضرت عثمان کی رعایا میں تیسرا گروپ	۹۵
دوسری مشکل	۴۷	حضرت عثمان رضؓ کی رعایا کا چوتھا عنصر	۹۶
تیسری مشکل	۵۲	اپنے اختیار سے گورنروں کا تقرر	۹۸
نگرانی کا جدید اقدام	۵۳	کوفہ پر سعدؓ ابن وقاص کا تقرر اور معزولی	۱۰۰
اقتدار کے خلاف حضرت عمرؓ کی جنگ	۵۴	ولیدؓ ابن عقبہ کا تقرر اور اس کے نتائج	۱۰۳
نظام شوریٰ	۵۶		

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
کوفہ پر سعیدؓ بن العاص کا تقرر	۱۱۱	عمار بن یاسر رضؓ	۱۷۵
کوفہ میں آبادی کی کثرت	۱۱۲	فتوحات پر کوئی اعتراض نہیں	۱۷۸
خطرناک اقتصادی انقلاب	۱۱۳	قدماء کا نقطۂ نظر	۱۸۳
اسلام میں بڑی بڑی جاگیروں کی ابتدار	۱۱۵	تقرری اور برطرفی	۱۹۶
پہلا فتنہ — اخراج اور جلاوطنی	۱۲۰	مالی پالیسی	۱۹۸
ابوموسیٰ رضؓ کی بصرہ سے معزولی اور عبیدؓ بن		حضرت عثمان رضؓ اور مخالفین	۲۰۶
عامر کا تقرر	۱۲۴	معاصرین کی رائے میں تبدیلی	۲۰۸
پورا شام امیر معاویہ رضؓ کے اقتدار میں	۱۲۸	حضرت عثمان رضؓ کے خلاف جرأت	۲۰۹
عمرو بن العاص رضؓ کی معزولی اور ابن ابی سرح		حضرت عثمان رضؓ پر باغیوں کی زیادتی	۲۲۰
کا تقرر	۱۳۱	محاصرے میں شدت اور پانی روک دینا	۲۲۱
محمد بن ابوحذیفہ رضؓ اور محمد ابن ابوبکر رضؓ	۱۳۶	حضرت عثمان رضؓ کے حامیوں کی تیاری	۲۲۲
اشتر کا خط حضرت عثمان رضؓ کے نام	۱۳۹	امداد آنے کی خبر	〃
عبداللہ بن سبا	۱۴۱	باغیوں کا گھر میں گھسنا اور قتل کرنا	〃
مخالفت کی ابتدار کب اور کہاں سے ہوئی	۱۴۶	کیا حضرت عثمان رضؓ آخر وقت میں معزولی	
عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ	۱۴۸	ہونے پر تیار ہو گئے تھے	۲۲۳
سعد بن ابی وقاص رضؓ	۱۵۲	امیر معاویہ رضؓ کی دو تجاویز	۲۲۴
زبیر ابن العوام رضؓ	۱۵۴	دو راستے	۲۲۷
طلحہ ابن عبیداللہ رضؓ	۱۵۶	ایک سوال جس کا جواب ضروری ہے	۲۲۸
علی ابن ابی طالب رضؓ	۱۵۹	حضرت عثمانؓ کی زندگی کے آخری دن	۲۲۹
عبداللہ بن مسعود رضؓ	۱۶۷	امداد کے لئے حضرت عثمانؓ کا صوبوں کے نام خط	۲۳۱
ابوذر غفاری رضؓ	۱۷۱	حاجیوں کے نام حضرت عثمانؓ کا خط	۲۳۲

تعارف

از:-

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم موجودہ دور میں عربی زبان کے سب سے بڑے ادیب اور مصنف ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ عثمان" کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ ہم اس کتاب کا تعارف قارئین کرام سے کرائیں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم مصنف سے اپنے ناظرین کو متعارف کرائیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے ان کے والد ایک غریب اور کثیر العیال کسان تھے اور ان کے تیرہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں جب طٰہٰ حسین تین سال کے تھے تو اس وقت ایک بیماری کی وجہ سے ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، لیکن اندھے ہونے کے باوجود وہ ایک دوست کے سہارے سے مکتب میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہاں انھوں نے قرآن کریم حفظ کیا۔ مکتب سے فارغ ہوکر وہ جامعہ ازہر میں کئی سال تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے آزاد خیال تھے۔ اس لیے جامعہ ازہر کے اساتذہ سے ان کے اختلافات ہوگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری امتحان دینے سے پہلے ہی انھیں سند دیئے بغیر جامعہ ازہر سے نکال دیا گیا۔

اسی زمانے میں مصری اہل علم کی کوششوں سے جامعہ مصریہ قائم ہوگئی تھی، جہاں یورپ کے بعض مشہور مستشرقین بھی تعلیم دیتے تھے، لہٰذا طٰہٰ حسین، جامعہ مصریہ میں داخل ہوگئے اور اطالوی مستشرق نلینو جیسے مغربی اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے شاندار کامیابی حاصل کی، جبکہ انھوں نے مشہور فلسفی اور نابینا شاعر ابوالعلاء معرّی پر اپنا تحقیقاتی مقالہ پیش کیا تھا، اس کے بعد انھیں فرانس بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے ساربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۷ء میں اس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس ڈگری کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے فرانسیسی زبان میں ایک تحقیقاتی مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان ہے "ابن خلدون اور اس کے فلسفۂ اجتماعی کی تشریح و تنقید"

اسی یونیورسٹی میں طٰہٰ حسین کو ان کی ایک ہم جماعت فرانسیسی خاتون نے بہت علمی مدد پہنچائی۔ وہ اس نابینا طالب علم کی محسنہ ثابت ہوئیں۔ ۱۹۱۸ء میں اسی خاتون سے شادی ہوئی۔ یہی خاتون بعد میں ان کی علمی اور ادبی تصانیف میں ان کی شریک کار رہیں۔

فرانس سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین قاہرہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، یہاں آکر انھوں نے "فی الادب الجاہلی" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ عہد جاہلیت کے اکثر اشعار جعلی ہیں۔ اس پر مذہبی حلقوں میں بہت ہنگامہ برپا ہوا، آخرکار لوگوں نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو نظریاتی اختلافات کے باوجود ایک محقق عالم تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۰ء میں طٰہٰ حسین یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اسی عرصے میں مصری حکومت ان کی مخالف ہو گئی اور انھیں قید و بند کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑے، لیکن آخر میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے مصری جامعات کو حکومت کی مداخلت سے آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں جب وہ وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو انھوں نے ثانوی تعلیم سب بچوں کے لیے مفت کر دی اور لازمی تعلیم کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

موجودہ انقلابی حکومت بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت عزت و احترام کرتی ہے۔ وہ اس وقت تمام عرب دنیا کے علمی اور ادبی رہنما ہیں، نہ صرف متحدہ عرب کی جمہوری حکومت نے انھیں اپنے ملک کی سب سے بڑی ادبی انجمن کا صدر منتخب کر رکھا ہے بلکہ عرب حکومتیں بھی تمام علمی اور ادبی کاموں میں ان سے مشورہ لیتی رہتی ہیں انھیں بہت سے علمی و ادبی اعزازات دیئے گئے ہیں۔ نیز آکسفورڈ، روم، لیونز، اور دوسری یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین عربی زبان کے جدید طرز کے انشا پرداز اور جادو بیان مقرر ہیں۔ وہ ادب و تاریخ کے زبردست نقاد، مؤرخ، فسانہ نگار، ادیب اور مفکر ہیں۔ وہ تمام عمر علمی و ادبی تصانیف کے علاوہ مشہور جرائد و مجلات میں اعلیٰ مضامین لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "الایام" کے نام سے لکھی جو دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ وہ اس قدر دلچسپ ہے کہ جدید عربی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اور دنیا کی تمام مشہور یونیورسٹیوں میں نہ صرف داخلِ نصاب ہے بلکہ دنیا کی مشہور زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

الفتنۃ الکبریٰ

اگر ہم ان کی تمام تصانیف کا تذکرہ کریں تو وہ ایک طویل داستان بن جائے گی، لہٰذا ہم اپنی اصل کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ "الفتنۃ الکبریٰ" کے نام سے مصنف موصوف نے دو کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک کتاب میں حضرت عثمان رضؓ کے عہدِ خلافت کا حال تحریر کیا گیا ہے اور دوسری کتاب "علیؓ و بنوہ" کے نام سے ہے جس میں تاریخ کی روشنی میں حضرت علیؓ اور ان کے محترم فرزندوں کے واقعات کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتابیں نہ صرف عرب ممالک میں مقبول ہوئیں بلکہ یورپ کے علمی اور تاریخی حلقوں میں بھی انھیں بہت پسند کیا گیا۔ ان میں تاریخی واقعات کا جس طرح تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے،

انھیں پڑھ کر تاریخ اسلام کا ایک طالب علم حیران رہ جاتا ہے۔ یہاں لسے تاریخی واقعات اس انداز میں ملتے ہیں جن سے وہ اب تک ناواقف رہا اور عام تاریخوں میں اسے ان واقعات اور ان کے علل و نتائج کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ لہٰذا بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں ان کتابوں کا ترجمہ اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرے گا۔

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض کے دور خلافت کے ان سیاسی فتنوں کا تاریخی تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ دور اسلامی تاریخ کا سب سے پیچیدہ اور نازک دور تھا۔ اسی کی بدولت مسلمانوں میں زبردست سیاسی اختلافات رونما ہوئے جو بعد میں مذہبی اختلافات بن گئے اور ان کے نتیجے میں تمام عالم اسلامی میں کشمکش اور اختلافات برپا ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ یہ کتابیں مسلمانوں کے تمام طبقوں کو مطمئن کر سکیں۔ مصنف کے بعض خیالات سے ہمیں بھی اتفاق نہیں ہے اور ہمارے خیال میں ہمارے قارئین کرام کے ایک طبقے کو بھی ان سے اتفاق نہیں ہوگا تاہم ان کتابوں کو پڑھتے وقت قارئین کرام کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ مصنف کا کسی مذہبی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ ایک آزاد خیال مسلمان ہے اس نے کسی فرقہ وارانہ تعصب سے یہ کتاب نہیں لکھی ہے بلکہ اپنی فہم و بصیرت کو استعمال کر کے غیر جانب دارانہ تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ کتابیں تحریر کی ہیں، ان واقعات سے اس نے جو نتائج نکالے ہیں وہ ایک حد تک غیر جانب دارانہ اہل علم طبقے کو مطمئن کر سکیں گے، اور وہ اس کی تحقیقات کی داد دیں گے۔ مصنف خود اپنے مقدمہ میں اپنا نقطہ نگاہ اس طرح واضح کرتا ہے:۔

"میں اس معاملے کو ایک ایسی نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہوں جو جذبات اور تاثرات کی عینک سے ہو کر نہ گذرتی ہو، جو مذہبی فرقہ وارانہ تاثیر اور تعصب سے خالی ہو۔ یہ نگاہ ایک مؤرخ کی ہو سکتی ہے جو اپنے آپ کو ان رجحانات، جذبات اور ذاتی خواہشوں سے بالکل الگ کر لیتا ہے۔ خواہ ان کے مظاہر کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔"

آگے چل کر مصنف نے اس فتنہ و فساد سے حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

"اس کتاب کے پڑھنے والے آگے چل کر پڑھیں گے کہ یہ نازک حالات اور خطرناک معاملات حضرت عثمان رض، حضرت علی رض اور ان کے موافقین و مخالفین سب کے بس سے باہر تھے، وہ یہ پڑھیں گے کہ جن حالات میں حضرت عثمان رض مسند نشین خلافت ہوئے، اگر اس وقت کسی دوسرے شخص کو بھی ان حالات میں تخت خلافت پر بٹھا دیا جاتا تو وہ بھی اسی طرح فتنہ و فساد کے مصائب میں مبتلا ہوتا، اور لوگ اس سے بھی جدال و قتال کرتے۔"

مصنف نے آگے چل کر اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں قابل قدر بحث کی ہے جو موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ مصنف نے اپنی دونوں کتابوں میں عجیب وغریب تاریخی انکشافات کیے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً انھوں نے یہ لکھا ہے کہ آخر زمانے میں حضرت عمر فاروق رضہ یہ فرمایا کرتے تھے:۔

"جو کام میں نے بعد میں کیا، اگر پہلے کرتا تو دولت مندوں سے ان کی فالتو دولت لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا"

ہمارے خیال میں صحیح تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ مصنف نے اس کا جو تاریخی پس منظر بیان کیا ہے اور پھر ان واقعات کے اسباب وعلل کا کھوج لگانے میں جو کدوکاوش کی ہے وہ مصنف کے تاریخی معیار کو بہت بلند کرتی ہے۔ اس سے موجودہ نسل کو تاریخی واقعات کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے، کیونکہ اس طرح قدیم مؤرخین کے ناقص بیانات کی کمی بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔

مصنف نے حضرت عمر رضہ کے نظامِ حکومت پر بحث کرتے ہوئے موجودہ دور کی اسلامی حکومتوں کے لیے یہ نہایت عمدہ اصول بیان کیا ہے:۔

"مجھے نہ تو اشتراکیت سے بحث ہے اور نہ کمیونزم سے واسطہ ہے اس لیے کہ حضرت عمر رضہ نہ سوشلسٹ تحریک کے علمبردار تھے اور نہ کمیونسٹ تحریک کے لیڈر تھے، انھوں نے ملکیت کو اس طرح تسلیم کیا ہے جس طرح رسول اکرمؐ اور قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے قرآن اور رسول اکرمؐ کے فیصلوں کے مطابق سرمایہ داری اور دولت مندی کی اجازت دی ہے۔ بلکہ مجھے یہاں صرف یہ بات بتانی ہے کہ سماجی انصاف، انفرادی ملکیت اور سرمایہ داری کو حرام کیے بغیر بھی قائم کیا جا سکتا ہے جس کے لیے آج کل بعض جمہوریتیں کوشاں ہیں اور یہ چاہتی ہیں کہ انفرادی ملکیت اور سرمایہ داری کے باوجود سماجی انصاف کا مکمل نظام عملی طور پر پیش کریں۔"

موجودہ حالات کے تقاضے کے مطابق ہم نے مصنف کے چند خیالات کا یہ نمونہ پیش کیا ہے لہٰذا ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی اور یہ پڑھنے والوں کی تاریخی اور اسلامی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرے گی ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کے فتنہ وفساد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو ان کی موجودہ گتھیوں کے سلجھانے میں مدد دے گی، اور ان واقعات سے وہ عبرت اور نصیحت حاصل کریں گے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر کے ایک ممتاز ادیب اور نقاد ہیں۔ عربی شعر و ادب پر، عربی شعراء پر اور تاریخ و تمدن کے بہت سے مسائل پر ان کی تصنیفات نے پورے عرب ممالک میں ان کو غیر معمولی شہرت اور نمایاں امتیاز کا مالک بنا دیا ہے۔ ان کی ادبی مقبولیت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ "الایام" کے نام سے دو حصوں میں انھوں نے جو آپ بیتی لکھی اس کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب نے "الفتنۃ الکبریٰ" کے عنوان سے دو کتابیں لکھیں، عثمان رض اور علی رض و بنوہ۔ یہ دونوں کتابیں تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے اسلامی تاریخ کے سب سے پیچیدہ اور نازک عہد کی تحقیق اور تنقید ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم پہلی کتاب پیش کرتے ہیں، اردو ادب میں شاید یہ اپنے نوع کی پہلی کتاب ہو۔

عبدالحمید نعمانی

کتاب کے ماخذ

اس کتاب میں ایسا کوئی تاریخی تذکرہ نہیں اور نہ قدمار کی ایسی کوئی رائے ہے۔ جس کی سند مندرجہ ذیل کتابوں میں سے کسی ایک کتاب میں نہ ہو۔

سیرت ابن ہشام
طبقات ابن سعد
انساب الاشراف .... بلاذری
تاریخ البخاری
کتب احادیث اور ان کی شرحیں
تاریخ الامم الملوک .... طبری
تفسیر طبری
کامل .... ابن اثیر
البدایہ والنہایہ .... ابن کثیر
تاریخ ابن خلدون
تاریخ دمشق .... ابن عساکر
تاریخ بغداد .... خطیب بغدادی
تاریخ عقد الجمان .... عینی
نہایۃ الارب .... نویری
مسالک الابصار فی الممالک الامصار .... عمری
الخطط .... مقریزی
ولاۃ مصر وقضاتہا .... کندی
النزاع والتخاصم .... مقریزی

رسائل الجاحظ
الفصل فی الملل والاہوار والنحل .... ابن حزم
الفرق بین الفرق .... عبدالقاہر بن طاہر بغدادی
التبصیر فی الدین .... ابو مظفر اسفرائینی
الملل والنحل .... شہرستانی
منہاج السنۃ .... ابن تیمیہ
معاصرین کی کتابوں میں بجز ذیل کی کتابوں کے ہم نے کچھ نہیں پڑھا۔
اشہر مشاہیر الاسلام .... رفیق بک عظم
الاسلام واصول الحکم .... استاد علی عبدالرزاق
کتاب عثمان رض بن عفان .... استاد شیخ صادق ابراہیم عرجون
مستشرقین کی کتابوں میں سے ہم نے صرف دو کا مطالعہ کیا ہے:۔
کیتانی کی کتاب انالی دی اسلام
اور
اسلامی دائرۃ المعارف کی متفرق فصلیں

☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُصنّف کا نُقطۂ نظر

بس پھر میری کوشش ہوگی کہ یہ بحث حق اور صرف حق کی خاطر ہو، میرے پیش نظر اصلیت رہے اور انصاف۔ میں حضرت عثمان رض کے قضیے میں حصہ لینے والے اسلامی فرقوں میں سے کسی ایک کی ہواخواہی نہیں چاہتا۔ میں عثمانی حمایت اور علوی شیعیت دونوں سے علیحدہ ہوں۔ میرے فکر و نظر کا گوشہ اس معاملے میں وہ نہیں جو خود حضرت عثمان رض کے معاصرین کا تھا۔ جنھوں نے اس کشمکش کے مصائب برداشت کیے۔ اور ان کے ساتھ یا ان کی وفات کے بعد اس سے پیدا ہونے والے نتائج کا شکار بنے رہے۔

میں جانتا ہوں کہ لوگ آج بھی اس مسئلے میں اسی طرح مختلف خیالات رکھتے ہیں جس طرح حضرت عثمان رض کے عہد میں رکھتے تھے، ایک طرف عثمانی ہیں جو صحابہ رض میں شیخین رض کے بعد حضرت عثمان رض کا درجہ سب سے اونچا جانتے ہیں، دوسری طرف شیعی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رض ہی کا درجہ مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں شیخین رض کے لیے بھی قدر و منزلت کی کوئی گنجائش نہیں، کچھ لوگ بیچ میں ہیں، معتدل عثمانیت اور معتدل تشیع۔ یہ لوگ تمام صحابہ رض کی عظمت و احترام کے قائل ہیں۔ اَلسَّابِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ کا درجہ بھی پہچانتے ہیں، پھر صحابہ رض میں باہمی فضیلت ان کے نزدیک ضروری نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تمام صحابہ رض نے پوری سرگرمی کے ساتھ کوششیں کیں، اللہ کے، اللہ کے رسول ﷺ کے، اسلام کے اور مسلمانوں کے مخلص رہے بعضوں سے کچھ کوتاہیاں بھی ہوئیں، لیکن وہ سب کے سب اجر عظیم کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ ان کا مقصد نیک تھا۔ ان کی نیت قصور اور کوتاہی کی نہ تھی، اسلام کے مختلف فرقوں کے یہ وہ خیالات ہیں جن پر وہ پوری شدت کے ساتھ جمے ہوئے ہیں اور جن کی مدافعت اور حفاظت میں مرٹنے کو تیار ہیں، اس لیے، کہ ان خیالات کا مرکز دین اور ایمان ہے اور ایک بندۂ مومن کے اعمال و معتقدات کی تمنا اپنے دین کی حفاظت، اپنے یقین کی مضبوطی اور خدا کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں۔

میں اس معاملے کو ایک ایسی نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہوں جو جذبات اور تاثرات کی عینک سے ہو کر نہ گذرتی ہو، جو مذہب کی تاثیر اور عقیدے کے اثر سے خالی ہو۔ یہ نگاہ ایک مؤرخ ہی کی ہوسکتی ہے۔ جو اپنے آپ کو رجحانات، جذبات اور خواہشات سے بالکل الگ کر لیتا ہے جن کے مظاہر خواہ

کتنے ہی مختلف ہوں۔

مسلمانوں کی ایک جماعت، اور کہنا چاہیے بہترین مسلمانوں کی جماعت اس فساد آفرین حادثے سے قبل ہی اللہ کی رحمت کو پہنچ چکی تھی، اس کا دنیا سے اٹھ جانا اس کے ایمان اور اس کی قدر و منزلت میں کسی کمی کا باعث نہ ہو سکا، بلکہ ان کی موت نے ان کو لغزش کے مواقع اور مشتبہ پوزیشن سے بچا لیا۔ اور وہ دنیا سے کامیاب اور شر و فساد سے محفوظ رخصت ہوئے۔ لیکن صحابہ رضؓ کی ایک پوری جماعت قضیۂ عثمانی کے وقت موجود تھی۔ جب مسلمان اپنی تاریخ میں شدید ترین بے رحمی کے ساتھ اس قضیے میں حصہ لے رہے تھے، بعض صحابہ رضؓ نے اس میں حصہ نہیں لیا، نہ کم نہ زیادہ، وہ حصہ لینے والوں سے کنارہ کش رہے۔ انھیں میں کے ایک، خدا کی ان پر رحمت ہو، سعد بن وقاص رضؓ ہیں، جنھوں نے فرمایا:-

لا اقاتل حتی تاتونی بسیف	میں تو اسی وقت لڑوں گا جب تم مجھے ایسی تلوار
یعقل ویبصر وینطق فیقول اصاب	لا کر دو گے جو فکر و نظر رکھتی ہو اور جو یہ بولتی ہو کر
ھذا واخطا ذاک۔	اس نے غلطی کی ہے اور یہ حق بجانب ہے۔

میں حضرت سعد رضؓ اور ان کے ساتھیوں کی راہ چلنا چاہتا ہوں رضی اللہ عنہم۔ طرفین میں سے مجھے نہ ایک سے پرخاش ہے نہ دوسرے سے بحث و تکرار، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے علم اور لوگوں کی اطلاع کے لیے ان حالات کا پتہ چلاؤں۔ اس ماحول تک پہنچوں جس نے طرفین کو فتنے میں مبتلا کیا اور باہمی خصومت کا جلال بھڑکا کر بڑی بے دردی کے ساتھ ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا اور اب تک کرتا جا رہا ہے۔ اور غالباً قیامت تک کرتا جائے گا۔

اس کتاب کو پڑھنے والے آگے چل کر پڑھیں گے کہ حالات کی نزاکت اور معاملات کی خطرناکی، حضرت عثمان رضؓ، حضرت علی رضؓ اور ان کے موافقین و مخالفین سب کے بس سے باہر تھی۔ وہ واقعات میں پڑھیں گے کہ جن حالات میں حضرت عثمان رضؓ مسند نشین خلافت ہوتے، اگر اس وقت کسی دوسرے کو بھی تختِ خلافت پر بٹھا دیا جاتا تو وہ بھی ان ہی کی طرح فتنہ و فساد کے مصائب میں مبتلا ہوتا اور لوگ اس سے بھی جدال و قتال کرتے۔

سیاسی تجربہ

میں تو اس خیال کا ہوتا جا رہا ہوں کہ حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کے تخیل میں جو اسلامی خلافت تھی، وہ ایک دلیرانہ تجربہ اور فدا کارانہ اقدام تھا، جس کی تکمیل نہ ہو سکی اور شاید اس کی تکمیل کے مواقع ممکن نہ تھے، اس لیے کہ یہ تجربہ وقت سے بہت پہلے شروع کر دیا گیا۔

اب تک انسانیت نے تجربہ اور آزمائش کی کتنی ہی منزلیں طے کرلی ہیں، حکومت اور تشکیل حکومت کے سلسلے میں اس کی ترقی اور تجربہ کی پرواز اونچی سے اونچی چوٹی تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن کیا خیال فرماتے ہیں آپ! کیا انسانیت ان ترقیوں اور تجربوں کے بعد بھی ایک ایسے نظامِ حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہوسکی، جس میں سیاسی اور سماجی انصاف کے تقاضے ٹھیک اسی طرح پورے ہوتے ہوں جس طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اپنے اپنے عہد میں پورا کرنا چاہتے تھے۔

انسانیت نے طرح طرح کی حکومتیں بنائیں، ایک حکومت تو وہ بنائی جس میں بادشاہ اپنے آپ کو خدا تصور کرتے تھے۔ دوسری حکومت ایسی بنائی جس میں بادشاہ خدا تو نہیں لیکن دیوتاؤں کا سایہ تسلیم کیا گیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ بادشاہ کی ذات کسی ایک خدا کا پرتو ہے۔ یہ سارے بادشاہ غلط یا سچ خیال کرتے تھے کہ ان کا اقتدار عوام کا عطیہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ان کے آبا و اجداد سے ان کو ملا ہے جو خود خدا تھے، یا ان دیوتاؤں کا عطیہ ہے جن کا روپ انھوں نے لیا ہے۔

اب اس قسم کے بادشاہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں جو احکام بھی صادر فرماتے اس میں صرف ان کی خواہش یا خوشی کارفرما ہوتی۔ عوام خوش ہوں گے یا ناراض؟ اس کی ذرا بھی پروانہ ہوتی، اور ہوتی بھی کیسے؟ عوام تو پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اطاعت کریں، حکم بجالائیں، انھیں ناراض یا خوش ہونے کا کوئی حق نہیں، ان کی مرضی یا ناپسندیدگی بادشاہوں کی طبیعت میں کسی تبدیلی کا باعث نہیں ہوسکتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ آفتاب کے نکلنے سے اور اس کے ڈوب جانے پر ناراض ہوتے ہیں لیکن وہ نہ آپ کی خوشی پر طلوع ہوگا اور نہ آپ کا غصہ اس کو غروب ہونے سے روک سکتا ہے۔

انسانیت کو اس قسم کے بادشاہوں اور ان کی حکومتوں کے تجربے سے برائے نام راحت ملی، زیادہ تر تو عذاب ہی عذاب رہا۔ تب اس نے اس میں انقلاب لانے کی کوشش کی، اس کی یہ کوشش کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئی۔ چنانچہ مٹھی بھر اشراف اور امرا کی حکومت ظہور میں آئی جو اپنے درمیان تو مساوات کے قائل تھے لیکن عوام کے لیے وہ بھی اس کے روادار نہ تھے، اسی طرح مطلق العنان ظالموں اور سفاکوں کا دورِ حکومت آیا یہ مظلوم عوام کی دستگیری کے نام سے میدان میں آئے اور اعلان کیا کہ وہ امرا اور سرداروں کے مظالم سے عوام کو نجات دلائیں گے، لوگوں میں عدل و مساوات پھیلائیں گے، قوی اور کمزور، غریب اور امیر کا فرق مٹادیں گے۔ مضبوط اور معذور دونوں ان کی نگاہوں میں ایک ہوں گے، لیکن یہ سب تو وہ نہ کرسکے، الٹے لوگوں پر مظالم کا دائرہ کچھ وسیع کردیا۔ اور عوام کے ساتھ اشراف کو بھی ذلیل کرکے انسانیت کو اسی ذلت اور بدبختی کے گڑھے میں پہنچا دیا جہاں سے وہ نکلنا چاہتی تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ گہرے غار میں۔

اس کے بعد انسانیت نے ایک ایسے نظامِ حکومت کا منہ دیکھا جس کے متعلق اس کا خیال ہے، کہ وہ بہترین اور معقول ترین دستورِ حکومت ہے۔ عوام اس کے ذریعے سیاسی انصاف اور سماجی مساوات کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ نظامِ حکومت یہی جو عوام کو اپنے معاملات کا خود مختار بناتا ہے اور ان کو حق دیتا ہے کہ اپنے لیے جیسا نظم چاہیں بنائیں، انسانیت نے اس نظام کا تجربہ کیا، بلاشبہ اس کے ذریعہ اسے کو انصاف کی ایک قسط مل گئی، لیکن پوری پوری وہ بھی وصول نہ ہو سکی، اور جو ہوئی وہ بالکل سطحی اور سرسری۔ چنانچہ آج بھی لوگ کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہوسکے اور ایک جہتی اور اشتراک سے محروم ہیں۔ عوام کی لگام بظاہر بلاشبہ عوام کے ہاتھ میں ہے لیکن حقیقت کچھ بھی نہیں۔ پوچھا یہ جاتا ہے کہ عوام کیا چاہتے ہیں؟ اب اگر جواب میں اختلاف ہوا، اور اختلاف کا ہونا یقینی ہے تو فیصلہ اکثریت کے حق میں ہو جاتا ہے اور اقلیت کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس طرح اکثریت کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اقلیت کو پامال کرے، اس کی مرضی کے خلاف اس پر حکمراں ہو اگر اکثریت کو یہ موقع دیا جاتا کہ وہ براہِ راست اپنے اوپر اور اقلیت پر حکمرانی کرتی تو شاید یہ نظام انصاف سے قریب تر اور مظالم سے بڑی حد تک خالی ہوتا۔ لیکن اکثریت کی براہِ راست حکومت کی کوئی شکل نہیں۔ اس لیے ہوتا یہ ہے کہ اکثریت حکومت کرنے کے لیے اپنے نمائندے چنتی ہے۔ یہ چناؤ تشدد، دھمکی، مکر، رشوت اور لالچ کے بل بوتے پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا نہ بھی ہو، لیکن اس سے تو مجالِ انکار نہیں کہ یہ نمائندے جنھیں اکثریت پسند کرتی ہے اور حکومت کی لگام ان کے ہاتھ میں دیتی ہے، انسانوں ہی میں سے کچھ انسان ہوتے ہیں جن میں پختگی بھی ہوتی ہے اور خامی بھی، سختی بھی ہوتی ہے اور نرمی، قناعت بھی ہوتی ہے اور حرص بھی، ایثار بھی ہوتا ہے اور خود غرضی بھی ہوتی ہے۔ پس یہ ہر وقت راہ سے ہٹ جانے کی زد میں ہیں۔ اور ان سے خطرہ ہے کہ اعتدال کی حد سے بڑھ جائیں اور اپنے ساتھ عوام کو بھی غلط راہ پر لے جائیں اور بالآخر بے انصافی کی وہی فضا پیدا کردیں جو مستبد بادشاہوں، خود غرض اشراف اور خونخوار سفاکوں کے عہدِ حکومت میں تھی۔

اتنی ساری مشکلات اور ابھی ہم سیاسی انصاف کی منزل میں ہیں، پھر آپ اندازہ کیجیے کہ سماجی مساوات کی امید کس طرح کی جاسکتی ہے جس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ سب لوگ حکومت کی نگاہ میں برابری کا درجہ رکھتے ہوں، بلکہ زندگی کے وسائل اور ذرائع سے بھی تمام لوگ یکساں مستفید ہوسکیں، اب تک انسانیت نے مختلف زمانوں، مختلف خاندانوں اور مختلف حالات میں جتنے بھی نظامِ حکومت دیکھے، ان میں سے ایک بھی اس سماجی مساوات کا حامل نہیں ہو سکا۔ جو عوام میں وہ اطمینان وہ خوشگواری اور وہ امن پیدا کر دے، جو [illegible] اور خوف سے خالی ہو۔ پھر عہدِ حاضر کی انسانیت کو جو کچھ حاصل ہے، وہ بھی [illegible] بحث کا محتاج نہیں۔ [illegible] قانون کی نگاہ میں [illegible] آزاد اور مساوی بنا دیا ہے

لیکن وہ ان کے لیے سماجی مساوات کی ضامن نہیں۔ اشتراکیت نے ضرور کم وبیش سماجی مساوات اور انصاف کے تقاضے پورے کیے۔ چنانچہ اس نے طبقاتی فرق کو دور کیا، مزدوروں کو اپنی محنت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ محتاجوں اور معذوروں کے لیے باعزت زندگی گذارنے کی سبیل نکالی۔ لیکن یہ سب کچھ دے کر ان سے ان کی آزادی چھین لی اور ڈکٹیٹر شپ نے تو سبھی کچھ غصب کر لیا، نہ آزادی باقی رہی اور نہ مساوات۔ عوام کو بری طرح شرمناک حد تک غلام اور حکومت کا آلۂ کار بنایا۔ اور اس غلامی کے بدلے میں بھی اس نے ان کو کچھ نہیں دیا۔

ایک صالح حکومت کی تلاش میں انسانیت نے یہ سارے راستے طے کیے اور نظامِ حکومت کے خوب خوب تجربے کرتی رہی، لیکن ہنوز دلّی دور است، اب تک وہ ظلم وستم کی شاکی ہے اور غلامی کی ذلتوں سے تنگ آ چکی ہے، وہ متلاشی ہے ایک ایسے صحیح اور مستقیم نظامِ حکومت کی جو انسانوں کو آزادی اور انصاف کی نعمت عطا کرے۔ یہ صحیح اور مستقیم نظامِ حکومت وہی ہے جس کے قیام کی کوشش اسلامی خلافت نے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے عہد میں کی تھی، لیکن ابھی اس تجربے کی ابتدا بھی نہ ہو سکی تھی کہ صدیق اکبرؓ اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گئے، ابھی اس تجربے کی راہ میں چند بڑے بڑے قدم ہی اٹھائے تھے کہ فاروق اعظمؓ شہید کر دیئے گئے۔ مزید برآں حضرت عمرؓ ان اقدامات سے پوری طرح مطمئن بھی نہیں ہو سکے۔ اپنی خلافت کے آخری دنوں میں آپ فرماتے تھے کہ جو کچھ میں نے آخر میں کیا اگر وہ پہلے کرتا۔

لو استقبلت من امری ما

استدبرت لاخذت من الاغنیاء	تو دولت مندوں سے ان کی پڑی ہوئی
فضول اموالھم فرددتھا علی	بے کار دولت لے لیتا اور محتاجوں تک
الفقراء۔	پہنچا دیتا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عمرؓ سماجی مساوات کا تقاضا اچھی طرح پورا نہیں کر سکے۔ پھر کسی امیر یا حاکم کا کیا ذکر، مسلم اور غیر مسلم سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی طرح قیامِ عدل کا نہ کسی امیر نے ارادہ کیا اور نہ پورا کر دکھایا، پھر یہ کہ لوگ بھی حضرت عمرؓ کے تجربات سے خوش نہ تھے، عوام آپ سے خائف اور مرعوب تھے اور ڈر کر آپ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، آپ کا بڑے سے بڑا چاہنے والا ہو یا زیادہ سے زیادہ محبوب، کسی کو بھی اس بات کی کامیاب سفارش کا حوصلہ نہ تھا کہ حضرت عمرؓ خود اپنی ذات کے متعلق یا دوسروں کے بارے میں کچھ نرمی اور چشم پوشی سے کام لیں کیونکہ آپ عدل کو ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے۔ اور مفتوحین کو بھی یہ تجربات آخر کار خوش نہ رکھ سکے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ان کی مرضی کے

کے خلاف اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام لیا جاتا ہے، انھیں یہ بھی خیال تھا کہ تمدن اور تہذیب میں ان کا درجہ پہلے ہے۔ عرب تو نو تہذیب ہیں اور ابھی ابھی تمدن آشنا ہوئے ہیں۔ پس یہ بات ان کی مرضی کے بالکل خلاف تھی کہ متمدن اور مہذب لوگوں پر وحشی دیہاتیوں کو مسلط کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ اسی قسم کی ناراضگی کے نتیجے میں شہید کر دیئے گئے۔ ان ہی مفتوحین میں سے ایک نے جب اپنے آقا مغیرہ بن شعبہ کی شکایت کی، اور حضرت عمرؓ نے تحقیق کے بعد کچھ عتاب نہیں کیا تو اس نے آپ کے خنجر بھونک دیا جب کہ آپ نماز کے لیے بڑھ رہے تھے۔

لیکن یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ ہم اس دلیرانہ تجربے پر اس قدر غیر معمولی عجلت کے ساتھ رائے قائم کرلیں ہمارا فرض ہے کہ پوری توجہ اور بصیرت کے ساتھ غور کریں کہ کیا یہ کوئی پائدار چیز تھی، اور کیا یہ ممکن تھا کہ یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا اور اس سے جو مقصد تھا وہ پورا ہو جاتا۔ ہم غور و فکر کے بعد ہی اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو انصاف کی خاطر ہم نے اپنے سر لی ہے اور پھر یہ غور و فکر بہت سی ان مشکلات کے سمجھنے میں ہماری مدد کرے گا جو حضرت عثمان رضؓ کے زمانے میں فتنہ و فساد کا باعث بنیں یا بنائی گئیں۔ اس لئے نہیں کہ حضرت عثمان رضؓ خلیفہ تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ وقت ہی ایسا تھا کہ فتنہ ہو اور بعض لوگ فساد کریں۔

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد مساوات پر ہے

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نظامِ حکومت کی بنیاد یہ تھی کہ وہ اپنے بس بھر مسلمانوں کے معاملات میں نبی ؐ کے نقشِ قدم پر چلیں۔ یہ نقشِ قدم مسلمانوں پر پوری طرح واضح ہو چکا تھا، اس کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ تمام انسانوں کو سچا اور بے لاگ انصاف مل سکے۔ اس کے لیے ہمیں کسی بحث اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ بھول جانے والوں کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اسلام نے دنیا کے سامنے سب سے پہلے دو باتیں پیش کیں، توحید اور انسانی مساوات۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ۔	ہم نے تم کو نر اور مادہ سے پیدا کیا۔ اور تمھیں پہچاننے کے لیے قبائل اور شعوب میں تقسیم کر دیا، تم میں سب سے زیادہ برگزیدہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔

قریش کو سب سے زیادہ غصہ آپ کی اسی دعوت پر تھا کہ آپ لوگوں کو اس عدل اور مساوات کی طرف بلاتے تھے، آپ کی نگاہ میں حاکم اور محکوم کا، آزاد اور غلام کا، قوی اور کمزور کا، امیر اور غریب کا کوئی فرق نہ تھا اور سبھی کنگھی کے دانتوں کی طرح ایک سے تھے۔ آپ لوگوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ آپس میں نیچ اونچ کا برتاؤ نہ کرو، شاید کسی کے دل میں خیال پیدا ہو کہ آپ نے غلامی کا تو خاتمہ نہیں کیا اور نہ اس کی ممانعت کی کہ کوئی کسی کا مالک نہ رہے، لیکن جو اسلام کو جانتے ہیں اور اس کی حقیقت کے آشنا ہیں، ان کے نزدیک خدا کے دربار میں آقا اور غلام کا درجہ ایک کر دینا ہی اسلام کا وہ اقدام ہے جو انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر پیش آنے والے واقعات فتنہ و فساد بن کر مسلمانوں کی راہ میں حائل نہ ہو گئے ہوتے تو یہ واقعہ اپنی عظمت بعد میں بھی باقی رکھتا۔ اس لیے کہ خدا نے آقا و غلام دونوں پر نماز فرض کی، دونوں کو روزے کا حکم دیا اور دونوں کو تاکید کی کہ دلوں کو پاک اور نیتوں کو خالص کریں، اس نے دونوں کے لیے ایک ہی دین کا اعلان کیا۔ دونوں کا خون حرام کیا، ایسا نہیں کیا کہ غلاموں کا دین الگ ہے اور مالکوں کا الگ۔ اگر مسلمانوں کے معاملات اپنے رُخ پر چلتے تو یہ باتیں غلامی کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیتیں مزید برآں خدا نے غلاموں کے آزاد کر دینے کو ان نیکیوں میں شمار کیا ہے جن کے لیے مسلمان پیش قدمی کر کے اجر عظیم کے مستحق بنیں۔ اس نے دین میں بہت سے ایسے مواقع پیش کیے جہاں تک پہنچنے کے بعد غلام آزاد بن جاتا ہے۔ چنانچہ غلاموں کی آزادی، عمل صالح بتائی گئی، بعض گناہوں کا کفارہ قرار دی گئی۔ اس طرح ہر وہ دروازہ کھولا گیا جس میں داخل ہو کر مسلمان ذوق اور شوق کے ساتھ اس فرض کو پورا کریں۔

یہی وہ باتیں ہیں جن کو سنکر قریش آگ بگولا ہو جاتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غصے میں دانت پیستے تھے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ قریش کو صرف توحید کی دعوت دیتے اور ان کے سماجی اور اقتصادی نظام کو نہ چھیڑتے، قوی، کمزور، امیر، غریب، آقا اور غلام کا فرق بدستور باقی رہنے دیتے، سود خواری کو حرام قرار نہ دیتے۔ دولت مندوں سے مال لینے اور فقیروں پر تقسیم کر دینے کا کام نہ کرتے تو قریش کی اکثریت بڑی آسانی کے ساتھ آپ پر ایمان لے آتی۔ اس لیے کہ قریش کے لوگ اخلاص کے ساتھ بتوں سے نہ عقیدت رکھتے تھے اور نہ سچا جذبہ، ان کی کیفیت تو تذبذب کی سی تھی اور وہ بھی خوش خوشی اور تمسخر کے انداز میں۔ یہ سارے بُت ان کی نگاہ میں اصل مقصود نہ تھے، بلکہ عام عربوں کو قابو میں رکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک ذریعہ تھے۔ پھر اگر قریش کی بڑی اکثریت ایمان نہ لاتی تو جو بھی ایمان لاتے لاتے، جو نہ لاتے وہ رُکے رہتے۔ لیکن آپ کے لیے کسی آویزش یا عناد کا باعث نہ بنتے۔ الغرض قریش کا غیظ و غضب جس قدر بتوں کی مذمت سے تھا اس سے کہیں زیادہ اس بات پر تھا کہ آپ ان کے سماجی نظام پر

تنقید فرماتے تھے۔ اور آپ ایک ایسے انصاف کی دعوت دیتے تھے جو ان کی سیادت اور قیادت کے مفاد کے خلاف تھا۔

سب جانتے ہیں کہ آپ نے محض اسلام کی طرف رغبت دلانے کی خاطر بعض سردارانِ قریش کی طرف توجہ کی۔ جس میں غریبوں سے کچھ بے التفاتی کا رنگ پیدا ہو گیا تو اللہ نے شدید لہجے میں عتاب نازل کیا۔ آج تک لوگ وہ آیتیں تلاوت کرتے ہیں جو ام مکتوم کے واقعے سے متعلق وارد ہیں:۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی	تیوری چڑھائی اور روگردانی کی اس بات
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۔ اَوْ	پر کہ آگیا ان کے پاس نابینا اور آپ کو کیا خبر کہ
يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۔ اَمَّا	شاید سنور جائے یا نصیحت حاصل کرے۔ پس
مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى	فائدہ پہنچائے اس کو نصیحت، وہ جو پروا نہیں
وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۔ وَاَمَّا	کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور تجھ پر کچھ
مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۔ وَهُوَ	الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا اور وہ جو آیا
يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى	تیرے پاس دوڑتا اور وہ ڈرتا ہے سو تو اس سے
كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۔ فَمَنْ	تغافل کرتا ہے۔ یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے پھر جو
شَآءَ ذَكَرَهٗ ۔ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ	کوئی چاہے اس کو پڑھے، لکھا ہے عزت کے
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۔	ورقوں میں، اونچے رکھے ہوئے نہایت ستھرے۔

پس انسانوں کی مساوات کی دعوت، توحید و عدل کی ان دو بنیادوں میں سے ایک کا مظہر تھی جس پر اسلامی عمارت کا قیام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے صحابہؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اور پھر مدینہ طیبہ میں جو زندگی رہی خود اس کا قوام اور مزاج تمام اہم معاملات میں عدل کا تقاضا پورا کرنا تھا۔ اور وہ اس اہتمام اور توجہ کے ساتھ کہ عام مسلمان اس بات کا یقین کرنے لگیں کہ اسلام کے بنیادی ارکان میں عدل بھی ایک رکن ہے۔ جس سے سرتابی اسلام سے سرتابی اور جس میں کوتاہی دین میں کوتاہی ہوگی۔ یہی جذبہ تھا جس نے اس وقت جب کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے اور دل جوئی کی خاطر بعض عربوں کو ان کے حق سے زیادہ کچھ دے دیا تو ایک حقیقت سے بے خبر مسلمان اس پر معترض ہوا اور بول اٹھا:۔

اعدل یا محمد فانك لم تعدل ۔	یعنی انصاف فرمائیے انصاف، یہ انصاف نہیں ہے۔

پہلے تو آپ نے توجہ نہیں کی لیکن جب اس نے دوبارہ کہا تو آپ کے چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمایاں ہو گئے، اور آپ نے فرمایا افسوس تجھ پر اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا۔؟
یہ دیکھ کر بعض مسلمانوں نے چاہا کہ معترض کی خبر لیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس سے باز رکھا اس لیے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے لیے مشورے کی آزادی اور تنقید و اعتراض کا حق تسلیم فرماتے تھے۔ اور پھر آپ نے یہ دل جوئی کا عمل بھی اللہ کی وحی اور قرآن کی اجازت سے کیا تھا۔ سورۂ برأت میں صدقات سے بعض لوگوں کی دل جوئی کی اجازت ہے اور مصارفِ صدقات میں تالیفِ قلوب بھی ایک مصرف بتایا گیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اگر مالِ غنیمت میں سے بعض عربوں کو کچھ زیادہ دے دیا تو یہ انصاف کے خلاف کوئی بات نہ تھی، آپ نے تو عدل کا تقاضا پورا کرنے میں انتہائی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ حد یہ ہے کہ خود اپنی ذات تک بدلے میں پیش کر دی ہے۔

آپ کے خلفاء نے بھی چاہا تھا کہ ایسا ہی کریں لیکن وہ نہ کر سکے۔ حضرت عمر رضہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جس افسر سے بھی کسی کو بلاوجہ تکلیف پہنچے گی وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے تیار رہے کہا جاتا ہے کہ حج کے موقع پر حضرت عمر رضہ سے ایک شخص نے شکایت کی کہ ان کے گورنر نے بلاوجہ اس کو مارا پیٹا ہے۔ تحقیق کے بعد آپ نے فیصلہ کر دیا کہ فریادی اپنا بدلہ لے لے۔ اب افسروں میں اس فیصلے سے بڑی بے چینی پھیلی اور انھوں نے حضرت عمر رضہ سے درخواست کی کہ وہ گورنر کو معاف کر دیں اس لیے کہ بدلہ چکانے کا فیصلہ حکومت کا وقار کم کر دے گا اور پھر عوام کا حوصلہ افسروں کے خلاف بڑھ جائے گا۔ حضرت عمر رضہ نے باوجود انتہائی اصرار کے اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا، لیکن آخر کار اس بات پر راضی ہو گئے کہ اگر فریادی رضامند ہو گیا تو میں معاف کر دوں گا۔ چنانچہ گورنر نے فریادی کو رضامند کر لیا اور قصاص سے بچ گیا۔ حضرت عمر رضہ کا کہنا یہ تھا کہ امت میں سب سے زیادہ برگزیدہ ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلہ دیا ہے پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کے خلفاء اور حکمران بدلہ چکانے کی جگہ شاکی کو رضامند کر لیا کریں۔ یا بدلہ پیش کرنے میں جبر و اکراہ کا اظہار کریں۔ حضرت عثمان رضہ سے جھگڑا کرنے والے اپنی دلیل میں پیش کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے بدلہ چکایا ہے اور حضرت عمر رضہ نے افسروں کی طرف سے رعایا کو بدلہ دلانے کی کوشش کی ہے، لیکن حضرت عثمان رضہ نے ان کی بات نہیں مانی جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر نظر رکھتے ہیں اور جو آپ کے سنن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ آپ کسی بات میں بھی اپنے ساتھیوں پر اپنی برتری تصور نہیں فرماتے تھے، بجز ایک بات کے اور وہ وحی الٰہی کا

آپ پر نازل ہونا۔ چنانچہ آپ اپنے صحابہؓ سے مشورہ کرتے تھے، ان کا مشورہ قبول فرماتے تھے۔ وہ اگر جنگ کرتے تو آپؐ بھی لڑتے، وہ صلح کرتے تو آپ بھی صلح کی باتیں کرتے، ان ہی کے ساتھ مل کر مسجد کی تعمیر کرتے، خندق کھودتے، زمین کھودنے اور عمارت بنانے کی مشقت میں تخفیف کے خیال میں صحابہؓ کے ساتھ آپ بھی نغمات گنگناتے، انھیں کے ساتھ پتھر اٹھاتے، مٹی ڈھوتے، غرض اپنے آپ کو انھیں میں سے ایک تصور فرماتے، ہاں امتیاز تھا تو صرف یہ کہ اللہ نے آپ کو نبوت عطا کی تھی، چنانچہ آپ اس سے زیادہ کسی امتیاز کے روادار نہ تھے۔ سنن اور سیرت کی روایات بتاتی ہیں کہ مرض الموت میں آپ نے سونے کی وہ تھوڑی مقدار جو مسلمانوں کے مال میں سے آپ کے پاس بچ رہی تھی منگوائی اور لوگوں کے حوالے کر دی اور دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے کہ نہ سونے کے مالک تھے، نہ چاندی کے، اس معاملے میں آپ نے اپنے نفس پر انتہائی سختی کی۔ خدا نے بھی یہ شدت روا رکھی اور چونکہ آپ کے ارشادات ذاتی خواہشوں کی بنا پر نہیں بلکہ وحی الٰہی کے تقاضے سے ہیں اس لیے نہ صرف یہ کہ صحابہؓ میں آپ نے اپنے لیے کوئی امتیاز گوارا نہیں کیا بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی اپنی طرح پابند رکھا اور فرمایا:۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث	ہم انبیاء لوگ کسی کو وارث نہیں بناتے۔ ہم نے
ما ترکناہ صدقۃ۔	جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔

آپؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس باغِ فدک باپ کی وراثت میں مانگنے آئیں تو آپ نے دینے سے انکار کر دیا اور مذکورہ بالا حدیث ان کو پڑھ کر سنائی۔

پس سیرت نبویؐ نے لوگوں کے باہمی تعلقات میں، اپنے اور لوگوں کے تعلقات میں، نیز اپنے اہلِ بیت اور عام مسلمانوں کے تعلقات میں انصاف کو بنیاد قرار دیا تھا۔ آپ کے خلفاء نے پوری کوشش کی کہ اپنے بس بھر آپ ہی کا راستہ چلیں، بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنی طاقت سے باہر کام کرنے کا ارادہ فرما لیا اور چاہا کہ بیک وقت مسلمانوں کے امام بھی رہیں اور اپنے گھر کے کاروباری بھی، خلافت کے کاموں کے لیے بھی اپنا وقت اور قوت رکھیں اور اپنے اہل وعیال کے لیے روزی کمانے کی مشقت بھی اٹھائیں۔ مسلمانوں نے ایک دن دیکھا کہ آپ معمول کے مطابق کچھ سامان اٹھائے بازار کی طرف لپکے جا رہے ہیں تاکہ اسے فروخت کر کے کچھ چیزیں خریدیں، تب مسلمانوں نے توجہ کی یا باختلاف روایت خود حضرت ابوبکرؓ نے محسوس فرمایا کہ وہ بیک وقت خلافت اور فکر معاش دونوں ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتے، اس لیے مسلمانوں نے ان کے لیے بیت المال سے کچھ مقرر کر دیا۔ اور اس میں بھی فراخی یا فیاضی کی شان نہ تھی، اتنی ہی مقدار مقرر کی جس سے گذر بسر ہو سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اتباع میں حضرت ابوبکر رضؓ نے حرج تصور فرمایا کہ دنیا سے ایسی حالت میں جائیں کہ ان کے پاس مسلمانوں کا کچھ مال رہ جائے۔ چنانچہ آپ نے گھر والوں کو حکم دیا کہ ان کے پاس جو ہناتؒ رکھے ہیں وہ عمر رضؓ کو دے دیئے جائیں۔ حضرت عمر رضؓ انھیں دیکھ کر رونے لگے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے مناسب نہ سمجھا کہ حضرت عمر رضؓ انھیں لے لیں لیکن حضرت عمر رضؓ نے جس بات کو اپنے لیے حرج تصور فرمایا اسے اپنے ساتھی کے لیے بھی منظور نہیں کیا۔ اور یہ نہ ہونے دیا کہ ابوبکر رضؓ اپنے رب سے ایسی حالت میں ملیں کہ وہ ان سے سوال کرے کہ کیا تم نے ہنات عمر رضؓ کو واپس کر دیئے تھے، پھر ابوبکر رضؓ جواب دیں کہ میرے گھر والوں نے تو پیش کر دیا تھا لیکن عمر رضؓ نے لینے سے انکار کر دیا۔

انصاف قائم کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضؓ کی آرزو اور حرص میں شدت کا یہ عالم تھا کہ پاکبازی اور نیک نیتی کی نگاہ میں جو بات حرج کی نہ تھی اس سے بھی احتیاط فرماتے تھے۔ بلاشبہ اگر حضرت ابوبکر رضؓ کی خلافت کا زمانہ کچھ طویل ہوتا تو ہم حیرت انگیز واقعات پڑھتے۔ جبکہ دس ہی سال کے فرق نے حضرت عمر رضؓ کے دور میں وہ کچھ کر دکھایا جس کی تصدیق لوگوں کے لیے مشکل ہے۔ چنانچہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضؓ سے متعلق راویوں نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے اور ان کی شدت، اور احتیاط کے بیان میں مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن جو لوگ سنن اور طبقات میں نیز تاریخ کی کتابوں میں حضرت عمر رضؓ کی سیرت پڑھتے ہیں وہ نہایت آسانی سے واقعات و حوادث میں یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضؓ کا مزاج اور ان کی افتادِ طبع کیا ہے اور راویوں کا اضافہ کتنا۔؟

واقعہ یہ ہے کہ خدا کی ذات سے متعلق معاملات میں حضرت عمر رضؓ لوگوں کے لیے بڑے سخت گیر تھے لیکن اپنی ذات کے لیے ان کی شدت لوگوں سے کہیں زیادہ تھی، انسانیت کی پوری تاریخ میں میں نے بجز اولوالعزم کے کوئی فرد زندہ دل، حساس اور محتاط نہیں پایا۔ جو نہ ڈرنے والی باتوں سے اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہو جو اپنی ذات میں ان باتوں کو عیب اور قصور تصور کرتا ہو جو نہ عیب ہیں نہ قصور۔ جو اپنے اوپر ایسی سختی اور پابندی عائد کرتا ہے جیسی کوئی نہیں کرتا، لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام الرماد میں جب حضرت عمر رضؓ نے عوام کی تنگ دستی اور فقر کو دیکھا تو خود انتہائی تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کر لی۔

جب آپ کو پتہ چلا کہ لوگوں کو گھی نہیں مل رہا ہے تو آپ نے اس کا استعمال چھوڑ دیا، سوکھی روٹی اور تیل پر صبر کرتے رہے پھر یہ تیل بھی آپ پر گراں گذرنے لگا، آپ کو خیال آیا کہ شاید پکنے کے بعد تیل

؎ معمولی سامان۔

اپنی تیزی کھودے اور ہاضم اور لذیذ ہو جائے۔ چنانچہ اپنے غلام کو تیل پکانے کا حکم دیا لیکن جب آپ نے کھایا تو سخت تکلیف ہوئی، اس کی وجہ سے آپ کی صحت پر بھی برا اثر پڑا، حتیٰ کہ آپ کا رنگ تک خراب ہو گیا۔ لیکن مسلمان آپ کو اس سے نہ روک سکے اس لیے کہ آپ نے اپنی خوش خوراکی سے اس وقت تک کے لیے انکار کر دیا جب تک کہ عام مسلمان خوشحال نہ ہو جائیں۔

حضرت عمر رض کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ وہ اتنی بڑی عظیم الشان طویل اور عریض سلطنت چلا رہے ہیں جو اپنے اندر غیر معمولی وسعت اور فتوحات رکھتی ہے، وہ تو اس کو ایک حیرت کی بات خیال کرتے تھے اور تنہائی میں اپنے نفس کو یاد دلاتے تھے کہ اے خطاب کے لڑکے! آج تو امیر المومنین بن گیا ہے، کل تک اسلام سے قبل تو ایک چرواہا تھا اور اپنے باپ خطاب کی بکریاں چراتا تھا، لوگ ابھی یہ بھولے نہیں، ان کو تو وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں تو جانور چراتا تھا اور یہ بھی یاد ہے کہ خطاب تجھ سے کتنی سخت محنت اور کڑی خدمت لیا کرتا تھا۔ حضرت عمر رض مسلمانوں کے کسی کام میں خواہ وہ کتنا ہی سخت اور شاق ہو پہلو تہی نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ صدقات کے اونٹوں کے باڑے میں چلے گئے اور ان کی کیفیت اور گنتی کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کر کے حضرت علی رض کو بتاتے اور حضرت علی رض حضرت عثمان رض سے رجسٹر میں درج کرواتے۔ حضرت علی رض فاروق اعظم رض کی اس کارروائی سے بہت محظوظ ہوئے اور قرآن مجید کی وہ آیت تلاوت کی جو حضرت شعیبؑ کی لڑکی کی زبانی ہے۔ "یا ابت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین"

اس کے بعد فرمایا یہ ہیں "قوی امین" لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رض چرواہوں اور معمولی آدمیوں کی طرح اونٹ کے پھٹن کے مقام پر قطران[1] لگا رہے ہیں اور ایسا کرنے میں کوئی تکلف اور حرج تصور نہیں فرماتے، اپنی ذات پر اتنی سختی برداشت کرنے کے بعد گھر والوں کو بھی مجبور کرتے تھے۔ جب کبھی عوام میں کسی بات کی ممانعت کا اعلان فرماتے اور متنبہ کرتے کہ خلاف ورزی پر سزا دی جائے گی تو گھر والوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے فرماتے کہ میں نے مسلمانوں کو فلاں کام سے منع کیا ہے اور خلاف ورزی پر سزا دینے کا اعلان کیا ہے لوگ میرے تعلق کی وجہ سے تم پر نظر رکھیں گے، اگر مجھے پتہ چلا کہ تم میں سے کسی نے خلاف ورزی کی ہے تو اسے دوہری سزا دوں گا۔

عام الرمادہ کے زمانۂ قحط میں حضرت عمر رض اپنے گھر کے کھانے پر بڑی کڑی نگرانی رکھتے تھے، اگر کوئی

---

[1] بعض درختوں سے نکلنے والے روغنی مادے۔

اچھا کھاتا یا زیادہ کھاتا تو بڑی سختی کے ساتھ اس کو روکتے، پھر جب خود سختی اٹھاتے، گھر والوں کو برداشت پر مجبور کرتے تو اس میں کچھ مضائقہ نہ دیکھتے کہ لوگوں کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے جس میں سختی ہو لیکن جبر نہ ہو، نرمی ہو لیکن کمزوری کا پہلو نہ رکھتی ہو۔

روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ لوگوں میں کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے، آپ کے گرد و پیش لوگوں کا غیر معمولی ہجوم ہو گیا، اتنے میں سعد بن ابی وقاص رضؓ بھی آگئے اور ہجوم کو چیرتے پھاڑتے حضرت عمرؓ تک پہنچ گئے۔ سعد بن ابی وقاص رضؓ کا دربارِ نبویؐ میں جو درجہ ہے وہ سب جانتے ہیں۔ پھر فارس کی فتح کے سلسلے میں ان کی قربانیاں مسلّم ہیں، لیکن حضرت عمرؓ نے دُرّے سے ان کی خبر لی اور فرمایا:۔

ان لم تھب سلطان اللہ فی	زمین پر اللہ کی قوت سے تجھے خوف نہیں تو
الارض فاردت ان اعلمک ان	میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ کی قوت بھی
سلطان اللہ لا یھابک ۔	تجھ سے نہیں ڈرتی۔

اس طرح حضرت عمرؓ انتہائی آرزو رکھتے تھے کہ لوگ آپس میں برابری کا سلوک کریں اور وہ خود اور ان کے گھر کے لوگ بھی عام مسلمانوں کے بالکل برابر رہیں۔

یہ تمام باتیں حضرت عمرؓ کی خاص زندگی کے روزانہ معمولات سے متعلق ہیں اور ان میں خواہ کتنی ہی شدت اور مشقت کا پہلو ہو لیکن پھر بھی وہ آسان ہیں، البتہ آپ کا وہ طرزِ عمل جسے آپ نے اپنے اور خلافت کے لیے ایک دستور العمل کی حیثیت دیدی تھی ایک مشکل مہم تھی، جس کا ایک گوشہ آپ کا وہ طریقۂ کار جو جلیل القدر صحابہؓ اور اکابر انصار و مہاجرین سے تعلقات میں آپ نے برتا۔ یہ لوگ دربارِ نبوتؐ کے مقربانِ خاص اور اسلام کے سابقین اولین میں تھے، مسلمانوں کے تمام معاملات کی گتھی یہی سلجھاتے تھے، حضرت عمرؓ عوامی معاملات میں اپنے تمام اقدامات کی منظوری ان ہی حضرات سے لے لیتے تھے اور تمام اہم امور میں مشورہ فرماتے تھے، آپ خیال کرتے تھے کہ گو میں ان کا والی ہو گیا ہوں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ صحابہؓ مجھ سے زیادہ بہتر ہیں۔ تو اب مجھے کیا روش اختیار کرنی چاہیئے، اور ان کے لیے میرے طرزِ عمل کی نوعیت کیا ہو؟ آپ نے سبھوں کے ساتھ نرمی اور دور اندیشی کا معاملہ کیا اور سب کو اپنا ساتھی، مخلص، یارِ غار اور مشیر بنا لیا، پھر بھی آپ ہر وقت چوکنا تھے کہ کہیں ان حضرات پر کوئی مصیبت نہ آپڑے یا یہ خود کسی مصیبت کا سبب نہ بن جائیں۔ چنانچہ آپ نے ان سبھوں کو مدینہ منورہ ہی میں روک رکھا اور بغیر اجازت کہیں باہر جانے نہیں دیا۔ مفتوحہ ممالک میں بھی اجازت کے بغیر انھیں

جانے کا حکم نہیں تھا۔ حضرت عمر رض کو اول تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ان کے گرویدہ نہ ہو جائیں، پھر یہ کہ کہیں یہ لوگ عام مسلمانوں کی عقیدت کے فریب میں نہ آجائیں اور یہ کہ کہیں ان تمام چیزوں کا خمیازہ حکومت کو نہ بھگتنا پڑے، اور یہ واقعہ ہے کہ بہت سے صحابہ رض اور خصوصاً مہاجرین پر یہ قید و بند بڑی شاق تھی۔ اور اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ حضرت عثمان رض نے خلیفہ ہوتے ہی یہ بندش اٹھا دی اور ان کو باہر جانے کی اجازت دے دی اور وہ مختلف مقامات پر جا بسے اور حضرت عثمان رض کی اس پالیسی سے بہت خوش ہوئے لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ان ہی لوگوں نے حضرت عثمان رض کی جان ضیق میں ڈال دی اور وہی مصیبت پیش آئی جس سے حضرت عمر رض ڈرتے تھے۔

حضرت عمر رض نے ہر صحابی رض کا، اس کے مرتبے، اسلام سے اس کی اسبقیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی قربت کے اعتبار سے روزینہ مقرر کر دیا تھا اور ان کی رائے یہ تھی کہ یہ روزینہ مزید کاروبار سے ان کی بے نیازی کا باعث ہونا چاہیئے لیکن انھوں نے اس وظیفے کے باوجود تجارت کی اور دولت کمائی۔ اور تجارت سے تموّل میں غیر معمولی اضافہ کر لیا ادھر وظیفہ کی مقدار بھی ترقی پذیر رہی۔ حضرت عمر رض دیکھتے تھے لیکن وہ ان کو روک نہیں سکتے تھے اس لیے کہ وہ لوگ عہدِ نبوی میں بھی کاروبار اور تجارت کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہ کسی کاروبار سے روکا اور نہ تجارت سے۔ حضرت عمر رض صحابہ رض اور غیر صحابہ کی اس قسم کی دولت و ثروت کو اس فضلِ خداوندی کا ثمرہ تصور فرماتے تھے۔ جو مالِ غنیمت اور سالانہ عطیات کی شکل میں ان پر تقسیم ہو رہا تھا، پس جو کچھ ہو رہا تھا اس سے وہ خوش نہ تھے۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے:۔

لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت من الاغنیاء فضول اموالہم فرددتہا علی الفقراء۔	جو کام میں نے بعد میں کیا اگر پہلے کرتا تو دولت مندوں سے ان کی بڑھی ہوئی دولت لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔

اور اگر حضرت عمر رض کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو تاریخ اسلامی ہمیں حیرت انگیز واقعات سناتی۔

فتوحات کی بدولت عہدِ فاروقی میں مسلمانوں میں مال و دولت کی ایسی بہتات ہوئی کہ حضرت عمر رض دنگ رہ گئے اور صحابہ رض سے مشورہ کیا۔ حضرت علی رض کی رائے گذشتہ روایت کی حمایت میں تھی، جس میں زندگی اور اس کے تغیر اور ترقی کی رعایت نہ تھی، فرمایا کہ آیا ہوا سب مال تقسیم کر دیا جائے اور سال کے آخر میں ایک درہم و دینار بھی بیت المال میں ایسا نہ رہ جائے، جو اس کے مستحق کے پاس نہ پہنچ گیا ہو۔ حضرت عثمان رض کی رائے تھی کہ دولت کی موجودہ کثرت سے خدشہ ہے کہ اس کا نظم قائم نہیں کیا گیا تو معاملات کا

شیرازہ بکھر جائے گا۔ پھر حضرت عمر رض نے رجسٹر تیار کرلئے، لوگوں کے لیے روزینے مقرر کیے اور جو کچھ بچ رہا اسے مسلمانوں کے عام مصالح اور مفاد کے لیے بیت المال میں محفوظ رکھا۔

ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ واقعات نے حضرت عثمان رض کی رائے کو صحیح ثابت کر دیا۔ جو ایک متمدن یا متمدن بننے والی حکومت کو پیش آنے والے معاملات کے موافق تھی۔ جب عام الرمادہ میں قحط کے دن آئے تو حضرت عمر رض بیت المال کے اندوختہ سے عوام کو اس وقت تک مدد پہنچاتے رہے جب تک کہ دوسرے صوبوں سے امداد نہیں پہنچ گئی۔ فاروق اعظم رض فرمایا کرتے تھے، ہم بیت المال سے مسلمانوں کو کھلاتے رہیں گے اور جب دیکھیں گے کہ بیت المال خالی ہو چکا ہے تو محتاجوں کو حسب حیثیت دولتمندوں کے گھروں میں داخل کر دیں گے۔ اس طرح کسی مسلمان کو ہم بھوکا نہیں رہنے دیں گے۔

ہر چند کہ حضرت عمر رض کی مالی سیاست کا یہ ایک مختصر گوشہ تھا اور اس میں بھی آپ کو عوام سے ہمدردی اور ان میں بے لاگ انصاف کی روح پھونکنے کا موقع ملا، لیکن مالیات میں آپ کی نگاہیں ایک اور راستہ بھی دیکھ رہی تھیں جس پر بہت دور تک آپ چل چکے تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ متمدن قومیں آج اس راستے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن شاید وہ بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچ سکیں۔

حضرت عمر رض اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو خراج، جزیہ اور محاصل سے رقمیں آتی ہیں یہ سب کی سب مسلمانوں کی ملکیت ہیں۔ یہ کسی ایک فرد یا ایک جماعت کو نہیں دی جاسکتیں، آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ اس مال کی حفاظت اور مستحق تک اس کو پہنچا دینے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ اگر صدقات کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ زمین کے دور دراز حصہ میں کہیں بھاگ جائے یا اسے کہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ قیامت کے دن خدا مجھ سے اس کے متعلق بازپرس کرے گا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں زندہ رہا تو وہ دن آئے گا جب جبل صنعا کے ایک چرواہے تک اس مال سے اس کا حصہ پہنچے گا۔

آپ نے بیت المال سے ہر ایک کا روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ مردوں کے لیے، عورتوں کے لیے، بچوں کے لیے، خستہ حال بوڑھوں کے لیے۔ معذوروں کے لیے، سب کے لیے الگ الگ اور مطمئن تھے، گویا جس انصاف کی آرزو رکھتے تھے وہ پورا ہو گیا۔ لیکن ایک رات جب کہ آپ راستے سے گذر رہے تھے ایک بچے کو روتے ہوئے سنا اور چلے گئے۔ جب دوسری بار گذرے تو پھر رونے کی آواز سنی، آپ نے اس کی ماں سے رونے کا سبب پوچھا، اس نے یونہی کچھ کہہ کر ٹال دیا، لیکن جب آپ تیسری بار ادھر سے گذرے اور پھر بچے کو روتا پایا تو اصرار کے ساتھ وجہ دریافت کی۔ ماں نے کہا آج میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں،

اس لیے کہ عمر رض بچوں کا روزینہ اسی وقت مقرر کرتے ہیں جب وہ دودھ چھوڑ چکا ہو۔ یہ جواب سن کر بیتاب ہو گئے اور صبح ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کی جائے۔ ہم بچوں کے لیے پیدائش کے بعد ہی سے روزینہ مقرر کرتے ہیں۔

حضرت عمر رض صدقات کی وصولی میں احکام خداوندی نافذ فرماتے تھے لیکن وصولی اور تقسیم میں حد درجہ احتیاط ملحوظ تھی، لوگ جانتے ہیں کہ ایک اعرابی نے کسی دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا، کہ کیا خدا نے آپ کو حکم دیا ہے کہ یہ مال آپ ہمارے دولت مندوں سے وصول کریں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، ہاں۔

اس کے پیش نظر حضرت عمر رض وصول کرنے والوں کو سخت تاکید فرماتے تھے کہ وہ جس قبیلے سے بھی صدقات اکٹھا کریں وصولی میں عدل و انصاف کی پوری شدت کے ساتھ پابندی کریں اور ہر قبیلے کے فقراء کو اس کے صدقات واپس کیے جائیں تاکہ وہ سوال کرنے کی ذلت سے بچ سکیں، پھر جو رقم بچ جائے اسے واپس کر دیں، اس قسم کی بچی ہوئی رقم جب واپس آتی تو آپ اس کو ان مصارف کے لیے محفوظ کرا لیتے جن کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا۔ چنانچہ اس سے فقیر، مسکین، مسافر اور مقروضوں کی امداد فرماتے۔

مجھے نہ تو اشتراکیت سے بحث ہے اور نہ شیوعیت سے، اس لیے کہ حضرت عمر رض نہ سوشلسٹ تحریک کے علمبردار تھے نہ کمیونسٹ تحریک کے لیڈر، انھوں نے تو ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ جس طرح نبیؐ اور قرآن نے اس کو تسلیم کیا ہے انھوں نے سرمایہ داری اور دولت مندی کی اجازت دی جس طرح قرآن اور نبیؐ نے اجازت دی ہے۔ مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ سماجی انصاف، ملکیت کو باطل اور سرمایہ داری کو حرام کیے بغیر بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ جس کے لیے آج بعض جمہوریتیں کوشاں ہیں اور چاہتی ہیں کہ مالکوں کی ملکیت اور دولت مندوں کی سرمایہ داری کے باوجود سماجی انصاف عملی طور پر پیش کر دیں۔

میرے سامنے بیوریج کا نظریہ ہے۔ جس نے کوشش کی کہ حکومت عوام کو بلا آلۂ کار بنائے ان کی معاش اور ضروریاتِ زندگی کی ضامن ہو، وہ بے کاری اور ذلت سے دور رکھ کر ان کے لیے باعزت زندگی کا سامان کر دے۔

میرے سامنے موجودہ جمہوریت کے دعوے اور حوصلے ہیں اور ان کی درماندگی اور ناکامی۔ پھر میری نگاہ حضرت عمر رض کے ارادوں اور ان کی تکمیل کی طرف جاتی ہے تو بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے کہ شاعر نے آپ کے لیے بالکل سچ کہا:-

جزی اللہ خیرا من امام و بارکت　　حضرت عمر رض کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر اور برکت

یدا الله فی ذلك الادیم الممزق	عطا فرمائے، نعامہ پر سوار ہو کر بھی اگر کوئی
فمن یجر او یرکب جناحی نعامة	چاہتا کہ جو کچھ آپ نے حاصل کیا ہے وہ پالے
لیدرك ما ادركت بالامس یسبق	تو وہ پیچھے ہی رہ جاتا، آپ نے بہت سے کام
قضیت امورا ثم غادرت بعدها	انجام تک پہنچائے لیکن بعض باتیں کھُل کر
بوائق فی اکمامها لم تفتق	سامنے نہ آسکیں۔

اور پھر حضرت عمرؓ اپنے عاملوں اور والیوں کے ساتھ نرمی اور چشم پوشی کا برتاؤ روا نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے۔ عامل بناتے وقت اس کے تمام مال وجائداد کی ایک فہرست تیار کرواتے اور سبک دوشی کے موقع پر سخت جانچ فرماتے، اگر فرق پاتے تو اس کے دو حصے کرکے ایک حصہ بیت المال میں داخل کر دیتے۔ علاوہ ازیں بڑی باریک بینی سے دیکھتے کہ ان عاملوں کا رعایا کے ساتھ کیا سلوک ہے اور ان کو خفیہ اور کھلم کھلا سخت تاکید فرماتے کہ مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں نہ جسمانی اور نہ مالی۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنے بعض عاملوں کی سرزنش کی اور فرمایا:۔

منذ کم تعبدتم الناس وقد	تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے،
ولدتهم امهاتهم احرارا۔	ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا ہے۔

روزانہ جب کوئی اہم اور مشکل امر پیش آجاتا تو آپ مدینہ میں رہنے والے صحابہؓ کو مشورہ کے لیے طلب فرمالیتے۔ حج کے موقع پر اپنے عاملوں سے ملاقات اور بات کے لیے جگہ اور وقت مقرر فرما دیتے پھر رعایا کی باتیں عاملوں سے کرتے اور عاملوں کے بارے میں رعایا سے حالات سنتے اور تمام معاملات کا ٹھیک انتظام فرماتے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکوں گا کہ اگر حضرت عمرؓ کی زندگی کچھ اور وفا کرتی تو بلاشبہ آپ مسلمانوں کے شوریٰ کا ایک ایسا نظم تیار کر جاتے جو باقی رہتا اور مسلمانوں کو فساد واختلاف سے اور حاکموں کو ظلم وتکبر سے بچاتا۔

میں نے ان مصائب اور مشکلات کا تذکرہ نہیں کیا جو حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کے معاملات کے ٹھیک کرنے میں پیش آئیں اور جس کے بعد انھوں نے ملک پر ملک فتح کیے اور بڑے بڑے شہر بسائے اور ایک عظیم الشان عربی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال دی، اس لیے کہ میرے پیش نظر حضرت عمرؓ کی تاریخ لکھنا نہیں ہے اور نہ ان کی سوانح کا تذکرہ میرا مقصود ہے، ان سطروں میں تو مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو زندگی پیش فرمائی اور جس کی اتباع میں آپ کے دونوں ساتھیوں نے کوشش کی اس زندگی کی جوہری شے وہ بے لاگ اور سچا انصاف تھا جو حق کے اظہار میں کسی ملامت کرنے والے کا اثر

قبول نہیں کرتا اور جس کی موجودگی میں دن ہو یا رات، ظاہر ہو یا پوشیدہ، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا دیکھ رہا ہے اور نگرانی کر رہا ہے اور وہ باز پرس کرے گا اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ لوگ بھی تاک میں لگے ہیں اور ان کو حکم ہے کہ ہر وقت جانچ کرتے رہیں اور خلیفہ کی اطاعت ان پر اسی وقت تک ہے جب تک وہ سیدھی راہ پر چلے اگر وہ غلطی کر رہا ہو تو اسے راہِ راست پر لائیں، اگر اس کے کردار کے بارے میں شکوک و شبہات ہوں تو اس سے سوالات کریں، اور یہ سب اس لیے کہ خلیفہ کی فرمانبرداری علم و آگہی کے ساتھ ہو، بصیرت کی روشنی میں اس کو مشورہ دیا جا سکے، پختہ ارادے اور معقول اسباب کی بنا پر اس کی مخالفت کی جا سکے۔

پس کیا یہ سیرت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی، اور جس کی روشنی میں چلنے کی آپ کے صاحبین نے اپنے بس بھر کوشش کی، فوری نفع کے حریص اور فطری طور پر خود غرضی اور طمع کے دلدادہ انسان کے مناسب حال تھی۔ اور کیا اس سیرت میں ایسی قدرت تھی کہ وہ برقرار رہے تا آنکہ انسانوں کی طبیعتیں بدل دے۔

اسلامی نظام حکومت الٰہی نہ تھا

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ بات صاف کر لینی چاہیئے کہ اس حاکمانہ نظام کی حقیقت کیا ہے جو ہجرت کے وقت سے لے کر حضرت عمر رض کی شہادت اور حضرت عثمان رض کی خلافت تک قائم ہو چکا تھا۔ بعض وہ لوگ جنھیں معاملات کی ظاہری سطح مبتلائے فریب بنا سکتی ہے، خیال کرتے ہیں کہ یہ حکومت یا زیادہ جامع تعبیر میں اس مختصر سے عہد کا نظام حکومت الٰہی تھا۔ جس کی بنیاد سر سے پاؤں تک دین تھی، اب دین کا مفہوم اس خاص ماحول میں چونکہ آسمان سے نازل شدہ ایک حقیقت ہے اس لیے اس خیال کے حامی اس کا یقین رکھتے ہیں کہ اس عہد میں جس حکومت نے مسلمانوں کا نظم سنبھالا، اس کی قوت اور سلطانی کا مدار خدا اور اس کی امداد غیبی تھی۔ لوگوں کا اس میں کچھ دخل نہ تھا، نہ وہ اس میں شرکت کر سکتے تھے۔ نہ اس پر معترض ہو سکتے تھے، اور نہ وہ اس سے انکار کے مجاز تھے۔ اس خیال کے لوگ محسوس کرتے ہوں گے کہ ان کے حق میں ایک صاف اور سچی دلیل یہ ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہٗ کے حکم سے اس حکومت کی بنیاد رکھی، اس نے آپ کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور مکہ کے مسلمانوں کو آپ کا ساتھ دینے کی ہدایت کی، پھر خدا ہی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حکومت کے مجمل اور

مفصل احکام وحی کیے، سورۂ نجم میں اسی کا ارشاد ہے کہ:۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى۔	تمھارا ساتھی راہ سے بھٹکا نہیں، وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وحی الٰہی ہے۔

اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کریں، اس نے کھلے طور پر اعلان کر دیا کہ مسلمان ایمان دار اسی وقت ہو سکتے ہیں جب وہ اپنے اختلافی معاملات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنائیں، ان کے لیے اس دلیل میں اس سے بھی قوت پہنچ سکتی ہے کہ حضرت ابوبکر رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے اور حضرت عمر رض حضرت ابوبکر رض کے، پس مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو حضرت نے حکم دیا اور خود حضرت نے اللہ سے حکم پایا، ان وجوہ کی بنا پر اس عہد کا نظامِ حکومت بالکل الٰہی نظام تھا۔ بلاشبہ اس خیال سے زیادہ کوئی خیال غلط نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اسلام کی حیثیت بہرحال ایک دین کی ہے جس نے اپنے ان احکام اور حدود میں جن کا تعلق سب سے پہلے خدا کی توحید اور پھر نبوت کی تصدیق اور اس کے بعد نیک اور صالح زندگی سے ہے۔ عام انسانوں کو ان کی دنیاوی اور اُخروی فلاح کی طرف متوجہ کیا لیکن اس نے ان کی آزادی نہیں چھینی، ان کا پورا پورا مالک و مختار نہیں بنا، اور نہ ان کے ارادوں کو معطل کیا اس نے تو مقررہ حد میں انھیں مختار بنایا۔ کل مستحبات اور تمام مکروہات گنائے البتہ عقل اور دل کی قوت ساتھ کر دی کہ غور و فکر کریں اور اس بات کی اجازت دی کہ بھلائی اور سچائی رفاہِ عام اور مصالح خاص میں اپنے بس بھر حصہ لیں۔

خدا نے اپنے نبی ؐ کو حکم دیا کہ وہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کریں، اگر حکم کا تعلق آسمان ہی سے ہوتا تو نبی ؐ خدا کے حکم کے مطابق ہر بات کی تکمیل بلا کسی مشورہ کے کر لیتا۔ حالانکہ ارشادِ خداوندی ہے

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ۔	اور اگر تو تند خو اور سخت دل ہوتا، تو منتشر ہو جاتے، تیرے پاس سے، سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں

اور پھر اُحد کے ابتلا کے بعد اس آیت کے نزول سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں اپنے صحابہ رض کا مشورہ قبول کیا تھا۔ جب آپ ان کو ایک مقام پر ٹھہرانا چاہتے تھے اور بعضوں نے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب تدبیر اور مصلحت کے ماتحت ہے یا اس کے لیے خدا کا حکم ہے تو آپ نے

جواب دیا کہ یہ خدا کا حکم نہیں تو پھر آپ کو مشورہ دیا گیا کہ یہ مقام جنگی مصالح کے مناسب نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں سے ہٹا کر پانی سے قریب کسی جگہ جمنے کا حکم دیا جائے۔ پھر واقعہ بدر کے بعد قیدیوں کے سلسلے میں آپ نے صحابہ رض کا مشورہ قبول کیا، جس کے متعلق عتاب آمیز آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ	نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو
حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ	رکھے۔ جب تک خوب خون ریزی نہ کرلے
عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ۔	تم چاہتے ہو، اسباب دنیا کا اور اللہ کے
	ہاں چاہیئے آخرت۔

اُحد کے موقع پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے خیال کیا کہ مدینے ہی میں قیام کریں اور باہر نکل کر ان سے مقابلہ نہ کریں، ہاں اگر وہ مدینہ پر حملہ آور ہوں تو پھر مدافعت کریں لیکن صحابہ رض اور خصوصاً انصار نے آپ پر زور ڈالا کہ دشمن سے مقابلہ کے لیے نکلنا ضروری ہے، چنانچہ آپ نے ان کی بات مان لی اور مقابلے کی تیاری فرمانے لگے۔ مسلمانوں نے اس عرصہ میں ندامت سی محسوس کی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کیا، چنانچہ انھوں نے آپ کو مسلح آتے دیکھ کر معذرت کی اور اس بات کی اجازت چاہی کہ حضرت ہی کی رائے پر عمل کیا جائے، لیکن آپ نے اس سے انکار کیا اور جو مشورہ منظور کر لیا تھا اسی پر اڑے رہے، اگر الٰہی نظام ہوتا اور ہر کام کے لیے آسمان سے حکم کا نزول ضروری ہوتا تو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور نہیں کر سکتے تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا مشورہ قبول نہیں فرماتے، خواہ حالات کی نزاکت کا تقاضا کچھ ہی ہوتا غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے صحابہ رض کے مشورے اور ان کی رائے پر اعتماد کر کے خندق کھودنے کا آغاز خود کیا۔

یہ اور اسی طرح بہت سے دوسرے مواقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رض سے مشورہ کیا۔ اور ان کی رائے پوری رضامندی کے ساتھ قبول فرمائی، حدیبیہ کا موقع تھا قریش چاہتے تھے کہ اس سال زیارت بیت الحرام کے بغیر آپ واپس ہو جائیں، قریش کی اس خواہش سے صحابہ رض کسی طرح متفق نہ تھے، آپ نے اس سلسلہ میں جب ان سے مشورہ چاہا تو سب نے مخالفت کی، بعضوں نے حد درجہ اصرار کیا حضرت عمر رض نے تو یہاں تک کہہ دیا:۔

لم نعطى الدنيا فى	اپنے مذہب کے معاملے میں ہم اتنے نیچے
دينا۔	کیوں اتریں۔

اب تو چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے اور فرمایا میں اللہ کا رسول ؐ اور اس کا بندہ ہوں۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ معاملہ مشورہ اور گفت وشنید کا نہیں، شاید آسمان سے وحی نازل ہو چکی ہے۔ چنانچہ سب نے خدا سے توبہ اور نبیؐ سے معذرت کی۔ اور اللہ نے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا کی آیت نازل کی۔

اگر ہم ان تمام مواقع کی تفصیل پر متوجہ ہوں تو بات ضرورت سے بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی، پھر جو تھوڑے سے واقعات پیش کیے گئے وہ اس ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ عہد نبویؐ میں احکام کا نزول پوری تفصیل کے ساتھ نہیں ہوتا تھا، وحی خداوندی آتی تھی اور رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو عام اور خاص مصالح کی طرف متوجہ کر دیتی تھی، بلا اس کے کہ ان کی اس آزادی کی راہ میں حائل ہو جو انھیں حق دیتی ہے کہ سچائی بھلائی اور انصاف کی حدود میں اپنے معاملات کے لیے اپنی مرضی کے مطابق تدبیریں پیش کریں اور شاید ہمارے اس خیال کی سب سے زیادہ قطعی اور صحیح دلیل یہ ہوگی کہ قرآن کریم نے سیاسی امور کی مجمل یا مفصل کوئی تنظیم نہیں پیش کی، اس نے صرف "عدل" "احسان" اور "رشتہ داروں کی خبرگیری" کا حکم دیا "فحشاء" "منکر" اور "بغی" سے بچنے کی تاکید کی اور اس کے لیے عام حدود مقرر کر دیئے اور پھر مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہ کر اپنی مرضی کے مطابق انتظامات کریں، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت کے ذریعے حکومت یا سیاست کے لیے کسی مقررہ نظم کا نقشہ نہیں بنا گئے، بیماری شدید ہو جانے پر بھی آپ نے مسلمانوں کے لیے اپنے صحابہ رض میں سے کسی کو اپنا خلیفہ کسی تحریری حکم کے ذریعہ مقرر نہیں فرمایا ہاں آپ نے حضرت ابوبکر رض کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ پھر مسلمانوں نے خیال کیا کہ صدیق اکبر رض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کے لیے پسند فرمایا تو کیا مضائقہ ہے اگر ہم انھیں اپنی دنیا کے لیے بھی پسند کر لیں، اگر مسلمانوں کے لیے کوئی سیاسی آسمانی نظام ہوتا تو یقیناً قرآن میں اس کی شکل بتائی جاتی اور بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حدود اور اصول بیان فرماتے اور بلا کسی بحث و حجت کے مسلمانوں کے لیے اس پر ایمان لانا فرض کیا جاتا۔

ایک اور بات جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا نظام عہد نبویؐ میں اور آپؐ کے دونوں خلفاء کے زمانے میں آسمانی نہ تھا، بیعت کا سلسلہ ہے جس کا اجراء خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد سے کیا سب لوگ جانتے ہیں کہ بدر کے موقع پر صحابہ رض کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف حکم نہیں دیا تھا ہاں آپ نے تحریک کی تھی اور رغبت دلائی تھی اور اللہ کی طرف سے دو میں سے ایک نیکی کا وعدہ کیا تھا اور انصار سے اس بات پر معاملہ طے ہوا تھا کہ آپؐ ان کو جہاد پر نہیں لے جائیں گے البتہ اگر آپؐ پر کوئی افتاد آ پڑے تو وہ مدافعت میں حصہ لیں گے، ان حالات میں غزوۂ بدر کا موقع آیا تو آپ نے صحابہ رض سے مشورہ لیا

اور منتظر رہے کہ صحابہ رض اپنے خیالات پیش کریں گے، بہر حال میدانِ جنگ میں آپ ان لوگوں کو لے کر اس وقت تک نہیں گئے جب تک انصاری سرداروں نے یہ نہیں کہہ دیا کہ اگر آپ ہمیں اس دریا میں بھی لے چلتے تو ہم یقیناً آپ کے ساتھ ہوتے، اس طرح آپ پر واضح ہو گیا کہ وہ جہاد کے لیے راضی تھے، لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ حدیبیہ کے دن جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ قریش نے حضرت عثمان رض کے ساتھ فریب کیا ہے تو آپ نے قریش سے لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ کچھ توجہ دلائی تھی جس پر لوگوں نے جان تک کی بازی لگا دینے کی بیعت کی، اس وقت اگر کوئی بیعت نہیں کرتا تو اس کے لیے گنجائش تھی، بلا استثنا سب نے بیعت کی کیونکہ وہ رسول ؐ پر اور رسول ؐ بھیجنے والے خدا پر ایمان رکھتے اور اس کی پکار کا جواب دینے کے لیے تیار تھے، اسی بیعت کے متعلق سورۂ فتح میں خدا نے آیت نازل فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا	کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں
يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ	وہ در حقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں ان کے
أَيْدِيهِمْ	ہاتھ پر خدا کا ہاتھ ہے۔

اور پھر قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں مسلمانوں کو جہاد کے لیے دعوت اور رغبت دلائی گئی ہے ان میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو اس فرض کی ادائیگی میں پچھڑ گئے اور خدا اور اس کے رسول ؐ نے انھیں معذور سمجھا اور ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جن کا عذر نہیں سنا گیا لیکن ان میں سے کسی کو نبیؐ نے خود سزا نہیں دی بلکہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔

پھر یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ خلافت کی بنیاد بیعت پر قائم ہے۔ یعنی عوام کی مرضی پر، اسکے معنی یہ ہیں کہ خلافت حاکم اور محکوم کے درمیان ایک معاہدہ ہے جو ایک طرف خلفاء کو اس بات کا ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر حق اور انصاف کی حکومت کریں گے ان کے مصالح کی رعایت کریں گے اور ان کے معاملات میں بس پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر عمل کریں گے اور دوسری طرف مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کریں گے اور اس کے لیے خیر خواہی اور نصرت کا باعث ہوں گے۔

بلاشبہ کسی خلیفہ کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی سلطانی اور حکمرانی مسلمانوں پر اپنی طرف سے فرض کر دے تا آنکہ مسلمانوں سے قول و قرار نہ کرے اور ان سے بھی عہد نہ لے لے اور اس طرح ایک مشترک معاہدے کی روشنی میں حکومت ہو، یہی وجہ ہے کہ اقتدار اور سلطانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں دخیل نہ ہو سکی اور آپ نے اہلِ بیت کو اس کا وارث نہیں بنایا اور خود ابو بکر رض کو بھی یہ منصب جماعت کی بیعت اور اعتماد کے

بغیر نہیں ملا، پھر ابوبکر رض نے اپنی اولاد کو اور عمر رض بن خطاب نے اپنے بیٹوں کو وارث نہیں بنایا۔ حضرت عمر رض کی خلافت عام مسلمانوں کے مشورے کی بنیاد پر ہے، اس لیے کہ جب تک صدیق اکبر رض کی رائے کو ایک قابلِ قبول مشورہ جان کر عوام نے اپنی رضامندی اور بیعت کا اعلان نہیں کر دیا حضرت عمر رض خلیفہ نہیں بن سکے۔ چنانچہ حضرت عثمان رض صدیق اکبر رض کی رحلت سے پہلے ان کا مُہر کردہ لفافہ لے کر مسلمانوں تک پہنچے اور ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس لفافے میں لکھے ہوئے شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں گے لوگوں نے جواب دیا، ہاں، کیونکہ ان کو حضرت ابوبکر رض پر اعتماد تھا اور آپ کو اپنا سچا خیرخواہ اور مخلص دردمند یقین کرتے تھے۔ حضرت عمر رض کا کوئی لڑکا خلافت کا وارث نہیں ہو سکا۔ آپ نے ہرگز گوارا نہیں کیا کہ آپ کے بعد آپ کا کوئی لڑکا خلیفہ ہو، ہاں آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ رض کو مجلس شوریٰ میں شرکت کی اجازت ضرور دی، لیکن اس شرط پر کہ وہ بحث میں کوئی حصہ نہ لیں اور یہی وجہ تھی کہ امیر معاویہ رض کے عہد میں جب حکومت میں وراثت کا پیوند لگ گیا تو عام مسلمانوں نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور کہنے والوں نے کہہ دیا کہ "معاویہ رض خلافت کو ہرقل اور کسریٰ کی چیز بنا رہے ہیں" پس ان تمام باتوں سے اگر کچھ نتیجہ نکلتا ہے تو وہ یہی کہ عہد نبویؐ میں جو نظامِ حکومت تھا وہ کوئی الٰہی نظام نہ تھا، جس میں لوگوں کی رائے اور مشورے کو کچھ دخل نہ ہو، پھر جب عہد نبویؐ میں یہ بات نہ تھی جب کہ وحی کا سلسلہ جاری تھا، تو پھر اس سلسلے کے ٹوٹ جانے کے بعد صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کے دور میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ اس نظام کو الٰہی نظام تصور کرتے ہیں وہ حقیقت میں ان الفاظ اور کلمات سے دھوکا کھاتے ہیں جو وہ خلفاء کے خطبات میں پڑھتے ہیں۔ نیز ان روایات سے جو خلفاء کے بارے میں عام طور سے مشہور ہیں اور جن میں اللہ کا ذکر، اللہ کا حکم اور اس کی سلطانی اور اطاعت کا تذکرہ ہے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ الفاظ اور یہ روایات اس امر کا ثبوت ہیں کہ نظامِ حکومت آسمانی تھا۔ حالانکہ ان میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بالکل عام لیکن ساتھ ہی بڑی اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ خلافت، خلفاء اور عام مسلمانوں کے مابین ایک معاہدہ ہے، اور اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ معاہدہ کر لیں تو اس کو پورا کریں خواہ اس معاہدے کا تعلق حکومت کے معاملات سے ہو یا خارجی تعلقات سے یا چند اشخاص کے درمیان کسی معاملے سے، بہر حال اللہ قول و قرار کی پاس داری کا حکم دیتا ہے اور وہ انسانوں کے دلوں کا شاہد ہے کہ وہ وفاداری کرتے ہیں یا غداری، وہ وفاداری پر ثواب اور غداری پر شدید عذاب دے گا۔

پس اس نقطۂ نظر سے اسلام اور مسیحیت میں کوئی فرق نہیں، اسلام بھلائی پھیلانا اور برائی روکنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ عوام کی زندگی عدل وانصاف کی بنیاد پر قائم ہو اور ہر قسم کی زیادتی سے خالی ہو اسلام ان حدود کے قیام کے بعد عوام کو آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے معاملات کی تنظیم اپنی مرضی کے مطابق کریں، مسیحیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ حضرت مسیح ؑ نے کسی موقع پر بنی اسرائیل کے بعض معترضین سے کہا: "قیصر کا حق قیصر کو اور اللہ کا حق اللہ کو دو" میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ ؑ کا منشا اس سے ہرگز یہ نہیں تھا کہ قیصر کا حق انصاف اور صداقت کو پامال کر کے دیا جائے، یا یہ کہ قیصر اور عوام کے تعلقات کی بنیاد ظلم اور خوف پر رکھی جائے۔

اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ آپ پڑھیں گے کہ عہدِ عثمانی رض میں کچھ مسلمانوں نے حضرت عثمان رض کے بعض گورنروں سے اس بات پر اتفاق نہیں کیا کہ خراج اور ٹیکسوں کی یہ رقم جو جمع کی جاتی ہے اللہ کا مال ہے، وہ کہتے تھے یہ مسلمانوں کا مال ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے کچھ مصیبتیں بھی اٹھائیں، اگر مسلمان اس زمانہ کے نظام کو نظامِ الٰہی تسلیم کرتے تو ان کو مال اللہ کہنے سے ہرگز انکار نہ ہوتا۔ حضرت امیر معاویہ رض نے جب ان کے سامنے یہ تعبیر پیش کی گئی تو اس طرح بات بنادی کہ "لوگ اور ان کے پاس جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اس لیے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، پس ان کا مال اللہ کا مال ہے۔"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عہدِ نبوی ؐ کا نظام، الٰہی نظام نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت انسانی معاملات کی سی تھی، جس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان تھا جس میں لوگوں کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کو جانچیں دیکھیں پھر اپنی رضامندی یا ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔

اسلام کا نظامِ حکومت جمہوری نہ تھا

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کا دور، جمہوریت کا دور تھا، لیکن یہ الفاظ کو ان کی مقررہ حدود سے آگے بڑھا دینا ہے اس کے لیے ہم کو جمہوری یا غیر جمہوری ہونے کا حکم لگانے سے پہلے پوری باریکی کے ساتھ خود جمہوریت کا مفہوم مقرر کرنا ہوگا، جمہوریت یعنی وہ حکومت جو عوام نے عوام کے لیے بنائی ہو، جس کے حاکم کا انتخاب عوام نے اپنے آزاد اختیار سے کیا ہو اور جس میں حاکم کے آزاد احتساب اور نگرانی کا حق عوام کو حاصل ہو تاکہ وہ معلوم کرسکیں کہ ان کا حاکم جمہور کی مصلحتوں کے لیے کام

کر رہا ہے یا فاتی مصلحت کا پابند ہے پھر یہ کہ وہ اگر مطمئن نہ ہوں تو اسے معزول کر سکیں۔

یونانی عہدِ قدیم میں جمہوریت کا یہی مطلب سمجھتے تھے اور آج عہدِ جدید میں بھی جن قوموں نے اپنا نظام جمہوری بنایا ہے اس کا مطلب یہی بتلاتے ہیں ہاں لفظ عوام کے مفہوم میں اختلاف رہا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم کا دائرہ یونانیوں کے عہد میں تنگ تھا، اس سے وہ ہم وطنوں کی ایک مختصر جماعت مراد لیتے تھے جس کے افراد تمام حقوق کے مالک ہوتے اور قانون کی نگاہ میں باہم مساوی. لیکن عام انسانوں کا نہ مساوات میں کچھ حصہ تھا اور نہ حکومت میں، فرانس کی بغاوت کے بعد اس لفظ کے مفہوم میں کچھ اور وسعت پیدا ہوئی اور اب اس کے دائرے میں اہل وطن کی ایک بہت بڑی تعداد داخل ہوگئی جسے سیاسی حقوق سے استفادے کا حق دیا گیا۔ لیکن یہ وسعت بھی تمام اہل وطن کو اپنے اندر شامل نہ کر سکی اس لیے کہ عوام کے مفہوم میں اب تک اس قید کی تنگی تھی کہ وہ یا تو ایک مقررہ معیار کے دولت مند ہوں یا ٹیکس کی ایک مقررہ مقدار ادا کرتے ہوں یا تعلیم و تہذیب میں کوئی خاص درجہ رکھتے ہوں، گذشتہ صدی کے اواخر میں اس وسعت کا دامن کچھ اور پھیلا۔ اور وطن کے تمام بالغ مرد عوام میں شامل کر لیے گئے، پھر اس موجودہ صدی میں بات یہاں تک بڑھی کہ تمام بالغ عورتیں بھی جمہور کا جزو تسلیم کر لی گئیں، بہر حال جمہوریت خواہ تنگ ہو یا کشادہ اپنا ایک مقررہ نظام رکھتی ہے، وہ نظام، جمہور کو حقوق کا مالک بناتا ہے اور اس کو اختیار دیتا ہے کہ اپنے حکام پر جانچ اور احتساب کی نظر رکھے۔

اگر ہم جمہوریت کے اسی مفہوم کو پوری باریکی کے ساتھ سامنے رکھیں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں حکومت کا نظام جمہوری نہ تھا اس لیے کہ حکام کا انتخاب اس باریکی سے جمہور نے نہیں کیا تھا۔ نبیؐ کو عوام نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کرنے اور حق و انصاف قائم کرنے کے لیے پسند نہیں کیا بلکہ خود اللہ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا پھر جس کا جی چاہا ایمان لایا جس کا جی چاہا مخالفت کرتا رہا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے صحابہؓ نے آپ کو اپنا حاکم پسند کیا تو کہا جائے گا کہ یہ پسندیدگی جمہوریت کے نظام کے مطابق نہ تھی اور نہ یہ پسند کرنے والے اپنے حاکم پر احتساب اور نگرانی رکھتے تھے۔ وہاں تو یہ حالت تھی کہ خود نبیؐ جب ان سے مشورہ چاہتے تھے تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور یہ مشورہ بھی بہت مختصر اور کبھی کبھی، پھر وہ بھی قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت کو بھی پورے معنی میں جمہوری نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ تمام مسلمانوں نے ان کو خلافت کے لیے منتخب نہیں کیا تھا، انصار اور مہاجرین کے ارباب حل و عقد کی ایک جماعت نے اپنے ابتدائی اختلاف کے باوجود ان دونوں حضرات کو پسند کیا، پھر ان عربوں سے تو مشورہ ہی

نہیں لیا گیا جو مکہ، طائف اور قرب وجوار کے دیہاتوں میں آباد تھے اور حضور ﷺ کی وفات کے وقت مسلمان، مدینہ والوں نے صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کو پسند کیا۔ باقی تمام مسلمانوں نے یہ بات سُنی اور تسلیم کر لیا۔ ایسی حالت میں مرتدوں میں بعض کا یہ کہنا محل تعجب نہیں۔

اطعنا رسول الله ما کان بیننا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک ہم میں تھے
فیا لعباد الله ما لابی بکر	ہم نے ان کی اطاعت کی، اللہ کے بندو اور

رسول کے بعد یہ ابوبکر رض کون ہوتے ہیں؟۔

پھر عوام بلکہ انصار و مہاجرین کی یہ جماعت کوئی ایسا مقررہ نظام نہیں رکھتی تھی جس سے خلفاء کی کارروائیوں پر احتساب کیا جا سکے، اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر باز پرس ہو سکے۔ صورت حال یہ تھی کہ خلفاء اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے اور یہ ساتھی کبھی انفرادی حیثیت میں، کبھی اجتماعی طور پر اپنے خیالات پیش کر دیتے اور خلفاء اسے منظور یا مسترد کر دیتے۔ پس اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے صدر اول کا نظام حکومت ان حدود کے اندر جو جمہوری دستور نے مقرر کی ہیں جمہوری نہ تھا نہ قدیم نقطۂ نظر سے اور نہ موجودہ تخیل کے ماتحت۔

اب اگر جمہوریت کا مطلب وہ عام مفہوم لیا جائے جس میں یہ بات شامل ہے کہ حاکم کو عوام کا پسندیدہ اور معتمد ہونا ضروری ہے۔ نیز یہ کہ وہ عدل و مساوات کے اعتبار سے ایسے کردار کا مالک اور ایسی سیرت کا حامل ہو جس میں اونچ نیچ اور ظلم و زیادتی کے لیے کوئی جگہ نہ ہو تو بلا شک کہا جا سکتا ہے کہ اس عام معنی میں جو حد بندیوں اور معیاریوں سے خالی ہے، اسلام کا دور اول جمہوریت کا دور تھا جس کے بعد آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے لیے عہد عثمانی میں کیسے کیسے فتنے آئے۔

اسلام کا نظامِ حکومت شخصی بادشاہی نہ تھا

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کا نظام حکومت ایک انفرادی شاہی عادلانہ نظام تھا، جس میں صحابہ رض نبی ﷺ کے یا شیخین رض کے شریک حکومت نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت مشیروں کی تھی، اور یہ مشیر بھی لازمی اور ضروری نہ تھے۔ نبی ﷺ اور ان کے دونوں خلفاء عدل کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے سوا کوئی بات ان کی نگاہ میں اہم نہ تھی۔ اس قسم کا تخیل مسلمانوں کے نظام کو اس طرز حکومت سے

قریب کر دیتا ہے جو رومیوں میں شاہی اور قیصری دور میں رائج تھا، روم کے بادشاہ بھی بطور وارث، حکومت کے قطعی حق دار نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا انتخاب ہوتا تھا اور جب کوئی ایک مرتبہ منتخب ہو جاتا تو پھر عمر بھر وہ حکومت کرتا، البتہ شدید بغاوت اور عام نافرمانی کی حالت میں اسے معزول ہونا پڑتا، عہد نبویؐ اور عہد شیخین رضؓ کے اسلامی نظام میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ یہ کہ مسلمانوں کی حکومت کا قوام عدل وانصاف تھا اور رومی بادشاہوں اور قیصروں کا دربار اس سے یکسر وبیشتر خالی تھا، لیکن یہ خیال بھی پہلی دوراِیوں کی طرح کچھ بڑی گہری اور دقت نظر پر مبنی نہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ رومیوں کے یہاں بادشاہوں کے انتخابات میں مذہب ایک زبردست طاقت تھی جو خود ان بادشاہوں کی سیرتوں پر بھی اثر انداز تھی پس رومی اور اسلامی نظاموں میں مذہب، مذہب کا فرق ہے۔ جس طرح قومیت اور ماحول کا فرق ہے۔ وہ مذہب جو رومی بادشاہوں پر غالب تھا اپنے اندر رفعت اور پاکیزگی کی کوئی ایسی شان نہیں رکھتا تھا جو اس کو آسمانی مذاہب سے کم وبیش مشابہ بنادے، اس کی بنیاد تو بدشگونی اور نیک فالی پر تھی، آج جب ہم پڑھتے ہیں کہ اس مذہب کی روشنی میں کس طرح غیب کی باتیں معلوم کرنے کی ترکیبیں کی جاتی تھیں تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

وہ ارتقاء جس نے رومی عوام کو ان کی ابتدائی اور سادہ زندگی سے نکال کر ایک پُر تکلف اور پیچیدہ حیات سے آشنا کیا اس ارتقاء سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جس نے عربوں کو ان کے دور جاہلیت سے کھینچ کر اسلام تک پہنچایا، رومی انقلاب ایک مادی انقلاب تھا، اگر یہ تعبیر درست سمجھی جائے جو تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ تدریجی طور پر ظہور پذیر ہوا اور عربی انقلاب ایک معنوی انقلاب تھا جس کی تبدیلی طبیعتوں کی تبدیلی تھی جو عربوں میں اسلام کی تاثیر سے ہوئی پس کہنا چاہیئے کہ عربی انقلاب اندر سے باہر آیا طبیعتیں بدلیں اور عربوں نے اپنی زندگی کا مادی نقشہ بدلا ہوا پایا اور رومی انقلاب اندر سے باہر آیا، خارجی حالات نے پلٹا کھایا اور رومیوں کے دل اور طبیعتیں بدل گئیں۔

پھر رومی اور عربی ماحول جُدا جُدا ہیں، اتنے جُدا جتنا اٹلی سے حجاز، تو کیا تعجب کہ اسلام کے صدر اول کا نظام حکومت رومیوں کے شاہی دور کے نظام حکومت سے بالکل جدا ہوا۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ رومیوں کا وہ نظام حکومت جو ان کے جمہوری دور سے متعلق ہے وفاتِ نبویؐ کے بعد والے نظام حکومت سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتا ہے، اس دور میں رومی اپنے قنصل کا انتخاب تقریباً اسی طرح کرتے تھے جیسے مسلمان اپنے خلفاء کا۔ اور مہاجرین سے انصار کا یہ کہنا۔

منا امیر و منکم امیر ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا

اسی طرز فکر کی ایک آواز ہے۔

رومی قنصل منتخب ہو جانے کے بعد اسلامی خلفاء کی طرح مؤثر اور شاندار حیثیت کے مالک ہو جاتے تھے لیکن ان میں اور خلفاء میں یہ فرق ہے کہ قنصل صرف ایک سال کے لیے منتخب ہوتا تھا اور خلیفہ زندگی بھر کے لیے۔ قنصل کا اقتدار ان احکام و قوانین کا پابند تھا جو مجلس شیوخ اور مجلس عوام کی طرف سے صادر کیے جاتے اور خلیفہ کی حکمرانی پابند تھی دین کے مقررہ حدود کی، یا جلیل القدر صحابہؓ میں سے کسی ایک کے مسلک کی، یا عامۃ المسلمین کے مصالح کی، لیکن عرب اور اٹلی میں مشابہت کی یہ باتیں بناوٹی معلوم ہوتی ہیں اور اگر ہم ان باتوں میں قنصل کی حکومت کے تکلفات اور تزک و احتشام کی داستانیں بھی جوڑ دیں جس کا خلیفہ کے ماحول میں کہیں بھی پتہ نہیں یا بعض ان اقدامات کا تذکرہ کریں جو رومی جمہوریت نے عوام کی حمایت میں قنصل کے اقتدار پر کنٹرول کرنے کے لیے حالات سے مجبور ہو کر کیے تو مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے اور نظر آنے لگتا ہے کہ عربی نظام حکومت کے اس مختصر عہد کا رومی نظام سے دور و نزدیک کا کوئی رشتہ نہیں، چاہے شاہی دور کا نظام ہو چاہے جمہوری دور کا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے سیاسی امور میں، انتظامی معاملات میں اور جنگی فنون میں قیصری و کسروی نظاموں سے بہت کچھ اقتباس کیا لیکن جس زمانے سے متعلق ہم یہ بحث کر رہے ہیں، یہ اقتباس اس سے بہت بعد کا ہے، اس لیے ہمیں یہ مشابہت والی باتیں یہیں ختم کر دینی چاہئیں، جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسلام کا نظامِ حکومت خالص عربی نظام تھا

پس اس وقت کا اسلامی نظام حکومت نہ استبدادی تھا نہ یونانیوں کا بنا ہوا جمہوری اور نہ رومیوں کا سا شاہی، جمہوری یا مشروط۔ اور مقید قیصری بلکہ وہ تو ایک خالص عربی نظام تھا جس کے خاکے اسلام نے بنائے اور مسلمانوں نے ان کو پُر کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اپنی بعض تحریروں میں عربی نثر کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ قرآن نہ شعر ہے نہ نثر، حقائق کی تعبیر میں، مسائل کی تصویر میں اور احکام کے بیان میں اس کے خاص خاص اسلوب ہیں اور مختصر طرز ادا۔ اس میں موسیقی کی بعض خصوصیتیں پا کر سادہ طبیعتوں نے خیال کر لیا کہ قرآن شعر ہے۔ قوافی کی پابندی دیکھ کر خیال کیا گیا وہ کلام مقفیٰ ہے، بعض دوسرے سادگی پسندوں نے اس کی سلاست اور

روانی اور قیود و شرائط کی عدم پابندی دیکھ کر نثر کا حکم لگادیا۔ قریش کے مشرکین کو یہی دھوکا ہوا اور انھوں نے قرآن کو شعر کہہ دیا جس کی تردید کی گئی، اسی طرح بعض ان محققین نے دھوکا کھایا جو عربی نثر کی تاریخ تلاش کر رہے تھے اور کہہ دیا کہ قرآن سب سے پہلی عربی نثر ہے۔ واقعات اس قول کی شدید ترین تکذیب کرتے ہیں، اگر عربی کے نثر نگار قرآن جیسی عبارت لکھنے کی کوشش کرتے (اور بعضوں نے کی بھی) تو یہ عمل مذاق اور مضحکہ کی حد سے آگے نہ بڑھتا۔

یہ بات میں نے قرآن کے بارے میں کہی تھی، اس وقت اس قسم کی ایک اور بات ابتدائی عربی اسلام نظام حکومت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کوئی ملوکی نظام نہ تھا۔ نبیؐ اور نبی کے دونوں خلفاء کے لیے اس سے زیادہ تکلیف پہنچانے والی کوئی اور بات نہ تھی کہ ان کو بادشاہ کہا جائے اور نہ جمہوری نظام تھا اس لیے کہ جمہوری نظاموں میں ایسا کوئی پہلو نہیں ہے جو منتخب صدر کو زندگی بھر صدر بنائے رکھے اور نہ رومی نقطۂ نظر کا قیصری نظام تھا اس لیے کہ خلیفہ کا انتخاب فوجی حلقے نہیں کرتے تھے۔ پس وہ خالص عربی نظام تھا، جس کی نظیر عربوں کے پاس نہ تھی، پس وہ اس کی تقلید بھی نہ کر سکے، لیکن اس کے باوجود ہمارے لیے گنجائش ہے کہ ہم اس کی تحلیل کریں، اس کی باریکیوں کی چھان بین کر کے اس کا پتہ چلائیں کہ کیا اس نظام میں برقرار رہنے کی طاقت تھی یا وہ اپنی تخلیق اور ترقی سے محیط حالات کے بدلتے ہی اپنی جگہ سے ہٹ جانے والا تھا۔

اسلامی نظام حکومت کے عناصر

پہلا عنصر دین

اس نظام کے اجزاء میں وہ جزء جس کی طرف ہماری نظر سب سے پہلے جاتی ہے مذہبی عنصر ہے اس لیے کہ آسمانی نہ ہونے کے باوجود یہ نظام آسمان سے بہت زیادہ متاثر ہے اور خلیفہ کے احکام ہر چند کہ وحی والہام نہ تھے، لیکن وہ بہر حال حدود اللہ کے تابع تھے، یعنی حق وانصاف کا قیام، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

وحی الٰہی کا یہ سلسلہ جو پورے تئیس سال جاری رہا اور صبح و شام کبھی آیات قرآنی کی شکل میں، کبھی نبیؐ کی زبان سے حدیث بن کر اور کبھی سیرت نبویؐ میں عملی زندگی ہو کر مسلمانوں سے متصل رہا، اس نے

خاصانِ نبیؐ کی طبیعتوں کو جگا دیا۔ ان کے سینوں میں ایک زندہ قوی اور دین آشنا دل روشن کر دیا۔ پھر غیر ممکن ہوگیا کہ مسلمان اپنے قول، اپنے عمل، اپنے فکر، بلکہ اپنے سونے اور جاگنے میں بھی دل زندہ کی زد سے نکل سکے۔

چنانچہ وہ جس حال میں بھی رہا، حاکم رہا تو رعایا کے ساتھ تعلقات میں، رعیت رہا تو حاکم سے ربط و ضبط میں، نیز ساتھیوں سے میل جول اور روزمرّہ کی زندگی میں، اپنے زندہ اور ایمان دار دل کی روشنی سے الگ نہیں رہا۔ یہی نقشہ دیکھ کر اکثر لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اس عہد کا نظام ایک الٰہی نظام ہے جو آسمان سے اُترا ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، اصل بات خلیفہ اور اس کی رعایا کے دلوں کا متاثر ہونا ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت کا دُوسرا عُنصر

دینی سیادت

اس نظام کا دوسرا جُز وہ نسبتی شرف اور بزرگی ہے۔ جس کی بنیاد نہ نسل پر ہے نہ دولت پر اور نہ سماج کے کسی بڑے درجے اور منصب پر، بلکہ اس کی بنیاد ان تمام باتوں سے زیادہ اہم ایک حقیقت پر ہے اور وہ ہے نبیؐ کی مقدس زندگی میں اس کا نبیؐ سے تعلق، ارشاداتِ نبویؐ پر اس کا درجۂ یقین اور بحالات امن و جنگ اللہ کی راہ میں مصائب اور مشقتوں کا برداشت کرنا۔

ان اوصاف نے اسلام کے آغاز ہی میں ممتاز افراد کا ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا، جو اپنے امتیازی درجے کی وجہ سے کسی دنیاوی حق کا خواہاں نہ تھا۔ اپنی ذات کے لیے کوئی فوری یا متوقع منفعت نہیں چاہتا تھا، خود رسولؐ نے ان کو اپنی محبت سے نوازا اور عوام کو مطلع کیا کہ خدا بھی اسی طبقہ سے محبت رکھتا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت دکھائی، جو اللہ کی راہ میں مصیبتیں اور عذاب برداشت کرتے رہے جو اپنا دین ساتھ لیے حبش اور پھر مدینہ ہجرت کر گئے، اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے دھن دولت اور جانیں نثار کر دیں، پروانے کی طرح شمعِ نبوت کا ماحول نہیں چھوڑا، جو کچھ کہا جاتا سنتے، جو کچھ بیان ہوتا قلمبند کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن سے اس طبقہ کی تشکیل ہوئی۔ اس طبقہ کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے کو دوسروں سے ممتاز اور برتر خیال نہیں کرتا تھا، اپنا درجہ عام انسانوں کے درجے کے برابر جانتا تھا یہی انکسار اور فروتنی اللہ کے نزدیک اس کے درجات کی بلندی کا باعث تھی۔ عوام کی نگاہوں میں بھی اس

تواضع سے اس کی عظمت اور منزلت بڑھتی جاتی تھی، یہ طبقہ بڑے بڑے نامی گرامی خاندان والوں کا نہ تھا، اسکے افراد غیر معمولی دولت منداور لکھ پتی نہ تھے۔ ادھر اُدھر کے معمولی لوگ جن میں وہ غلام بھی تھا جسے دین کی سزا میں عذاب دیا جارہا تھا، جس کو بعض مسلمانوں نے خرید کر آزاد کردیا، ان ہی میں وہ کمزور اور بے سروسامان بھی تھا جو پناہ کی تلاش میں مکہ آیا اور زندگی کے دن قریش کے کسی قبیلے یا کسی سردار کی حمایت میں بسر کرنا چاہتا تھا، ان ہی میں بعض وہ بھی تھے جو کہیں سے مکہ آئے اور امن وامان اور کاروبار دیکھ کر وہیں رہ پڑے اور وہ بھی جو خاندان اور نسب کے اونچے لیکن زر ندارد، مفلوک الحال چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کٹ جائیں۔

یہ تھے اس طبقہ کے افراد، اور اسلام نے ان سب کو ایک ہی درجہ دیا تھا، اگر کوئی امتیاز کی بات تھی تو وہ اسلام کی راہ میں آزمائشوں کا حصہ، مصائب اور آلام کے نزول کے وقت صبر وثبات کی کیفیت، ضرورت کے وقت نبیؐ کی جان ومال سے امداد۔

اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس طبقے کے افراد کا امتیاز عوام میں قدرتی طور پر بڑھا۔ جن حقوق اور درجات کا عوام ان کو حق دار خیال کرتے تھے وہ اپنی ذات کو اس کا مستحق تصور نہیں کرتے تھے اسی طبقہ کے افراد عام مسلمانوں کو دین سکھاتے اور جو کچھ انھیں معلوم نہ ہوتا اس سے انکار کرتے تھے۔ بسا اوقات جب قبائل کے لوگ نبیؐ سے درخواست کرتے کہ ان کے پاس ارکان سکھانے والے بھیجے جائیں تو حضرتؐ اسی طبقہ کے افراد کو معلم، فقیہ اور امام بنا کر بھیجتے تھے۔ پھر ابھی ہجرت پر چند ہی ماہ گذرے تھے کہ معرکۂ بدر نے پوری سرزمین عرب میں اسلام کی عزت دوبالا کردی اور اس کا رعب تمام عربوں پر چھا گیا تھوڑے ہی دنوں بعد اس معرکہ میں شریک ہونے والے بدری کہلائے اور مسلمانوں میں ایک خاص امتیاز کے مالک بنے، اب اگر نبیؐ کے ساتھ کسی اور غزوہ میں کسی کو شرکت کا موقع ملا تو وہ مزید امتیاز کا مستحق ہوا۔ اور اگر اُحد کے موقع پر اقلیت کی فضا میں ثابت قدم رہنا کسی کے نصیب میں تھا تو وہ اور بھی ممتاز ہوا۔ کسی صحابیؓ کے لیے امتیاز کا آخری درجہ یہ تھا کہ نبیؐ اس کی تعریف کریں اسے دوسروں کے لیے امام اور رہنما کا درجہ دیں، اسے جنت کی بشارت سنائیں اور اعلان کردیں کہ وہ اس سے راضی اور خوش ہیں ان تمام باتوں میں کوئی حیرت اور تعجب والی چیز نہیں اس لیے کہ یہ حالات کے تقاضے ہیں۔ اس سلسلے میں توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ صحابہ رضؓ کا یہ ممتاز گروہ جو باہم مختلف امتیازات اور فضائل کا حامل تھا، نبیؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے تمام معاملات کا متولی ہوا۔

اسی گروہ سے اس فرد کو پسند کیا جائے گا جو امت میں نبیؐ کا جانشین ہوگا۔ اسی گروہ پر خلیفہ کو

استناد کرنا ہوگا تاکہ لوگ اس کو مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور یہی گروہ ہے جس کے مشورے کا ضرورت کے مواقع پر خلیفہ محتاج ہے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہوئی کہ نبیؐ کی وفات پر چند دن نہیں چند گھنٹے ہی گذرے تھے کہ اسلام نے سیادت کی ایک نئی شکل دیکھی جو بذاتِ خود حکومت سے شدید اتصال رکھتی تھی۔ چنانچہ جب خلافت پر بحث شروع ہوئی، انصار نے قریش سے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے۔ حضرت ابوبکر رض نے نبیؐ کی حدیث سنائی "خلفاء قریش میں سے ہوں"۔ اور اس کے بعد انصار رض سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہم امیر ہوں اور تم وزیر، انصاریوں نے یہ بات قبول کر لی اور بجز سعد بن عبادہ رض کے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

قریشی سیادت

اسی وقت سے اسلام میں ایسی سیادت کی بنیاد پڑی جس کا قوام یعنی جوہری جُز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب اور آپ کی صحبت تھی۔ چنانچہ قریش کے لیے حکومت اور انصار کے لیے مشورہ طے پایا اور مشورہ دینا ہر مسلمان کا عام حق بھی ہے، پس قریش حکومت کریں اور مشورہ لیں اور عرب انصار اور غیر انصار ان کے مشیر ہوں۔ ان کے لیے حکومت کرنے کا موقع نہیں، لیکن اس سیادت کی حقیقت سمجھنے میں ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور غور کرنا چاہیئے کہ حضرت ابوبکر رض اور آپ کے مہاجر ساتھیوں کا مطلب کیا تھا اور قریش والوں نے بعد میں کیا مطلب نکالا؟ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رض حضرت عمر رض اور ابو عبیدہ رض بن جراح کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ "خلفاء قریش میں سے ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ عام قریشی خلافت کے حقدار ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رض اور آپ کے ساتھیوں نے مہاجرین رض پر نظر ڈالی جو سب سے پہلے اسلام لائے اور اشاعتِ دین کے لیے مکہ کی انتہائی تنگی اور سختی کی زندگی میں اپنے مال و متاع سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی انھیں معلوم ہوا کہ ان مہاجرین کی اکثریت قریشی ہے۔ نیز قرآن و حدیث میں اور عوام کی زبان پر مہاجرین کا ذکر پہلے اور انصار کا بعد میں ہے میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت ابوبکر رض کا مطلب قریش کے اسی ممتاز طبقے سے ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور جس نے مکہ کی پُر آشوب اور پُر خطر زندگی میں نبیؐ کے ساتھ مل کر جہاد کیا اور جس کے ساتھ مدینہ کی

باشوکت زندگی میں انصار نے مل کر کام کیا۔

اگر حضرت ابوبکر رض، حضرت عمر رض اور ابوعبیدہ رض نے ایک قبیلہ کی حیثیت سے قریش کا تصور کیا ہوتا جن کا تعلق نسبی اور قرابتی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو اس تخیل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ خلافت کے لیے اس شخص کو پسند کرتے جو قریشیوں میں قرابت کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب ہوتا، وہ آپؐ کے چچا عباس رض یا حضرت علی رض کو امیدوار بناتے جو نہ صرف آپ کے داماد تھے بلکہ پرورش کردہ بھی، پس حضرت ابوبکر رض اور آپ کے ساتھیوں کا مقصود قریش سے یہی مخصوص اور ممتاز مہاجرین تھے، اور یہ تو سب سے بڑی حماقت ہوگی اگر کوئی سمجھے کہ صدیق اکبر رض اور ان کے ساتھیوں نے نبیؐ سے قریش کی قرابت ہی کو خلافت کا سبب اور سرچشمہ قرار دیا، اگر اس قسم کی کوئی گنجائش ہوتی تو حضرت ابوبکر رض، حضرت عمر رض اور حضرت ابوعبیدہ رض کے نزدیک بہت سے سربرآوردہ اور امان یافتہ قریشی ان بہادروں سے زیادہ خلافت کے حقدار ہوتے جنھوں نے مہاجر مجاہدوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، اور انصاری بزرگوں میں سے ابوسفیان، صفوان بن امیہ اور حارث بن ہشام ان ممتاز انصاریوں سے امامت کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے، جنھوں نے پہلے سے اپنی جگہ اور ایمان پختہ کر لیا تھا، بہرحال قریش نے حضرت ابوبکر رض کی بات کا وہ مطلب نکالا جو ان کا اور ان کے ساتھیوں کا مقصد نہ تھا اور یہ یقین کر بیٹھے کہ امامت قریش کا حق ہے، جو کسی اور طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس کی بنیاد نبیؐ سے قرابت پر ہے۔ بلاشبہ قریش کا یہ مطلب نکالنا زبردستی کی کھینچ تان اور کھلی ہوئی غلطی تھی۔ قریش کی رائے اگر معقول ہوتی تو بنی ہاشم دلیل میں غالب آجاتے اور وہ جب تک بھی سنبھال سکتے خلافت کا بار اٹھانے کے زیادہ مستحق تھے۔ لیکن اسلام نسب اور کسی منصب کی بنا پر کسی کو کسی پر فضیلت کا قائل نہیں وہ تو فضیلت کی بنیاد تقوٰی، قابلیت اور آزمائش میں ثابت قدمی پر رکھتا ہے۔

ہمارے خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت عمر رض سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ وہ کسی کو خلیفہ بنا دیں تو آپ نے فرمایا اگر ابوعبیدہ رض زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا، اگر سالم مولیٰ ابی حذیفہ زندہ ہوتے تو انھیں یہ امانت سپرد کرتا، اور یہ سالم مولیٰ ابی حذیفہ قریشی نہیں تھے، بلکہ وہ نسبًا عرب بھی نہ تھے، وہ بچپن ہی میں اصطخر سے لائے گئے تھے، ایک انصاری عورت نے جو ان کی مالک تھی ان کو آزاد کیا، پھر ابوحذیفہ قریشی ولاء میں آئے۔ نبیؐ کی زندگی ہی میں لوگ انھیں دینی معاملات میں پیش پیش رکھتے تھے، وہ اس زمانے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کا انتظار کیا جا رہا تھا

سلہ میراث ۱۲۔

مہاجرین کو نماز پڑھایا کرتے تھے، جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ عہد صدیقی میں وہ یمامہ میں مرتدوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

یہ سن کر کہ سالم ولاء کی بناء پر قریشی تھے، کوئی صاحب یہ منطق نہ پیش کردیں کہ اگر وہ زندہ ہوتے اور حضرت عمرؓ ان کو خلیفہ بنا دیتے تو بہر حال امامت قریش ہی میں رہتی، اس لیے کہ یہ ایک فضول سی بات ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ولاء کی بنا پر جو تعلقات قائم ہوتے ہیں وہ متعلقہ افراد کو آزادوں کے مساوی نہیں بنا دیتے۔ عرب سالم کے نسب سے واقف نہیں تھے اور چونکہ خدا نے حکم دیا تھا، کہ "موالی" کو اس کے باپ کے نام سے پکارا جائے اور اسی لیے زیدؓ کو ان کے والد حارثہ کے ساتھ ملا کر زید بن حارثہ کہا جانے لگا، سالمؓ کو عرب "من الصالحین" کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ ان کے والد کے نام سے واقف نہ تھے، ہاں تو حضرت عمرؓ کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا خلیفہ اس کو بنادیں جو قریشی نہ تھا بلکہ عرب بھی نہ تھا۔ حضرت عمرؓ اپنے اس خیال میں بالکل صحیح راہ پر تھے اور اصول اسلامی کے ماتحت نسب اور نسل کی بنیاد پر فضیلت دینا نہیں چاہتے تھے، وہ تقویٰ، قابلیت اور آزمائش کے قائل تھے اور سالم میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔

بہر حال قریشی سیادت کی یہ بات جو یک بیک سامنے آئی اور اس طرح آئی کہ عوام کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا، غلط طور پر یہ سمجھی گئی، حضرت ابوبکرؓ نے چاہا تھا کہ خلافت مہاجرین میں اس وقت تک رہے جب تک ان میں اس کا بار اٹھانے کی قابلیت اور قدرت ہے۔ مگر قریش نے اس خواہش کا رخ اپنی منفعت اور خاندان کی طرف پھیر دیا اور اسلام کی ایک اہم بنیاد "مسلمانوں میں مساوات" کی پروا نہ کی، اس راہ پر آجانے کے بعد قریش نے ایک قدم اور بڑھایا جس کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر بہت دور تک پہنچے، انھوں نے عرب کو ان تمام مسلمانوں پر فضیلت دی جن کا تعلق عرب خاندان سے نہ تھا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ خلافت کو قریش سے مخصوص کر دینے کی بنا پر مسلمان کیسے کیسے فتنوں میں مبتلا ہو گئے۔ اور اسی برتری اور فضیلت کے تصور نے بنی امیہ سے حکومت چھین کر بنی عباس کے حوالے کر دی۔

نظامِ حکومت کے عناصر میں انقلاب

پس معلوم ہوا کہ صدرِ اول میں اسلام کا نظامِ حکومت دو ممتاز عنصر رکھتا تھا، ایک معنوی جو حاکم اور محکوم دونوں کو یکساں طور پر نیکی اور انصاف کا حکم دیتا تھا، دوسرا عنصر ان خواص و اشراف کا وجود جو قابلیت، تقویٰ، آزمائش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت اور صحبت کا غیر معمولی درجہ رکھتے تھے اور دوسرے عنصر سے قریش نے کنارہ کشی کر لی، اب یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ دونوں عناصر مسلسل انقلابات اور حوادث کی موجودگی میں زمانہ کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتے تھے، دین آشنا زندہ اور مضبوط دل کچھ لوگوں کو مل سکتا ہے لیکن اس کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ بیٹوں اور پوتوں کو بھی وراثت میں وہی دل ملے گا، بلا شبہ جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل رہا، جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے تعلیم و تربیت کی روشنی حاصل کرتے رہے، وہ اپنے اعمال، اقوال، اور افکار میں وہ کیفیت پیدا کر سکتے ہیں جو سیرتِ نبویؐ کی نمائندگی کرتی ہو، لیکن ان کی آنے والی نسل میں ایسی اولاد بھی ہو سکتی ہے جو ان کا نمونہ نہ ہو، ان میں ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جنھیں نبیؐ کی صحبت کا موقع بہت کم یا مطلق نہ ملا ہو، ایسی حالت میں اگر ان کے دلوں میں وہ مذہبیت وہ قوت اور وہ زندگی نہ ہو جو خاصانِ رسول کا حصہ تھی تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔

نظامِ حکومت کی راہ میں پہلی مشکل

پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ حکومت کے معاملات اسی وقت ٹھیک ہوتے ہیں جب حاکم اور محکوم دونوں میں نظامِ حکومت سے متعلق تعاون اور اشتراک ہو، چنانچہ سیاسی مشکلات اور آویزشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ حاکم زندہ دل ہے، انصاف اور نیکی کے پھیلاتے میں مؤثر اور اللہ کی رضامندی کا حریص ہے بلکہ اس کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ رعایا کے دل بھی زندہ ہوں ان میں انصاف اور نیکی کے لیے تڑپ ہو اور وہ بھی خدا کی خوشنودی کے لیے بیتاب ہوں۔

یہی وہ سب سے پہلی رکاوٹ تھی جو اس نئے نظام کی راہ میں حائل ہوئی، عرب سب کے سب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی نہ تھے، ان کی اکثریت آپ کی صحبت نہ پاسکی اور صحابہ رضہ کی تعداد کچھ بہت مزیادہ نہ تھی، پھر عام عربوں کے ایمان کو صحابہ رضہ کے ایمان سے کوئی نسبت نہ تھی، بعضوں کا حال ٹھیک تھا اور بعض تو مسلمان تھے لیکن ایماندار نہ تھے، خود قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ابھی تک تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا، اور اگر تم خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کروگے تو خدا تمھارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا، بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اور بعض تو ایسے تھے کہ زبان سے اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے لیکن دل میں پوری جاہلیت بسا رکھی تھی خدا نے ان ہی کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔	دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں جو احکام شریعت خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں ان سے واقفیت کے نا اہل۔

پس حاکم اور محکوم میں کوئی توازن نہیں تھا اور نہ خلیفہ اور اس کی زبردست عرب اکثریت رعایا میں کوئی صحیح اشتراک اور سچا اتحاد تھا، ہاں ممتاز صحابہ رضہ کا یہ طبقہ بلاشبہ خلیفہ کا معاون اور سچا مخلص تھا اور دونوں میں صحیح اشتراک اور سچا اتحاد تھا اور اسی اخلاص و اتحاد کی بدولت حضرت ابوبکر رضہ نہ صرف فتنۂ ارتداد کو فرو کرنے میں کامیاب رہے، بلکہ آپ نے عربوں کا رخ فتوحات کی طرف پھیر دیا۔

دوسری مشکل

پھر ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے، خواہ انسان کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے والے کتنا ہی پیچ وتاب کھائیں کہ یہ دین آشنا بیدار اور زندہ دل اکثر ابتلاء اور آزمائش کی آماجگاہ ہوتا ہے اور بڑے بڑے حوادث اور مصائب سے گذرتا ہے، انسان بہت کوشش کرتا ہے کہ اس کا قلب حق اور انصاف کا گھر بنا رہے لیکن فتنہ وفساد کی لپیٹ اتنی سخت اور اس قدر پیہم ہوتی ہے کہ بعض معاملات میں مجبور ہو کر شروع شروع میں تاویل کی زمین پر پاؤں ٹیک ہی دیتا ہے، پھر تاویل اور تعلیل کی مختلف منزلوں سے گذرتا گذرتا بالکل نئی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب وہ مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص دیرینہ اور اس کے درمیان ایک بڑی لمبی مسافت حائل ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے، نبیؐ نے اور خلفاءؓ وصالحین نے لوگوں کو دنیا اور فریب دنیا سے ڈرایا ہے اور ان تمام سرگرمیوں سے بچنے کی تاکید کی ہے جو ان کو فتنوں اور آزمائشوں میں مبتلا کر دیں جو ان کے سامنے ایسی برائیاں لائیں جو نیکیوں کو بہالے جائیں اور ایسے برے ارادے اور برے کام سے دوچار کریں، جو نیکیوں اور بھلائیوں کو لکڑی کی طرح جلا کر خاک کر دیں۔ ان حالات میں ذرا بھی حیرت نہ ہونی چاہیئے اگر بہت سے بزرگ حتیٰ کہ بعض صحابہؓ بھی فتنہ وفریب کی لپیٹ میں آگئے ہوں اور ان پر ایسے مصائب اور حوادث گذرے ہوں جنھوں نے ان کو اس فضا سے دور کر دیا ہو جس میں وہ دن رات نبیؐ کی صحبت میں رہتے تھے اور جن کا یہ حال تھا کہ:۔

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔	کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فریب اور فتنے کے اسباب بکثرت تھے اور ان میں اتنی قوت اور دلکشی تھی کہ اس کی تاب صرف اولوالعزم لا سکتے تھے جن کی تعداد ہر زمانہ میں بہت کم رہی ہے۔ میری طرف سے اس میں نہ رنگ آمیزی ہے نہ تکلف، نہ دل آزاری نہ کینہ پروری۔ لیکن میں

اصحابِ رسولؐ میں ایک ایسی جماعت پاتا ہوں جس نے اسلام کی راہ میں آزمائش کی وہ منزل پالی، جہاں پہنچ کر خود نبیؐ نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرما کر اس کے لیے جنت کی ضمانت دی، پھر ایک زمانہ گذرنے کے بعد ایسے حالات نے ان کا استقبال کیا جن میں قوت واقتدار کی شوکت کے ساتھ ساتھ مال ودولت کی فراوانی تھی، وہ اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکے، ان کے معاملات میں خرابی آئی، ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوگیا، بعض نے بعض کو قتل تک کر دیا۔ باہم دگر اتنے بدخواہ اور بدگمان ہوگئے جتنا کوئی انسان دوسرے سے ہوسکتا ہے، آپ اندازہ کیجیے ان کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ کیا ہو؟ ہم ان سب کے کارناموں سے اپنی رضامندی اور اتفاق کا اظہار نہیں کرسکتے کہ اس میں نہ صرف اپنی عقلوں کو معطل اور فکروں کو تاریک کرلینا ہے بلکہ دین کی عمارت کو بھی ڈھا دینا ہے جو حق وانصاف کی بنیاد پر اچھائیوں کے پھیلانے اور برائیوں کے روکنے پر قائم ہے اور نہ ہم ان میں سے ان لوگوں کو خطاکار کہہ سکتے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ انھوں نے خطا کی ہے۔ اس لیے کہ اول تو نبیؐ کے دربار میں ان کا درجہ ہے۔ دوسرے نبیؐ نے خدا کی خوشنودی اور جنت کی بشارت سے ان کو نوازا ہے، پھر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ ان کا حسنِ ظن اور اس کے وعدوں پر ان کا پختہ یقین ہم کو اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر ہماری طبیعت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ ان کے معاصرین کا مسلک اختیار کریں اور کسی کو حق پر اور کسی کو غلطی پر بتاویں اس لیے کہ ان کے معاصرین نے اپنی شرکت کی وجہ سے اپنے ماننے والوں کو حق پر سمجھا اور ان کی حمایت کی اور مخالفین کو غلط کار رجانا اور مخالفت کی لیکن ہم تو ان حوادث میں شرکاء کی حیثیت نہیں رکھتے، اور نہ ان کے مابین اختلافی امور سے ہمارا تعلق، پس یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اپنے جذبات کو ان کے معاملات میں بے لگام کردیں، ہمارے لیے صحیح راستہ تو یہی ہے کہ ہم صرف ان کی ان باتوں اور کاموں پر نظر ڈالیں جن کا تعلق عوام کی زندگی اور تاریخ کے واقعات سے ہے اور صرف اسی نقطۂ نظر سے ان کو صائب یا خطاکار تصور کریں، ان کے دین کے متعلق ہم کوئی فیصلہ نہ کریں اس لیے کہ دین اللہ کے لیے ہے، ہمارے لیے یہ ہرگز ہرگز جائز نہیں کہ ہم ان کے معاصرین کی طرح یہ کہیں کہ یہ کافر ہیں اور یہ مؤمن اور یہ بین بین، یا یہ کہ یہ جنتی ہیں اور یہ جہنمی۔ ہمیں یہ بحث نہیں کرنی چاہیے اور نہ اس پر بحث ہمارا حق ہے۔ یہ بات صرف خدا سے متعلق ہے۔ ہمیں تو ان کے اعمال، اقوال اور سیرتوں میں صرف یہ پتہ چلانا چاہیئے کہ کونسی بات حق اور انصاف سے قریب ہے اور کون نہیں اور یہ بھی بقدر ضرورت۔

آپ نے دیکھا کہ صدر اول کے اسلامی نظامِ حکومت کی دو خصوصیتوں میں سے ایک یعنی دین آشنا دل کس طرح خطاؤں اور فریبوں کی منزل بنتا ہے، اگر نبیؐ کے تمام صحابہؓ بے خطا ہوتے اور فتنہ وفساد سے

بچ جاتے تب بھی ان کی اولاد مختلف فتنوں اور مشکلات سے دوچار ہو کر رہتی۔

پس اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ مسلمان اس زمانے میں اپنے معاملات کے لیے صرف دل پر بھروسہ نہ کرتے اور یہ بھی نہ کرتے کہ بات خدا اور خلیفہ کے درمیان رہے بلکہ ایک ایسا نظام مرتب کر لیتے جو تحریری شکل میں حکومت کے مجمل اور مفصل حدود پر مشتمل ہوتا، اس میں خلفاء کے فرائض بتائے جاتے کہ وہ یہ کریں یہ نہ کریں، ان معاملات میں ان کے لیے رخصت ہے، اسی طرح اس میں عوام کے حقوق و فرائض بھی تفصیل سے لکھے جاتے، اس میں ان وسائل اور ذرائع کا بھی تذکرہ ہوتا جن کے ماتحت عوام خلیفہ کا انتخاب کرتے اور انتخاب کے بعد خلیفہ کا احتساب اور اس پر اپنی نگرانی قائم کرتے اور اگر اسے راہِ حق سے منحرف پاتے تو ماخوذ کرتے اور سزا دیتے۔ مسلمانوں کو ضرورت تھی کہ وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ایک دستور وضع کرتے جس کے صاف اور صریح حدود ان کو اختلافات اور فرقہ بندیوں سے بچاتے اور اگر وہ ایسا کر سکتے تو حضرت عثمان رضؓ کے زمانے میں جو کچھ پیش آیا اس سے اپنے آپ کو بچا لیتے۔ ذرا ایک مثال ملاحظہ فرمائیے جو عوام کے لیے سخت حیرت انگیز ہے، موافقین کے لیے خوش کُن اور مخالفین کے لیے غصہ دلانے والی، حضرت عثمان رضؓ سے ان کے بعض عطیات کے بارے میں بحث کی گئی جو انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو دیئے تھے، تو حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا عمر رضؓ خدا سے ڈر کر اپنے رشتہ داروں کو محروم رکھتے اور میں خدا سے ڈر کر صلہ رحمی کرتا ہوں اور ہم میں آج عمر رضؓ جیسا کون ہے؛ یعنی حضرت عمر رضؓ مسلمانوں کے مال سے اپنے عزیزوں کو محروم رکھ کر نیک اور مخلص تھے اور حضرت عثمان رضؓ اپنے رشتہ داروں کو مسلمانوں کا مال دے کر نیک اور مخلص ہیں اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے کہ صلہ رحمی کیا کرو۔

حضرت عثمان رضؓ کا یہ جواب فقہی تاویل کرنے والوں کے نزدیک ممکن ہے درست ہو لیکن مصلحتِ عامہ کسی طرح اس کی تائید نہیں کر سکتی۔ یہ مال یا تو عوام کا ہے اور ایسی حالت میں بغیر عوام کی اجازت کے خلیفہ اس میں تصرف کا مجاز نہیں۔ یا پھر خلیفہ کا ہے اور اس صورت میں عوام کا اس کے تصرف پر اعتراض کرنا غلط ہے لیکن یہ کہ بعض خلفاء اس مال کو عام مسلمانوں کے لیے مخصوص اور محفوظ کر کے خدا سے قربت حاصل کریں اور بعض صلہ رحمی میں اس کو خرچ کر کے خدا کی عبادت گذار بنیں، یہ صحیح نہیں کھلی ہوئی بات ہے کہ اس سلسلے میں ہم حضرت عمر رضؓ کا مسلک پسند کریں گے کیونکہ وہی حق و انصاف کے قریب اور خلفاء کی پاکبازی اور بے نفسی کے مناسب حال ہے پھر عوام کے کاموں کے احساس کا بھی یہی تقاضا ہے جیسا کہ آج بھی ہم سمجھ سکتے ہیں۔

ایک دوسری مثال جس کی روایت مؤرخین کرتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر خوش ہوؤں یا

حیران؛ حضرت عثمان رضؓ نے اپنے مخالفین کے شدید محاصرے میں ان سے کہا "اگر خدا کی کتاب میں میرے پاؤں میں بیڑی ڈالنے کا حکم تم پاتے ہو تو ڈال دو"۔ کیا یہ بات حضرت عثمان رضؓ نے اپنے مخالفین پر عتاب کرتے ہوئے خدا کا حکم تسلیم کرنے کے لیے کہی تھی، اگر ایسا ہے تو کتاب اللہ میں کہاں یہ حکم ہے ، جو مسلمانوں کو اجازت دیتا ہو کہ اپنے امام کے دونوں پاؤں میں بیڑی ڈال دیں، یا آپ نے بطور چیلنج فرمایا، اس لیے کہ آپ جانتے تھے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں اور اس میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو غلطی کرنے یا راہ سے ہٹنے پر خلیفہ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینے کا حکم مسلمانوں کو دیتی ہو اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عثمان رضؓ سمجھتے تھے کہ ان کے مخالفین کتاب اللہ سے کوئی دلیل نہیں لا سکتے اور یہ کہ انھوں نے جو کچھ کیا اسے کرنے کا وہ حق رکھتے تھے اور اپنے اس عمل میں نہ وہ مجرم ہیں نہ غلطی کی لپیٹ میں۔

اگر مسلمانوں کے پاس یہ لکھا ہوا نظام اور دستور ہوتا تو حضرت عثمان رضؓ کے زمانے میں وہ بلا اختلاف و بلا تفریق باخبر ہوتے کہ انھیں دستور کے ماتحت کیا کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں کے لیے اس قسم کے نظام کی ضرورت پر غالبًا ایک روشن مثال کی طرح وہ روایت پیش کی جا سکتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے حضرت علی رضؓ سے کہا کہ میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کتاب و سنت اور شیخین کی سیرت کی پابندی کریں گے اور خلاف ورزی نہ ہونے دیں گے تو حضرت علی رضؓ نے اس شرط کو منظور نہیں فرمایا اور کہا:

اللّٰھم لا و لکن اجتھد فی ذلك رائی ما استطعت	ایسا نہیں ہو سکتا میں اپنے خیال سے بھی جو کچھ کر سکوں گا کروں گا۔

حضرت علی رضؓ بتانا چاہتے تھے کہ وہ ایک ایسی بات کی پابندی نہیں کر سکتے جس کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی، اس لیے کہ قرآن اگرچہ لکھا ہوا ہے اور سینوں میں محفوظ ہے لیکن وہ حکومت کی سیاسیات اور اس کے روزمرہ کے واقعات سے تفصیلی بحث نہیں کرتا اور نبیؐ کی سنت بہرحال شائع ہے لیکن اس میں بعض حدیثیں ایسی ہیں جو غیر حاضر کو تو حفظ ہیں لیکن حاضر اس سے بے خبر ہیں، پھر بہت سی حدیثیں فتنۂ ارتداد اور فتوحات کی لڑائیوں میں شہید صحابہ رضؓ کے ساتھ دنیا سے چلی گئیں، اب رہی شیخین رضؓ کی سیرت، تو وہ بھی سنت نبوی کی طرح سب کی سب معلوم اور محفوظ نہیں اور پھر حضرت علی رضؓ کو پورا پورا حق تھا کہ وقت اور حالات کے بدلنے پر شیخین رضؓ کی سیرت سے اختلاف میں عوام کا مفاد اور مسلمانوں کی خیر خواہی نظر آئے تو وہ ضرور اختلاف کریں۔ جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے یہی شرطیں حضرت عثمان رضؓ کے

سامنے پیش کیں تو انھوں نے اللّٰھم نعم کہہ کر منظور کر لیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ کتاب وسنت اور سیرت شیخین نافذ کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس کی کوشش کرتے تو ان کے لیے کتاب وسنت اور سیرتِ شیخین کی شدید پابندی ضروری تھی، بلاشبہ حضرت علی رضؓ کا جواب ٹھیک تھا۔ اور حضرت عثمان رضؓ کی منزل بھی حق سے کچھ دور نہ تھی، لیکن آپ نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضؓ کے ابتدائی دورِ خلافت میں کیا ہوا۔ حضرت عثمان رضؓ نے مسلمانوں کے مال کے بارے میں وہ مسلک اختیار کیا جو حضرت عمر رضؓ اور ان کی سیرت کے ٹھیک خلاف تھا، اب جن لوگوں نے اس خیال سے بیعت کی تھی کہ حضرت عثمان رضؓ سیرتِ شیخین رضؓ کی پابندی کریں گے، انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضؓ نے اپنے عہد کی پوری پابندی نہیں کی لیکن خود حضرت عثمان رضؓ سمجھتے تھے کہ انھوں نے سیرتِ عمر رضؓ کی ذرا بھی خلاف ورزی نہیں کی اور کسی حالت میں بھی اپنے عہد کو نہیں توڑا، ان کی نظر میں حضرت عمر رضؓ کی سیرت کا جوہر خدا سے قرب حاصل کرنا تھا جو صلہ رحمی کے ذریعے انھوں نے حاصل کیا، پس انھوں نے وہی کیا جو حضرت عمر رضؓ اور حضرت ابوبکر رضؓ کرتے تھے، اللہ سے قرب حاصل کرنے کے ذرائع میں اختلاف کی ذمہ داری تو حضرت عثمان رضؓ پر نہیں ڈالی جا سکتی، اب اگر اس وقت مسلمانوں کے پاس کوئی لکھا ہوا نظام ہوتا جس میں حدود اور نکات نمایاں اور واضح ہوتے، تو حضرت علی رضؓ اس نظام پر بیعت سے ہرگز انکار نہ کرتے اور نہ حضرت عثمان رضؓ کو اس کی ضرورت پیش آتی، کہ تاویل سے کام لیں اور نہ عوام دو جماعتوں میں منقسم ہوتے۔

لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ حضرت عمر رضؓ کی شہادت ہجرت کے ۲۳ سال بعد ہوئی یعنی حکومت کے قیام اور ہجرت پر پورے ۲۵ سال بھی نہیں گذرے تھے، پھر یہ مختصر مدت بھی اس طرح نہیں گذری کہ زندگی مطمئن اور معاملات درست ہو گئے ہوں، دلوں کو سکون اور دماغوں کو راحت مل گئی ہو، اس میں دس سال تو عربوں کو اسلام کی دعوت دینے میں صرف ہوئے، ایک سال سے کچھ زیادہ دن فتنۂ ارتداد کے فرو کرنے میں لگے، بقیہ دن دنیا کے گوشوں میں اسلام پہنچانے کے لیے عربوں کو آمادہ کرنے میں صرف ہوئے اس کے بعد ایران میں انقلاب آیا، مصر و شام سے رومی رخصت ہوئے، فوج کی ترتیب و تنظیم عمل میں آئی، بڑے بڑے شہر بسائے گئے، امن و جنگ کے سلسلے میں ابتدائی قواعد بنے، پھر ان محکموں کی داغ بیل پڑی جن کا تعلق بلادِ عربیہ کے داخلی معاملات اور بیرونی ممالک کے خارجی امور سے تھا، پس یہ انصاف نہ ہوگا کہ صدرِ اول کے مسلمانوں پر کوئی معترض ہو کہ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی کی، اور جو کچھ وہ کر سکتے تھے نہ کر سکے۔

پھر اگر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھی جائے کہ حکومت کے معاملات میں تنظیم کے جو اقدامات شیخین رضؓ

فرماتے تھے وہ اس بدوی ماحول اور عربی سماج کے لیے جو سیاست، تمدن اور تنظیم سے یکسر نا آشنا تھے، ایک ایجاد و اختراع کا مرتبہ رکھتے تھے اور نہ صرف ایجاد و اختراع کی پیش کش، بلکہ انھوں نے اس قوم کو منظم کر دیا جو کسی تنظیم کی عادی نہ تھی۔ اس کو مہذب اور متمدن بنا دیا جس میں پہلے سے تہذیب و تمدن کے آثار نہ تھے تب تو سچائی اور حق سے بڑی دوری ہوگی کہ یہ کہہ دیا جائے کہ شیخین رضؓ نے مسلمانوں کے لیے جیسی تنظیم چاہیئے تھی نہیں کی۔ حضرت عمر رضؓ خدا ان پر اپنی رحمت برسائے اس سلسلے میں اپنی انتہائی امکانی کوشش صرف فرمایا کرتے تھے، چنانچہ جیسے ہی کسی متمدن قوم کے کسی طریق کار کا پتہ چلتا اس کو معلوم کرنے اور نہایت گہری چھان بین کر کے اس میں سے وہ جز جو عربی مزاج، اسلامی فکر اور اس نو خیز حکومت کے مناسب حال ہوتا، نکال لیتے۔

تیسری مشکل

اس سیاسی نظام کی دوسری خصوصیت یعنی صحابہ رضؓ کے ممتاز افراد کا طبقہ تو وہ بھی طبعی طور پر ایک مدت گذر جانے کے بعد بہر حال زوال کی زد میں آتا اور ایک ایسی جدید نسل پیدا ہوتی جس کو اس اقیانہ سے کوئی نسبت نہ ہوتی پس ضروری تھا کہ اس آنے والی نسل کے سامنے ایک مقررہ مرتبہ نظام ہوتا، جو اس کو بتاتا کہ خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہوا، [illegible] حاب کے بعد اس پر کس طرح احتساب قائم کیا جاتے اور اگر وہ خطا کا مرتکب ہو تو کس طرح سزا دی جائے، یہ نظام اگر وضع کر دیا جاتا تو حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح منتشر نہ ہوتا جس طرح تاریخ بتاتی ہے، مسلمانوں میں خوارج کی وہ جماعت نہ ہوتی جو سنت نبیؐ اور شیخین رضؓ کی اندھی اتباع پر مصر تھی، نہ وہ جماعت ہوتی جو بضد تھی کہ امامت اہل بیت نبیؐ کا حق ہے۔ نہ وہ جماعت ہوتی جو خلافت کو قیصریت اور کسرویت کا جامہ پہنانا چاہتی تھی، اور نہ وہ جماعت ہوتی جو چاہتی تھی کہ مسلمانوں کے معاملات شوریٰ کے ذریعے طے ہوں لیکن اس کا کوئی نظام یا خاکہ اس کے پاس موجود نہ تھا۔

لیکن جو کچھ ہم نے پہلی خصوصیت کے سلسلے میں عرض کیا تھا وہی اس خصوصیت سے متعلق بھی دہرانا چاہتے ہیں کہ شیخین رحؒ اور ان کے ساتھیوں کو تہذیب و ترقی کے مسلسل مشاغل نے وہ سکون اور فرصت نہیں دی۔ جو ان کو اس قسم کا نظام مرتب کرنے کا موقع دیتی۔ یہ کام ان لوگوں کا تھا جو بعد میں

آئے اور فرصت و فراغت کے علاوہ کافی مال و دولت کا انبار اپنے ساتھ لائے، لیکن انھوں نے نہ حکومتوں کے بدلنے کے لیے کوئی نظام بنایا اور نہ ایسا کوئی دستور مرتب کیا جس میں سیاسی اور سماجی انصاف کی رعایت پیش نظر ہو، انھوں نے انتہائی غفلت برتی اور صرف اس بات کو اچھا سمجھا کہ وہ خود کس طرح حاکم غالب اور اونچے بنے رہیں۔

مگر ان لوگوں پر بھی کیا ملامت کی جائے، اگر ہم غور کریں کہ دنیا کو دستور سازی کا علم کب سے ہوا تو معلوم ہوگا کہ یہ ابھی پچھلے دنوں کی پیداوار ہے۔ یہ کوئی بہت قدیم چیز نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ قدیم یونانی شہروں میں لکھے ہوئے سیاسی دستور تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روم کا ایک مقررہ سیاسی نظام تھا لیکن اسی طرح میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مشرق و مغرب دونوں جگہ "شاہی" نے اپنے نظاموں اور دستوروں کو معطل کر دیا۔ عوام سے اس کو اس قدر دور رکھا کہ انسانیت اس کو تقریباً بھلا چکی اور آج یہ نئی دنیا اسی فراموش کردہ حقیقت کا تدریجی طور پر انکشاف کر رہی ہے۔

نگرانی کا جدید اقدام

علاوہ ازیں ایک اور بات قابلِ غور ہے جس کی طرف میں نے سلسلۂ کلام میں اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ ہر سال موسمِ حج کے موقع پر اسلامی قلمرو کے مختلف گورنروں اور ان کے باشندوں سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ گورنروں سے رعایا کے بارے میں اور رعایا سے گورنروں کے متعلق ان کے افکار و خیالات سنتے تھے اور تفصیلی باتیں کرتے تھے۔ یہ طریقہ آپ نے مقرر کر لیا تھا۔ اور بجز اپنی خلافت کے پہلے سال کے زندگی بھر اس پر عمل کرتے رہے، اگر حضرت عمرؓ کی زندگی کے اسباب کچھ بڑھ جاتے تو بہت ممکن تھا کہ گورنروں اور رعایا کا یہ اجتماع آپ کی فراست، بصیرت، اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے پیش نظر ایک مستقل نظام کی شکل میں تبدیل ہو جاتا، جو اگر وہ پارلیمنٹری نظام نہ ہوتا جو قدما جانتے تھے اور جسے عصرِ جدید نے تلاش کیا ہے تو اس کے قریب تر ضرور ہو جاتا۔ حضرت عمرؓ اس موسمی اجتماع پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ جس قدر مزید چھان بین بھی آپ سے ممکن تھی، کرتے تھے۔ مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار میں تو خود ہی تحقیق و تلاش کر لیتے، اور دور دراز کے مقامات کے لیے اپنے عمّال اور اپنے سیکرٹری وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے۔ علاوہ ازیں وہ رپورٹیں بھی آپ کے

پیش نظر ہوتیں، جو لوگوں کے معاملات سے متعلق کبھی گورنروں کے ذریعے اور کبھی رعایا کے ذریعے آپ تک پہنچتی رہتیں ۔ اس پر بھی زندگی کے آخری دنوں میں آپ سوچ رہے تھے کہ تمام صوبوں کا احتسابی معائنہ کرنے کے لیے ایک دورہ کریں۔ چنانچہ گفتگو میں اظہار فرماتے تھے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ہر شہر میں دو ماہ رہ کر دیکھوں گا کہ گورنر کس طرح کام کرتے ہیں اور ان کے کاموں سے رعایا کی رضامندی کا کیا حال ہے لیکن موت نے موقع نہ دیا اور آپ کے قبر میں اترتے ہی مسلمانوں کی سیاست دوسرے رُخ پر چل پڑی ۔

اقتدار کے خلاف حضرت عمر رض کی جنگ

شاید اس بحث کا حق ادا نہ ہوگا، اگر ہم حضرت عمر رض کے اس طرزِ عمل پر روشنی نہ ڈالیں، جو ممتاز صحابہ رض کے ساتھ آپ نے ضروری قرار دیا تھا، اس سے پہلے ہم نے بتایا ہے کہ حضرت عمر رض نے ان کو مدینہ چھوڑ کر کہیں جانے کی اجازت نہیں دی، تاکہ نہ ان پر کوئی مصیبت آئے اور نہ ان کی وجہ سے کوئی مصیبت آئے ۔ حضرت عمر رض کی یہ سیاست نہایت کامیاب سیاست تھی، اور کیوں نہ ہم آج کی زبان میں حقیقت کا اظہار کریں اور چیزوں کی تعبیر ان کے اصلی ناموں سے کریں اور کہیں کہ حضرت عمر رض نے ان لوگوں کو مدینہ منورہ میں اس لیے روک رکھا کہ کہیں ان کے اثرات عوام میں نہ بڑھ جائیں۔ عوام میں ان کے اثر و رسوخ کا بڑھنا خود ان کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے کسی طرح مفید نہ تھا۔ چنانچہ جب تک حضرت عمر رض نے ان کو مدینہ میں روکے رکھا اور ان کی نقل و حرکت کا دائرہ محدود رہا مسلمانوں کے معاملات اور خود اس ممتاز طبقے کے حالات ٹھیک رہے لیکن جب حضرت عثمان رض کا زمانہ آیا اور ان کے لیے نقل و حرکت کا راستہ صاف ہوا تو فتنہ و فساد نے پوری فضا گرد آلود کر دی، اس لیے نہیں کہ صحابہ رض کے اس طبقے نے قصداً کوئی خرابی پیدا کی بلکہ اس لیے کہ ایک طرف تو ان کے پاس دولت کی فراوانی ہوئی جس نے حامیوں کی زبردست جماعت پیدا کر دی اور دوسری طرف عوام فرطِ عقیدت سے ان کی طرف جھک پڑے ۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کے پاس حامیوں اور ساتھیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ حضرت عمر رض نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ مسلمانوں کے مال میں سے بطور صلہ یا اپنی عنایت یا دلجوئی کی بنا پر لوگوں کو عطیات دیں، ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ عام مسلمانوں اور صحابہ رض دونوں کے لیے یکساں طور پر ایک مقررہ رقم عطیہ کرتے تھے اور کاروبار کی اجازت دیتے تھے

جس طرح خدا نے دی ہے، لیکن جب حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے صحابہ رضؓ کو نہ صرف مختلف مقامات پر سفر کرنے اور قیام کی اجازت دیدی بلکہ ان کو بیت المال سے گرانقدر صلات و انعامات بھی دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دن حضرت زبیر رضؓ کو چھ لاکھ اور حضرت طلحہ رضؓ کو دو لاکھ کا عطیہ دیا، کسی جماعت کو بھی اگر اس طرح دولت ملنے لگے اور پھر اس کے لیے موقع ہو کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں زمینیں خریدے، شہروں میں مکانات بنوائے، حجاز میں بڑے بڑے محل تعمیر کرے ہر جگہ اپنے خادموں، حامیوں اور ہواخواہوں کی تعداد بڑھائے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس پر فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اب ان دروازوں میں داخل ہونے سے رُکے رہنا دشوار اور دشوار تر ہوگا، ہاں رکنے والے رُکے، چنانچہ سعد بن ابی وقاصؓ نے کنارہ کشی اختیار کرلی، جن دنوں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی تھی وہ گوشہ نشین رہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رُکے رہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کے انتخاب پر ان کو ندامت رہی اور یہ کہ وہ بقیۃ ایام دارالہجرۃ ہی میں اپنے تجارتی کاروبار میں مصروف رہے اور اپنی بچت کا کافی حصہ اسی طرح خیرات کرتے رہے، جس طرح رسول اللہؐ اور شیخین رضؓ کے عہد میں کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضؓ رُکے رہے، چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ نے کوئی تجارت کی یا کہیں کوئی زمین خریدی یا مکان لیا، آپ مدینہ میں اسی جگہ مقیم رہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو رکھا تھا۔ ہاں ینبع میں آپ کی کچھ جائداد تھی جہاں کبھی کبھی آپ جایا کرتے تھے لیکن حضرت علی رضؓ سے متعلق ایک اور بات ہے جو کہی جاتی ہے۔

ان تمام باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس ممتاز طبقے کو اور عام مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچایا جو اثر و اقتدار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ان سبھوں کو ان کے دین پر قائم رکھا اور خود ان کے اور فتنہ و فساد کے درمیان دیوار بنے رہے اور خاصانِ رسولؐ میں سے ایک مجلس مرتب کی جسے آپ کی مجلس شوریٰ کہا جا سکتا ہے اور اگر کچھ دنوں آپؓ اور زندہ رہتے تو انھیں مجبور کرتے کہ وہ اپنے اسی درجے پر قناعت کریں اور خلفاء کے لیے مشیروں کی طرح ارباب حل و عقد بنے تفصیلی احکام میں مداخلت سے بلند و بالا رہیں۔

نظامِ شوریٰ

ایک دوسری بات یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو محسوس ہوگیا کہ وہ دنیا سے سفر کرنے والے ہیں، تو انھوں نے رسولؐ کی اتباع میں کسی شخص کو خلیفہ نہیں بنایا اور صدیق اکبرؓ کی اتباع میں مسلمانوں کو بلا مشورہ اور نصیحت بھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ آپ نے اصحابِ شوریٰ کو پسند کیا، جن کا نبیؐ کے دربار میں مقررہ درجہ ہے۔ جن کو مہاجرین اور قریش کی سرداری حاصل تھی۔ جن کو عام مسلمانوں کی رضامندی اور اعتماد حاصل تھا، پھر عام مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ ان میں سے جن کو چاہیں اپنے لیے خلیفہ پسند کرلیں۔

آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے جو نظامِ شوریٰ وضع کیا وہ کافی نہ تھا اور نہ اس پر قناعت کی جاسکتی ہے لیکن توجہ اور اہمیت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے خلفاء کے انتخاب اور اختیار میں شوریٰ کو اصل قرار دیا اور یہ کوئی معمولی اقدام نہ تھا۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ یہ کام حضرت عمرؓ اس وقت کررہے تھے جب آپ کا جسم قاتل کے خنجر سے زخمی تھا، آپ دنیا چھوڑ کر سفرِ آخرت کی تیاری کررہے تھے، اس وقت آپ پر وہ سب کچھ گذر رہا تھا جو موت سے قریب مجروح انسان پر گذرتا ہے، پھر آپ کا دل خدا کے خوف اور اپنے چھوٹے بڑے اعمال کی حساب دہی کی ہیبت سے بیدار اور باخبر تھا۔ اس وقت آپ فکر میں تھے کہ اپنا کچھ انتظام کریں اور گھر والوں کا بھی بندوبست ہو، گھر والوں کا بندوبست یہ کہ ان کو ان ذمہ داریوں سے دور رکھیں جو خود اپنے سر لے رکھی تھیں اور اپنا انتظام یہ کہ خدا سے اس حالت میں ملیں کہ مسلمانوں کے مال میں سے ایک پائی کی ذمہ داری بھی ان کے سر نہ ہو اور ان سب افکار سے بڑھ کر آپ کو اپنی قبر کا خیال تھا، آپ کی آرزو تھی کہ اپنے دونوں ساتھیوں کے پہلو میں دفن ہوں اور اس کے لیے حضرت عائشہؓ کی اجازت ضروری تھی، چنانچہ بے تابی تھی کہ مرنے سے پہلے حضرت عائشہؓ کی اجازت حاصل ہوجائے اور مطمئن ہوجائیں کہ عبداللہ (ابن عمرؓ) وفات کے بعد حضرت عائشہ کے گھر میں دفن کرسکیں گے، ان تمام افکار کی موجودگی میں حضرت عمرؓ نے شوریٰ کا ایک نظام سوچا اور اس میں اپنے بس بھر احتیاط اور دور اندیشی ملحوظ رکھی۔

حضرت عمرؓ کی وفات اور ایک خلیفہ کے منتخب ہوجانے کے بعد مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اس نظامِ شوریٰ پر غور کرتے اور ایک مستحکم بنیاد پر اس کا قیام اس طرح عمل میں لاتے کہ مسلمانوں میں نہ تو

تفریق ہوتی اور نہ ان کا خلیفہ تیزی کے ساتھ حوادث اور آویزش کا شکار رہتا، لیکن حیرت کی بات ہے کہ مسلمانوں نے یہ کچھ نہ کیا اور حضرت عثمان رضؓ نے خلیفہ ہوتے ہی عطیات میں اضافہ کر دیا، جو پابندیاں حضرت عمر رضؓ نے صحابہ پر لگا رکھی تھیں انھیں اٹھا دیا اور اجازت دے دی کہ جس کا جہاں جی چاہے جا کر آباد ہو۔ اور اس کا بھی موقع دے دیا کہ لوگ اپنی دولت اور گروہ بڑھائیں۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ میں نے عرض کیا ناظرین اسے ایک طویل داستان کہیں گے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بہت مختصر ہے بہر حال طویل ہو یا مختصر، وہ حضرت عثمان رضؓ اور ان کے عہد کے فتنوں پر گفتگو کی تمہید ہے اور اس میں کھلی ہوئی شہادت اس بات کی ہے کہ جو حوادث پیش آئے اور وہ جن نتائج تک پہنچے وہ ان اشخاص اور افراد کے بس سے باہر تھے جنھوں نے دور و نزدیک سے اس میں کم و بیش حصہ لیا اور اس لیے انھیں ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ملامت کی جا سکتی ہے البتہ ماحول اور حالات پر، اگر عقل اجازت دے تو الزام لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت عثمانؓ خلافت سے پہلے

حضرت عثمان رضؓ کی زندگی کے ابتدائی حالات بعض دوسرے صحابہ رضؓ کی طرح عہد جاہلیت کی تاریکی میں ہیں اور تاریخ کی گرفت سے باہر۔ اسلام نے نہ صرف ان حضرات کی زندگیوں کو، دلوں کو اور ان کی عقلوں کو ایک نئی مخلوق بنا دیا تھا بلکہ اس نے ان کی تاریخ کو بھی از سر نو جنم دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کی اسلام سے پہلے کی زندگی اس طرح ختم کی ہے جیسے وہ اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ واقعۂ فیل کے سات سال بعد پیدا ہوئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت طائف میں ہوئی، شاید آپ کی ابتدائی تاریخ سے متعلق یہ غیر مستند روایات ہیں، ان اختلافات کے صحیح ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شہادت کے وقت آپ کی عمر کے بارے میں لوگ متفق نہ تھے، کوئی ۷۵ بتاتا تھا، کوئی ۸۸ اور ۹۰ کہتا تھا، کسی کے خیال میں اس وقت آپ کی عمر ۸۲، ۸۳، ۸۶ برس کی تھی، اگر آپ کی پیدائش کی ٹھیک تاریخ لوگوں کو معلوم ہوتی تو اتنا اختلاف ہرگز نہ ہوتا اور یہ موقع تو ہرگز نہ ملتا کہ کوئی صاحب آپ کو ۶۳ ہی برس کا بتا دیتے، محض اس خیال سے کہ اس طرح حضرت عثمان رضؓ کا شمار بھی ۶۳ سال کی عمر میں خدا کی رحمت کو پہنچنے والوں میں ہو جائے اور ان کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور با اختلاف خفیف حضرت عمرؓ کا ہم عمر بنا دیا جائے۔

حضرت عثمان رضؓ کی دورِ جاہلیت کی زندگی میں سے راویوں کے پاس صرف آپ کا نسب نامہ ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ آپ ابن عفان بن ابی العاص ابن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف ابن قصی ہیں، یعنی آپ کا نسب باپ کی طرف سے عبد مناف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے لیکن ماں کی طرف سے یہ تعلق اور بھی قریب ہو جاتا ہے، اس لیے کہ آپ کی والدہ اروی بنت کریز ہیں جن کی والدہ عبد المطلب کی بیٹی بیضا ام حکیم ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی کی لڑکی ہیں۔

ان ہی رشتوں کی بنا پر اموی، حضرت علی رضؓ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف تھے، اور حضرت علیؓ کو مطعون کرتے تھے کہ اپنے طرزِ عمل سے انھوں نے اپنے چچا اور چچی کے لڑکے کو ذلیل کیا۔ حضرت عثمانؓ کا حضرت علی رضؓ کی چچی کا لڑکا ہونا تو آپ کو معلوم ہو چکا، اب رہا چچا کا لڑکا ہونا تو وہ اس طرح کہ حضرت عثمان رضؓ عبد المطلب کے لڑکوں کے ساتھ عبد مناف سے مل جاتے ہیں جو ہاشمیوں کے جدِ امجد ہاشم اور امویوں کے جدِ اعلیٰ عبد شمس کے باپ ہیں۔ یہ عفان اور ان کے باپ اور بنو امیہ کا خاندان بلکہ عبد شمس کا سارا کنبہ اور قریش کی اکثریت تجارت پیشہ تھی، ان سب کا تجارتی تعلق شام سے تھا، عفان ایک تجارتی سفر کے دوران میں انتقال کر گئے اور اپنے لڑکے کے لیے بہت کچھ مال و دولت ترکے میں چھوڑ گئے۔ حضرت عثمان رضؓ باپ اور قبیلے کے نقشِ قدم پر چل کر کامیاب کاروباری ہوئے۔ اور کافی دولت پیدا کی۔

ایک دن جب وہ شام کے سفر سے واپس آ چکے تھے اس نئی تحریک کا کچھ حال سنا، جس کی طرف اللہ کے رسولؐ نے دعوت دینا شروع کر دی تھی، گھر والوں سے آپ نے اس سلسلے میں جو کچھ سُنا، اصحابِ سیر اور محدثین اس کو ایک طویل روایت میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ آپ کی خالہ سعدی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ سے کچھ باتیں کیں اور آپ کو رغبت بھی دلائی، یہ کاہنہ تھیں اور غیب کی باتیں بتاتی تھیں، بعض کہتے ہیں کہ شام کے سفر سے جب آپ طلحہ بن عبید اللہ رضؓ کے ساتھ واپس آ رہے تھے تو راستے ہی میں آپ اللہ کے رسولؐ سے باخبر کر دیئے گئے تھے۔ آپ خواب اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھے کہ ایک منادی کی آواز سُنی جو کہہ رہا تھا کہ مکہ میں احمدؐ کا ظہور ہوا پھر جب آپ مکہ پہنچے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپ کے دل پر اس کا خاص اثر ہوا اور جس بات پر تمام راویوں کا اتفاق ہے وہ یہ کہ حضرت عثمان رضؓ

حضرت ابوبکر رضؓ سے ملے، دونوں کی باہم گفتگو ہوئی، صدیق اکبر رضؓ نے اسلام کی دعوت پیش کی، حضرت عثمانؓ کچھ مائل سے ہوگئے اور حضرت ابوبکر رضؓ کے ساتھ نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اللہ کے رسولؐ نے نصیحت فرمائی اور اسلام پیش کیا۔ حضرت عثمان رضؓ نے قبول کرلیا اور اس مجلس سے مسلمان ہوکر اٹھے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت طلحہ رضؓ بھی اسی مجلس میں مشرف باسلام ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں حضرات زبیر بن العوام رضؓ کے بعد اسلام لائے، بہرحال حضرت عثمان رضؓ اسلام کے سابقین میں ہیں، ان چودہ صحابہؓ میں سے ایک ہیں جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت کی اور آپ کا اسلام دارالارقم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام سے قبل کا اسلام ہے۔

پھر نبیؐ کی صاحبزادی رقیہؓ سے آپ کا عقد ہوا، اور آپ دربارِ نبوتؐ میں زیادہ سے زیادہ مقرب ہوئے۔ اس کے بعد آپ پر بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح آزمائش اور ابتلاء کا دور آیا، کہتے ہیں کہ آپکے چچا حکم بن العاص کو جب آپ کے اسلام لانے کا علم ہوا تو انھوں نے آپ پر بڑی سختی کی، حد یہ کہ آپکو رسی سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک عثمانؓ اپنے باپ دادا کے دین پر نہیں آجائے گا میں اسے نہیں کھولوں گا، لیکن حضرت عثمان رضؓ کا استقلال اور اسلام پر ان کی ثابت قدمی دیکھ کر معاملہ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جب آپ کی والدہ کو آپ کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع ہوئی، تو سخت ناراض ہوئیں اور اپنی انتہائی بیزاری اور ناگواری کا اظہار کیا، لیکن جب ان ناگواریوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو وہ بھی باز آگئیں۔ اس کے بعد جب آنحضرتؐ نے صحابہ رضؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرجانے کی اجازت دی تو حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہؓ سمیت ہجرت کرگئے، پھر واپس آئے لیکن دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کی، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ منورہ کو دارالسلام بنایا تو حضرت عثمانؓ مدینہ ہجرت کرگئے، پھر جب اللہ کے رسولؐ اپنے صحابہ رضؓ کے ساتھ غزوۂ بدر کے لیے نکلے تو حضرت عثمان رضؓ اپنی زوجہ رقیہؓ کی وجہ سے آپؐ کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور ان کی تیمارداری میں مصروف رہے جب اللہ نے بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کو فتح دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں حضرت عثمان رضؓ کا حصہ لگایا اور ان کو شریک ہونے والوں میں شمار کیا، بعدازاں رقیہؓ کا انتقال ہوگیا جس کا حضرت عثمان رضؓ کو انتہائی ملال رہا، اس لیے کہ اس کے بعد مادی کا رشتہ ٹوٹ گیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رقیہؓ کی بہن ام کلثومؓ سے آپ کا نکاح کردیا۔ ہرچند کہ وہ بھی زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں اور انتقال کرگئیں۔

سیرت نگار ... روایتوں میں بتاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ہمارے پاس کوئی ... لڑکی ہوتی تو ہم عثمان رضؓ سے اس کا عقد کردیتے۔ حضرت رقیہؓ سے حضرت عثمانؓ کے نسل ایک لڑکا

پیدا ہوا تھا لیکن وہ ابھی اپنی عمر کی ساتویں منزل تک ہی پہنچا تھا کہ اللہ کی رحمت نے اسے دنیا سے اٹھا لیا۔ اگر آپ کے صاحبزادے عبداللہ زندہ رہتے تو ان کی اور ان کے باپ کی بات ہی اور ہوتی؛ پھر تو ان کا معاملہ حضرت فاطمہ رض کے دونوں لڑکوں حسن رض اور حسین رض کے معاملے سے کچھ الگ نہ ہوتا۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

حضرت عثمان رض اُحد کی لڑائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ضرور تھے لیکن وہ اس اقلیت کا ساتھ نہ دے سکے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخر وقت تک جمی رہی، بلکہ اس اکثریت کے ساتھ جو میدان چھوڑ کر چلی آئی تھی واپس آگئے، لیکن اللہ نے اس اکثریت کو معاف کر دیا اور کہا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ۔	جو لوگ تم میں سے (اُحد کے دن) جبکہ مومنوں اور کافروں کی دو جماعتیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں، جنگ سے بھاگ گئے تو ان کے بعض افعال کے سبب شیطان نے ان کو پھسلا دیا مگر خدا نے ان کا قصور معاف کر دیا بیشک خدا بخشنے والا بردبار ہے۔

اس کے بعد والے تمام غزوات میں حضرت عثمان رض اسی طرح شریک رہے جیسے بڑے بڑے صحابہ رض لیکن حضرت عثمان رض کا یہ امتیاز ہے کہ وہ فیاض اور دریا دل تھے، اللہ کی راہ میں انھوں نے اپنی دولت جس طرح خرچ کی اس کی مثال دوسرے دولت مند مسلمانوں میں نہیں۔ جو کچھ انھوں نے کیا اس وقت کے بڑے بڑے متمول مسلمان نہ کر سکے، انھوں نے ہزاروں کے خرچ سے بیر رومہ خریدا اور اس کا استعمال مسلمانوں کے لیے عام کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں ان کو اس سے بہتر عطیہ دینے کا وعدہ کیا، پھر جب تبوک کی لڑائی پیش آئی اور فقر و فاقہ کا زمانہ تھا، خدا کے رسول م نے اللہ کی راہ میں امداد کی اپیل کی تو حضرت عثمان رض نے فوج کی تیاری کا خرچ اپنے ذمہ لیا۔ چنانچہ روایات ہی میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ حضرت عثمان رض ایک ہزار دینار کی تھیلی اپنے ساتھ لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں رکھ دی، جس کو آپ نے فوج کی تیاری پر صرف کیا اور حضرت عثمان رض کے لیے دعا کی کہ ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہوں اور ان سے جنت کا وعدہ فرمایا۔

حضرت عثمان رض انسانوں کے لیے نہایت نیک اور مسلمانوں کے لیے انتہائی ہمدرد تھے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے غیر معمولی غمخوار تھے، وہ بیحد سخی، منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھے۔ محدثین اور

سیرت نگاروں کی روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضہ کی جس فضیلت کو امتیازی درجہ دیا ہے وہ سچی شرم اور سنجیدگی ہے۔ اللہ کے رسولؐ فرمایا کرتے تھے کہ عثمان رضہ سے تو ملائکہ شرم کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے بلا تکلف ملا کرتے تھے لیکن جب آپ کو معلوم ہو جاتا کہ عثمانؓ آ رہے ہیں تو پھر اہتمام فرماتے تھے اور ارشاد کرتے کہ ہم ایک ایسے شخص سے کیوں نہ شرم کریں جس سے خود ملائکہ شرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اہتمام کا سبب بھی بیان فرماتے تھے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو حضرت عثمان رضہ تھوڑی دیر بھی وہاں نہ ٹھہر سکیں گے اور پھر نہ اپنی ضرورت پیش کر سکیں گے اور نہ کوئی گفتگو۔ حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضہ کو قریش کے پاس سفیر بنا کر اسی خیال کے پیش نظر بھیجا کہ بنی امیہ اور قریش کی نگاہوں میں آپ محترم اور معزز تھے۔ علاوہ ازیں آپ میں نرمی، وسعت ظرف اور حسن اخلاق تھا جس کی ضرورت تھی، لیکن جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ قریش نے حضرت عثمان رضہ کے ساتھ دغا کی تو آپؐ نے جہاد و نصرت کے لیے بیعت لی۔ قرآن مجید میں آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا	جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے
یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ	بیعت کرتے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں
اَیْدِیْھِمْ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ	پر ہے، پھر جو عہد کو توڑے تو عہد کو توڑنے
عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا	کا نقصان اسی کو ہے اور جو اس بات کو جس کا
عَاھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ	اس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو
اَجْرًا عَظِیْمًا۔	وہ اس کو عنقریب اجر عظیم دے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ سے حضرت عثمان رضہ کی طرف سے بھی بیعت کی۔ اصحاب سیر اور محدثین نے بھی بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں جن میں صحیح بھی ہیں اور ان کی صحت محتاج بیان نہیں اور بعض موضوع بھی ہیں اور ان کا موضوع ہونا بالکل ظاہر ہے۔ ہاں بعض حدیثیں ایسی ہیں جن میں کم و بیش شک کی گنجائش ہے لیکن یہ تمام حدیثیں متفقہ بتاتی ہیں کہ حضرت عثمان رضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بڑے چہیتے تھے اور آپؐ کے مقربین میں خاص درجہ رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بار بار جنت کی بشارت دی ہے اور بار بار آپ کو بتایا کہ خدا آپ سے خوش ہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، خدا کی ان پر رحمت ہو، فرماتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں مسلمان حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضہ کو مقدم جانتے تھے۔ ان کے علاوہ صحابہؓ میں سے کسی کو امتیازی درجہ نہیں دیتے

تھے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ خود عہد نبویؐ میں یہ تینوں صحابیؓ بقیہ صحابہؓ کے مقتدٰی تھے۔ بہرحال سلف نے ان افراد کے لیے عشرہ کا عرف مقرر کیا، جن کے جنّتی ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضامن ہیں اور وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ حضرت سعیدؓ بن زید بن نفیل ہیں۔

پس حضرت عثمانؓ ان میں سے ایک تھے، اور یہ تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ آپ اسلام کے سابقین اولین میں سے ہیں، دو مرتبہ آپ کو رسولؐ کی دامادی کا شرف ملا۔ اور خدا کی راہ میں جان و مال کی ہر آزمائش میں آپ ثابت قدم رہے۔

وفاتِ نبویؐ کے بعد جب صدیق اکبرؓ کے لیے بیعت لی جارہی تھی، حضرت عثمانؓ فوراً بڑھے اور اخلاص و محبت کی باتیں دیر تک کہتے رہے، پھر وہ تحریر جس میں حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کیلئے حضرت عمرؓ کو منتخب کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ ہی نے لکھی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے املا کرایا، اور حضرت عثمانؓ نے لکھا، کہا جاتا ہے کہ املا کرانے کے درمیان حضرت ابوبکرؓ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور حضرت عثمانؓ ابھی اسی قدر لکھ سکے تھے "میری خواہش ہے کہ میں تمھارا خلیفہ..... تو حضرت عثمانؓ نے اس کے بعد کے الفاظ "عمرؓ کو بناؤں" اپنی طرف سے لکھ دیا، پھر جب افاقہ ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے املا کی ہوئی تحریر کو پڑھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے پوری عبارت عمرؓ تک پڑھ دی، صدیق اکبرؓ نے بلند آواز سے حضرت عمرؓ کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر کی دعا کی، اور حضرت عثمانؓ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تمھیں اس کا خطرہ پیدا ہوا کہ شاید میں ہوش میں نہ آسکوں، اس لیے جو کچھ میرے دل میں تھا وہ تم نے پہلے ہی لکھ دیا اور تمھیں اس کا حق بھی ہے۔ پھر جب حضرت عمرؓ کے لیے بیعت شروع ہوئی تو سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا اور خلیفۃ المسلمین کے ساتھ مشورے، اخلاص اور خیرخواہی کی باتیں کیں، اسکے بعد جب فاروق اعظمؓ خنجر سے زخمی ہوئے اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر لوگوں نے آپ سے خواہش کی کہ آپ اپنی طرف سے کسی کو نامزد فرمادیں تو آپ نے اس سے انکار کیا، لیکن مسلمانوں کو بلا مشورہ رکھنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ اس کے لیے ایک مجلسِ شورٰی کی تجویز پیش کی اور یہ مجلس ان چھ افراد میں محدود رکھی جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش تھے اور دنیا سے رحلت فرمانے تک خوش تھے، آپ نے اس مجلس میں اپنے چچا کے لڑکے سعید بن زید بن نفیلؓ کو نہیں رکھا حالانکہ وہ ان

دس صحابہؓ میں سے ایک ہیں جن کے لیے جنت کی ضمانت خود اللہ کے رسولؐ ہیں، لیکن حضرت عمر رضہ نے یہ مناسب نہیں جانا کہ خلافت خاندانِ عدی میں دو مرتبہ آئے، حضرت عمر رضہ تو ان کو مجلس میں حاضری کی بھی اجازت نہیں دی، مبادا مجلسِ شوریٰ کے کسی رُکن پر سعیدؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا اثر پڑے، یا عمر رضہ کا رشتہ کسی کو متاثر کردے، ہاں اپنے صاحبزادے عبداللہ رضہ کو مجلس میں حاضری کی اجازت دی، لیکن شرکتِ اجلاس کے سوا انھیں کسی بات کا حق نہ تھا۔ اس لیے کہ اول تو آپ کو یہ گوارا نہ تھا کہ خطاب کی اولاد میں سے دو خلیفہ ہوں، دوسرے یہ کہ آپ اپنے لڑکے کو بارِ خلافت کیلئے کمزور پاتے تھے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر حضرت ابوبکرؓ کچھ دنوں اور زندہ رہتے اور حضرت عمر رضہ کی طرح آپ کو یہ موقع ملتا کہ فتوحات کا سلسلہ جاری رہے، حکومت میں ترقی ہے، حکومت کے معاملات اور اس کی مصلحتوں میں الجھاؤ بڑھتا جارہا ہے اور مسلمان روزانہ نئے نئے حالات اور نئے نئے انقلابات سے دوچار ہو رہے ہیں، خطرناک اور اہم مسائل اور مشکلات کا ایک سلسلہ جاری ہے جو کہیں سیاست، کہیں انتظام، اور کہیں دین کے حقائق کی حفاظت کی شکل میں سامنے آرہا ہے۔ بلاشبہ اگر حضرت ابوبکر رضہ زندہ ہوتے اور جو کچھ حضرت عمر رضہ کی آنکھوں نے دیکھا اس کو دیکھتے تو آپ کا نقطۂ نظر اور طرزِ عمل وہی ہوتا جو حضرت عمر رضہ کا تھا، آپ بھی فاروق اعظم رضہ کی طرح کسی کو نامزد کرنے اور نہ کرنے میں تردد فرماتے اور آپ بھی کم و بیش اسی کے مشابہ کوئی نظم تجویز کرتے جو حضرت عمر رضہ نے پیش کیا۔ آپ تو دنیا سے اس وقت گئے جب مسلمان تقریباً عہدِ نبویؐ کی سی حالت میں تھے، آپ نے ارتداد کا شکار ہو جانے والے عربوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کرکے بیرونی ممالک میں بھیج دیا، فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا لیکن بات ابھی بہت آگے نہیں بڑھی تھی مگر فاروق اعظم رضہ کے دور میں مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں ایک جدید ماحول پا رہے تھے فتوحات کی طرف رُخ کیا تو بڑھتے ہی چلے گئے، اتنے بڑھے کہ مصر، شام اور جزیرے سے رومیوں کو نکال باہر کیا ایران کی سرزمین میں پہنچے تو فارسی اقتدار کی بنیاد ڈھادی۔ اور ان ممالک کے اکثر و بیشتر حصوں پر قابض ہو گئے، پھر فتوحات کی مصلحت نے مزید پیش قدمی پر مجبور کیا اور مسلمانوں نے بحر ابیض کے مشرقی ساحل سے رومیوں کو نکال دیا تاکہ ان کے اور اپنے درمیان ایک اطمینان بخش حدِ فاصل بنالیں، بلکہ قسطنطنیہ تک پہنچ کر روم کے بادشاہ کا خاتمہ کردیں جس طرح فارس میں کیا اور پھر ایران کی فتوحات کی تکمیل کرکے اپنی حکومت کی حدود مشرق میں اس آخری حد تک پھیلادیں جہاں تک فوج کے پہنچنے کا امکان ہو۔ اس مقصد کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کی ایک مستقل حربی سیاست ہو جس میں تنظیم کے ساتھ

ایسی صلاحیت ہو کہ وہ دنیا میں پھیلے اور فتوحات کا سلسلہ زمین کے گوشوں تک پہنچا دے۔ اس قسم کی مسلسل اور پیہم فتح کے لیے اس کے مستقل اسباب کی فراہمی ضروری تھی، یعنی ایسی فوج جو صرف مقررہ مقاصد کے لیے پیش قدمی کرے۔ پھر اس فوج کی ترتیب اسی بدوی مزاج عناصر سے ہوئی تھی جو بعد کے باقاعدہ اور منظم جنگ کے طریقوں سے ناآشنا تھے، کسی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی اور وہ بھی ایک ایسی سرزمین پر جس کا انھیں کچھ پتہ نہ تھا نہ تجربہ۔ وہ تو غارت گری سے واقف تھے اور لوٹ مار کرنا خوب جانتے تھے۔

اسلامی فتوحات کی تاریخ ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے اور ہم عربوں کی قوت ان کی تیزی اور ان کے عزم پر دنگ ہو جاتے ہیں، پھر بحث وتمحیص، تجزیہ وتحلیل کے ذریعے دلوں میں سکون پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام فتوحات اور انقلابات کو اس وعدہ کا ایفا خیال کرتے ہیں، جو مسلمانوں سے خدا نے قرآن مجید میں کیا ہے، اس ایمان کی طرف منسوب کرتے ہیں جس سے مسلمانوں کے دل معمور تھے اور جس نے مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کو اس طرح آمادہ کر دیا تھا، کہ ان کے دل خدا پر اعتماد سے لبریز تھے اور کلی اطمینان تھا کہ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور انھیں ہر محاذ پر فتح ونصرت نصیب ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سب باتیں بالکل سچ اور حق ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمان فتوحات کے میدان میں وہ قوی ایمان لے کر نکلے جو راہ کی دشواریوں اور مشکلات پر غالب آگیا، لیکن ہر بات کے کچھ اسباب اور وسائل ہوتے ہیں اور یہ اسباب ووسائل بنتے ہیں کوششوں سے، بہت سی تدبیروں اور تخمینوں سے، نیز غور وفکر پر عملی اقدامات سے جن سے یہ منتشر اور متفرق دل پہلے تو ایک ہوسکیں۔ پھر اپنے ملک سے دور باہر کے معرکوں میں کود پڑیں، اور ایک دوسری منظم قوت سے ٹکرا جائیں پس حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت عمر رضہ نے جو منظم اور جرار لشکر تیار کیا اور جس کو دنیائے قدیم کے حصوں میں بھی بھیجا، یہ کوئی معمولی مشکل اور آسان بات نہ تھی کہ اس لشکر کو معرکوں اور فتوحات کے بعد اس کے پڑاؤ پر مسلسل برسوں روکا جا سکے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ پرانی لڑائیوں اور حملوں میں عربوں کی عادت کیا رہی ہے وہ تو لڑتے ہی اس لیے تھے کہ غالب آجائیں اور مال غنیمت لے کر فوراً اپنے گھروں کو واپس ہوں تاکہ اس لوٹی ہوئی دولت سے کچھ دن امن چین سے گذاریں، لیکن ایسی لڑائی جس کے آغاز کا پتہ ہو لیکن یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کب ختم ہوگی اور کہاں ختم ہوگی؛ پھر یہ کہ وہ عہد جاہلیت کی لڑائیوں بلکہ غزوات نبوی کی طرح کی بھی نہ ہو، نہ ارتداد کے زمانہ کی لڑائیوں سے میل کھاتی ہو۔ ایسی لڑائی بلاشبہ جدوجہد کا وہ کارنامہ ہے جس کا

تصور کرنا بھی دشوار ہے۔ حضرت عمرؓ ان کے رفقاء اور سپہ سالاروں نے شکوک اور تذبذب سے بلند ہو کر دانشمندی کے ساتھ اقدام کیے اور انھیں کامیابی کی توفیق ملی۔ آپ اندازہ کیجیے، بڑے بڑے شہر آباد کرنا، ان میں فوجیں ٹھہرانا، پھر باری باری سے فوجیوں کی واپسی کی تنظیم برقرار رکھنا، مزید براں یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ فوجیں ان ہی بدوی عربوں سے مرتب کی گئی تھیں جو نہ تہذیب سے مانوس تھے، نہ تمدن کے خوگر، ان باتوں کا صحیح اندازہ لگانے پر آپ ان اہم جنگی مشکلات کا احساس کر سکیں گے جن سے اپنا دامن بچا کر حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھی آگے نکل گئے۔

اسی طرح ہم اسلامی تاریخ میں دفاتر کے قیام کی کارروائی پڑھتے ہیں تو تعجب اور خوشی کی لہروں میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اس مقام پر رک جائیں اور اس حقیقت کا پتہ چلائیں کہ یہ چھوٹا سا لفظ "دیوان" یعنی دفتر جس دقتِ نظر کے ساتھ میدانِ جنگ کے مجاہدوں، اور فداکاروں سے متعلق اعداد و شمار بتاتا ہے، ان کے قبیلوں کی، ان کے مقاماتِ سکونت کی تفصیل کرتا ہے اسی اہمیت اور باریکی کے ساتھ ان کے خاندان اور قبیلے کے ان لوگوں کے اعداد و شمار اور تفصیلات بھی پیش کرتا ہے جو ان کی معاشی کفالت میں تھے یا ان کی طرف سے حکومت ان کی ذمہ دار تھی، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ عربوں کی بدوی زندگی میں حساب کتاب اور اعداد و شمار ایک ایسی اہم جدّت ہے کہ جس کی مثال ان کی پہلی زندگی میں نہیں ملتی۔ اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے کہ ہم سرسری طور پر اس سے گذر جائیں جب ہم اس لشکر کو میدانِ جنگ میں دیکھتے ہیں یا روم و فارس کی بڑی بڑی لڑائیوں کے بعد اس کو شہروں میں مقیم پاتے ہیں اور اس دلکش نظام پر غور کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے اپنے مشاورین کی رائے اور مشورے سے تیار کیا تھا جس کی رُو سے کوئی فوجی چھ ماہ سے زیادہ اپنے اہل وعیال سے دور لڑائی پر نہیں رہ سکتا تھا۔ تو ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ اور اس کے معاونین کو جنگی سیاسی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے کتنی زبردست معنوی اور مادی کوششوں کی ضرورت ہے۔

اور پھر یہ سیاسی مشکلات ہی تنہا خلیفہ اور اس کے مشاورین کی مشغولیت کا باعث نہ تھیں، انتظامی معاملات کی پیچیدگیاں بھی ان کے لیے کچھ کم اور معمولی نہ تھیں۔ اس لیے کہ یہ ممالک جو مسلمانوں نے فتح کیے پہلے ہی سے اپنا ایک تمدن اور تہذیب رکھتے تھے، ان کا اپنا ایک مانوس نظم و آئین تھا، جُدا جُدا ممالک تھے، اس لیے ان کے نظام بھی ایک دوسرے سے الگ تھے، ان تمام ممالک میں آئین کا اجراء ضروری تھا، جس طرح فتح ہونے سے پہلے وہ زیر نظام تھے، اسلامی فتح تخریب و تباہی کی نہیں، تعمیر و ترقی کی فتح تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ عرب یک بیک پختہ کار منتظم اور مشاق سیاست دان بن جائیں، اور اتنے

توی بھی کہ مفتوحین کی شرارتوں سے خود کو محفوظ رکھ سکیں، اپنی جان، مال اور اسباب کی طرف سے بالکل مطمئن ہو کر مفتوحین کی جان و مال اور مصالح کی بھی حفاظت کر سکیں اور ان سے اس قدر وصول بھی کر سکیں کہ ایک طرف قیام امن پر قادر رہوں اور دوسری طرف جنگ بھی جاری رکھیں اور فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے رہیں ان حالات کے پیش نظر ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ ان دفاتر اور انتظامات کو باقی رکھتے جو فتح کے وقت ان کو ملے تھے اور ان کی نہایت شدت کے ساتھ مسلسل نگرانی کرتے، ایسی نگرانی کرتے، ایسی نگرانی جو ان کو مخالفانہ حملے کا شکار ہو جانے یا مبتلائے فریب ہو جانے سے بچاتی اور ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی معمولی نہیں۔

پھر عربی ممالک کے بجائے خود چند در چند مشکلات کا گہوارہ تھے، خلیفہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک ایسی قوم پر حکومت کے لیے جو اتباع و اطاعت کی عادی نہ تھی، نہایت حکیمانہ مسلک اختیار کرے۔ قوم کے نوجوانوں اور طاقت رکھنے والے افراد کو زیر کر کے ان کو دور دراز مقامات پر بھیج دے، جہاں سے وہ واپس آئیں اور شاید نہ بھی آسکیں۔ ہم عام فوجی تیاری اور بھرتی کے حالات سرسری طور پر پڑھتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں لیکن ہماری نظر اس تیاری اور بھرتی کی گہرائیوں اور اس کی مشکلات تک نہیں پہنچتی ہم اس کا بھی اندازہ نہیں لگاتے کہ جدید قوموں کے پاس اس سلسلے میں مقررہ اور مُرتبہ دستور العمل ہیں جو کسی فوری تقاضے کی پیداوار نہیں بلکہ پوری قابلیت اور کمال مہارت سے بنائے گئے ہیں، دقیق تجربہ اور طویل مشق پر اس کی بنیاد ہے، پھر کہاں وہ بدوئی قوم جس کا بڑی بڑی لڑائیوں میں نہ کوئی مقررہ طریقہ، نہ جس کا باقاعدہ فوجی بھرتی اور تیاری سے کبھی کا واسطہ، یہ تو اس کا پہلا اقدام ہے جس کے پیچھے نہ کوئی تجربہ ہے نہ سابقہ آزمائش۔

یہ ان مشکلات کے چند پہلو ہیں جو حضرت عمرؓ کو پیش آئے اور اگر صدیق اکبرؓ کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو ان کو بھی پیش آتے اور حضرت عمرؓ کے بعد آنے والے خلفاء تو لازمی طور پر ان مشکلات سے دوچار ہونے ہی والے تھے، پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے اگر حضرت عمرؓ اپنی خلافت کی وجہ سے سخت پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوں؟ اور اس میں تعجب کا کیا مقام ہے اگر وہ معاملات میں سخت، اپنے ارادوں میں اٹل، اور عظیم الشان تیاریوں میں منہمک ہوں، نہ خود آرام کریں اور نہ دوسروں کو آرام کرنے دیں، اور کیوں یہ اَن ہونی سمجھی جائے، اگر حضرت عمرؓ اپنے ساتھیوں اور ہم عصروں میں ایسی شخصیت کی تلاش رکھتے ہوں جو ان مشکلات بلکہ اس سے بھی زیادہ الجھی ہوئی مشکل کا مقابلہ کر سکے اور وہ اپنی تلاش میں کامیاب نہ ہو سکے ہوں۔؟

ان سیاسی، جنگی اور انتظامی مشکلات پر ایک اور مشکل مذہبی ورثہ کی ہے، جس کی حمایت خلیفہ کا فرض ہے اور جس کے قیام میں وہی راہ اختیار کرنی ضروری ہے جو نبیؐ نے خدا کے حکم سے اختیار کی تھی۔ اگر معاملہ صرف فتوحات کا، انتظام اور سیاست کا ہوتا تو ان قوموں کی طرح جو کمزور سے قوی، وحشی سے متمدن اور غلام سے حاکم بن گئیں، عرب بھی اپنا کام چلا لیتے، لیکن اسلام نے فتح کی جو حدیں مقرر کی ہیں اس میں مرکزی نقطہ مفتوحین کے ساتھ وہ کامل انصاف ہے جو ان کو فاتحین کی صف میں بٹھا دے اور فاتح اور مفتوح کا درجہ ایک کردے، پس وہ فتح جس کی تصویر ہمارے سامنے اسلام نے اور اس کے رسولؐ نے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے پیش کی ہے، وہ تسلط اور خراج وصول کرنے کی نہیں بلکہ اصلاح اور ہدایت کی فتح ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ کے لیے سیاسی، جنگی اور انتظامی مہارت کے علاوہ ایک اور زبردست مہارت کی ضرورت ہے جو بہت زیادہ محنت اور مشقت کی طالب ہے جس کے ذریعہ دین کی حمایت اور حفاظت کی جا سکے، اور دین کو فاتحین کا آلۂ کار یا مفتوحین کی چالبازیوں کا شکار نہ ہونے دیا جائے نیز جس کی موجودگی میں ان افراد کی نگرانی ہو سکے جن کے ذمے دین کا قیام ہے، جن کو دین کے معاملے میں کسی ملامت کی پروا کبھی نہیں کرنی چاہیئے، مبادا ان سے کوئی قصور اور بے اعتنائی ہو رہی ہو۔

پھر ان تمام مشکلات پر بالا مشکل وہ عربی سیادت تھی جو عربوں میں ممتاز صحابہؓ اور فاتح سپہ سالاروں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس سیادت کا، دین کا اور عوام کے مصالح کا جوڑ ملا دیں۔ یہ سیادت تین قوتوں سے مرکب تھی، دین سے متعلقہ افراد کی قوت، دنیا سے وابستہ حضرات کی قوت، دین و دنیا کے جامع اصحاب کی قوت، پس وہ صحابیؓ جس نے اسلام کی طرف سبقت کی، دونوں ہجرتوں میں شریک رہا، تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور اس کے بعد مدینہ میں مقیم ہو گیا، وہ دین سے متعلق گروپ کا ایک فرد ہے، وہ قریشی یا عربی جو بعد میں اسلام لایا، لیکن فتوحات کے دور میں مشکلات اور مصائب برداشت کرتا رہا اور فاتحین میں ممتاز رہا۔ وہ دنیا سے وابستہ گروپ کا ایک فرد ہے، اور وہ صحابیؓ جس نے اسلام کی طرف سبقت کی، اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہجرت کی، غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا، پھر فتوحات میں بھی ممتاز درجے پر رہا، وہ دین و دنیا کے جامع گروپ کا فرد ہے۔ اب اگر خلیفہ چاہے کہ کسی کو جانشین مقرر کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان مختلف مصلحتوں کا لحاظ رکھے اور ان پیچیدہ مشکلات میں سے ایک ایسا حل نکالے جو دین، دنیا اور عوام سب کی مصلحتوں کے لیے قابلِ قبول ہو، ایسی حالت میں اگر حضرت عمرؓ

نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا. یا بنانے میں متردد ہے تو اس میں تعجب نہیں کرنا چاہیئے، البتہ تعجب اس وقت ہوتا جب کسی کو نامزد کر دیتے. پھر بھی حضرت عمر رض نے کوشش کی اور اپنے نازک اور خطرناک دنوں میں چا ہا لیکن موت نے مہلت نہیں دی کہ جلیل القدر صحابہ رض اور اربابِ فکر و نظر سے مزید مشورہ اور تبادلۂ خیالات کر لیتے۔

نظامِ شوریٰ پر تنقید

اس میں شک نہیں کہ شوریٰ کے لیے جو نظام ترتیب دیا گیا تھا اس میں خامی تھی اور بڑی خامی تھی سب سے پہلی بات جو ہم کو متوجہ کرتی ہے وہ مجلسِ شوریٰ کے دائرے کی تنگی ہے۔ چنانچہ یہ صرف سات افراد پر مشتمل ہے اور ان میں بھی ایک فرد ایسا ہے جو شرکتِ مشورہ کے علاوہ کسی بات کا حق دار نہیں. یعنی عبداللہ ابن عمر رض. پوری مجلس میں وہی ایک ایسے مشیر تھے جن کے لیے غرض کا خانہ خالی تھا، ابھی یہ اربابِ مشورہ جمع ہی ہوئے تھے کہ انھیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ایسی خطرناک پیچیدگی کی زد میں ہیں جو ان کی مجلس کا رُخ غلط راہ کی طرف پھیر دے گی۔ چند مشیر اور سب کے سب خلافت کے عہدہ کے امیدوار، اب اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس بات کے لیے آمادہ کریں جس پر آمادگی طبیعتوں کی عادت نہیں، اور یہ بھی اقتدار اور جاہ پسندی کی خاطر نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیال سے، پس ان میں ہر امیدوار اخلاصانہ طور پر خیال کرتا ہے کہ وہ ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی طاقت، اور حق و انصاف کا لحاظ رکھنے کی اہلیت زیادہ سے زیادہ رکھتا ہے، مجلسِ شوریٰ کے نگرانِ کار حضرت طلحہ رض کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ خود مشیروں میں یک جہتی نہیں اور مخالفانہ مقابلے کی صورت در پیش ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

لقد کنت من ان تدافعوها	مجھے بڑا خوف تھا کہ مقابلے کے بجائے
ا۔ خوف منی من ان تنافسوها	کہیں مخالفت کی نہ ٹھن جائے۔

ابو طلحہ رض پر خدا کی رحمت ہو، اپنی طبیعت کی سادگی اور دل کی پاکیزگی سے حضرت عمر رض کی طرح ایسا خیال کرتے تھے کہ خلافت ایک بارِ گراں ہے جس کے حصول کی طمع نہ کرنی چاہیئے بلکہ اپنا دین اور دنیا سنبھالنے کی خاطر اس سے دور ہی رہنا مناسب ہے لیکن شوریٰ والے اس خیال کے نہ تھے، ان کا

نقطۂ نظر یہ تھا کہ خلافت ایک خدمت ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے مقابلے کی سرگرمی ضروری ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی گرانبار ہو، اس لیے کہ اس کے ذریعہ ایک طرف خدا تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اگر حُسنِ ظن شریک حال ہو، دوسری طرف اس کے ذریعے انسانوں کی ہمدردی کی جاسکتی ہے، اگر سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مقابلہ کرنے والوں کے ساتھ حُسنِ ظن رکھیں اور ان سے متعلق اظہار رائے میں صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

ارکانِ شوریٰ میں سب سے پہلا فرد جس کو اصل مشکل اور اس کے حل کرنے کا تیزی کے ساتھ احساس پیدا ہوا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض تھے، انھوں نے اپنے رفقاء کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم میں سے کوئی ایک امیدواری سے دست بردار ہوجائے اور انتخاب کا معاملہ ہم اسی کے حوالے کردیں، اس تجویز پر سب خاموش ہوگئے یا یوں کہیئے کہ ان میں سے چار آدمی خاموش رہے۔ حضرت علی رض، حضرت عثمان رض، حضرت سعد رض اور حضرت زبیر رض۔ حضرت طلحہ رض نہ خاموش تھے نہ گویا، یعنی وہ اس مجلس میں شریک نہ تھے، حضرت عبدالرحمٰن رض نے جب دیکھا کہ سب خاموش ہیں اور کسی ایک کو بھی دست برداری گوارا نہیں تو اس کے لیے وہ خود تیار ہوگئے اور چاہا کہ باقی پانچ افراد میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کا خیر خواہ تجویز کردیں، لیکن خود امیدواروں کے خدشات کے پیش نظر یہ بات آسان نہ تھی کہ وہ حضرت عبدالرحمٰن رض کی مختاری پر رضامند ہوجاتے۔ حضرت علی رض کو خطرہ تھا کہ کہیں دامادی کے خیال سے عبدالرحمٰن رض، حضرت عثمان رض کی طرف نہ جھک جائیں، حضرت علی رض کے علاوہ امیدواروں کو ڈر تھا کہ عبدالرحمٰن رض سے سعد رض کی رشتہ داری کہیں ان کی راہ میں حائل نہ ہو۔ چنانچہ باہم قول وقرار ہوا اور طے پایا کہ عبدالرحمٰن رض اپنی کسی رشتہ داری اور ذاتی خواہش سے متاثر نہ ہوں گے اور جس کو وہ منتخب کردیں قوم اسے تسلیم کرلے گی۔

اگر حضرت عمر رض نے اس مجلس میں توسیع کردی ہوتی اور عبداللہ بن عمر رض جیسے افراد کی تعداد بڑھا دیتے جو مجلسِ شوریٰ میں حاضر ہوتے اور مسائل ومعاملات میں بحث وگفتگو کے سوا کسی اور بات کا حق نہ رکھتے تو غالباً مجلسِ شوریٰ شکوک واختلاف سے بچی رہتی اور میں تو خیال کرتا ہوں، بہتر ہوتا کہ مجلسِ شوریٰ سے متعلق عمر رض کا تصور امیدواروں کی ایک مجلس کا نہ ہوتا کہ جو بھی منتخب ہوجائے وہ خلیفہ ہو بلکہ مشاورین کی ایک ایسی جماعت کا ہوتا جس کے سامنے یہ چھ نام پیش کیے جاتے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کرکے اس کو خلیفہ بنادیتی، حضرت عمر رض متوجہ نہ ہوسکے اور نہ بعد میں مسلمانوں کو اس بلت کا خیال آیا کہ انصار شوریٰ میں شریک کیے جانے کے مستحق ہیں، خلافت کے امیدواروں کی پسندیدگی اور انتخاب میں رائے دینے کا انھیں بھی حق ہے، ہم جانتے ہیں کہ جب تک مسلمان متفق ہیں امامت

قریش کے لیے ہے لیکن اس اصول کا یہ مطلب ہم نہیں جانتے کہ امام کے انتخاب کا حق صرف قریش کو ہے امام قریشیوں کا نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا امام ہوتا ہے۔ پس تمام مسلمان اس کے انتخاب کے مالک ہیں۔ ہاں ان پر یہ پابندی ضرور ہے کہ جو امام بھی وہ پسند کریں وہ قریشی ہو۔ اس عہد کے اور بعد کے مسلمان یقین رکھتے تھے کہ امام کا انتخاب ارباب حل وعقد کا حق ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت عمر رضہ کے زمانے میں اربابِ حل وعقد کا دائرہ صرف قریش تک محدود نہ تھا، حضرت صدیق اکبر رضہ نے انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

نحن الامراء وانتم الوزراء۔ ہم امیر ہیں اور تم وزیر۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابوبکر رضہ نے انصار کو ارباب حل وعقد میں شمار کیا ہے، جہاں تک ہمیں معلوم ہے وزیر ہی توڑ جوڑ کیا کرتے ہیں پس لازم تھا مجلس شوریٰ میں انصار شریک ہوں اور خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیں، مزید برآں مجلس شوریٰ میں قریش اور انصار کے علاوہ عرب سرداروں، میدانِ جہاد کے سپہ سالاروں اور اسلامی حکومت کے عمال اور حاکموں کی شرکت بھی ضروری تھی، اس شکل میں اگر مجلسِ شوریٰ ترتیب پاتی، تو مسلمان بہت سے مصائب اور مشکلات سے محفوظ رہتے۔

شوریٰ کی اس طرح پر تنظیم میں ایک دوسری پیچیدگی جو ہمیں نظر آرہی ہے وہ یہ کہ مشیروں کے اختیار کو موقت اور ہنگامی بنا دیا گیا۔ حضرت عمر رضہ نے تین دن کی مدت مقرر کی اور مسلمانوں نے اس تجدید کو منظور کر لیا، اب اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے ہی میں سے ایک کو منتخب کرتے اور اس کو خلیفہ بناتے۔ جو لوگ حاضر تھے وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ پھر دوسرے شہروں میں اس کی بیعت کے لیے خطوط لکھے جاتے، یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہیے کہ خود خلیفہ اپنی بیعت کے لیے باہر کے لوگوں کو لکھتا، اور مدینہ کے حاضرین کی بیعت سے حاصل ہونے والی خلافت کے نام سے باہر کے لوگوں پر حکومت کرتا مطلب یہ ہے کہ اس نظامِ شوریٰ کے ماتحت تنہا مدینہ کے لوگوں کو یہ درجہ حاصل تھا کہ اگر وہ بیعت کرلیں تو دنیا کے تمام حصوں میں اس کی اتباع ضروری ہو جائے اس لیے کہ مدینہ مہاجر اور انصار صحابہ رضہ کا مستقر تھا۔ تمام اربابِ حل وعقد وہیں رہتے تھے اور اس لیے بھی کہ خلیفہ کے انتخاب میں تاخیر سے مختلف قسم کے اضطراب و ہیجان کا امکان تھا، تاہم یہ بات اپنی جگہ شک سے خالی نہیں کہ صحابہ رضہ میں سے بعض اصحابِ فکر ونظر اس وقت حضرت عمر رضہ کے حکم یا اجازت سے مختلف شہروں یا محاذ جنگ پر تھے اور وہ اس کے اہل تھے کہ ان سے مشورہ لیا جاتا۔

لیکن تین دن کی مختصر مدت درحقیقت اصل خطرے کا دروازہ نہیں یہ تو مصلحت کا ایک تقاضا

بھی ہوسکتا ہے اور حضرت عمر رضہ نے یقیناً اس مصلحت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا، خطرے کی بات تو اس میں تھی کہ یہ مجلس وقتی اور ہنگامی تھی، خلیفہ کا انتخاب ہوا اور یہ ٹوٹ گئی۔ اگر اس مجلس کو کچھ اور وسعت دی جاتی اور پھر اسے ایک مستقل نظام کی حیثیت سے باقی بھی رکھا جاتا جو ایک طرف خلیفہ کے کاموں کی نگرانی کرتی، اور دوسری طرف ضرورت کے مواقع پر خلفاء کے انتخاب کی کارروائی عمل میں لاتی تو یقیناً مسلمان پارلیمنٹری نظام کی طرف پہل کرنے والوں میں ہوتے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ ناظرین نے حضرت عمر رضہ کی سیرت میں اس بات کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ وہ کس طرح اس نظام کے لیے تیزی اور سرگرمی کے ساتھ کوشاں تھے لیکن میں پھر اس بات کو دُہراؤں گا کہ موت نے جلدی کی اور حضرت عمر رضہ کو اس نظام پر غائر نگاہ ڈالنے سے پہلے ہی دنیا سے اٹھا لیا، اگر آپ کی زندگی ہوتی تو امکان تھا کہ آپ اس کام کے لیے فرصت پاتے اور جو خاکہ ہم نے کھینچا ہے۔ اس کے مشابہ کسی نظام کی تکمیل فرما دیتے۔ پھر نہ کوئی کشمکش درمیان میں ہوتی اور نہ باہمی آویزش کے وہ واقعات پیش آتے جو حضرت عثمان رضہ کا مقابلہ کرنے والوں کے درمیان واقع ہوئے جس کا مرکزی نقطہ درحقیقت یہ سوال ہے کہ اگر مسلمان خلیفہ کی پالیسی کو غلط تصور کرتے ہوں تو کیا ان کو اجازت ہے کہ وہ اس کو معزول کر دیں، یا یوں کہیے کہ رعایا اگر تنگ آ چکی ہو تو خود خلیفہ کا یہ فرض ہے کہ نہیں، کہ وہ خلافت سے دست بردار ہو جائے۔

حضرت عثمانؓ کا خلیفہ ہونا

بہرحال اہل مشورہ نے معاملہ عبدالرحمٰن رضہ کے سپرد کر دیا اور خود اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے۔ حضرت صہیبؓ، فاروقِ اعظم رضہ کی تعمیلِ ارشاد میں نماز پڑھاتے، ابوطلحہ رضہ اور ان کے ساتھی عبدالرحمٰن رضہ کے دروازے پر جمے رہے کہ تین دن گزاریں اور وہ مسلمانوں کے لیے ایک امام پسند کریں، کہا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن رضہ نے اپنے اندازے اور استخارے پر قناعت نہیں کی، انھوں نے اوروں سے بھی مشورہ لیا، کچھ لوگوں کے پاس خود گئے، بعضوں کو اپنے ہاں بلایا، مردوں کے علاوہ ممتاز خواتین کو بھی شریک مشورہ کیا، امہات المومنین رضہ اس سلسلے میں پیش پیش رہیں، پھر جب تین دن کی یہ مقررہ مدت ختم ہونے کے قریب تھی تو آپؓ نے حضرت علی رضہ اور حضرت عثمان رضہ دونوں کو بلوایا اور ہر ایک سے تنہائی میں گفتگو کی۔ چنانچہ حضرت علی رضہ سے تخلیہ میں کہا اگر میں آپ کو خلیفہ منتخب نہ کر سکوں تو آپ کس کے حق میں اپنی رائے

دیں گے، حضرت علی رضہ نے جواب دیا حضرت عثمان رضہ کے حق میں، پھر یہی سوال آپ نے حضرت عثمان رضہ سے تنہائی میں کیا، انھوں نے جواب میں حضرت علی رضہ کا نام لیا، ہر چندکہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہے اس لیے کہ ایسا کوئی شاہد نہیں ہے جو بتائے کہ عبدالرحمٰن رضہ کی ان دونوں حضرات کے ساتھ کیا گفتگو ہوئی، بہر حال عبدالرحمٰن رضہ بن عوف نے ان سے تنہائی میں گفتگو کی اور اس کے بعد مسجد میں اجتماع کا اعلانِ عام ہوگیا۔ حاضرین سے مسجد بھر گئی، عبدالرحمٰن رضہ منبر نبوی پر چڑھ کر اس جگہ بیٹھے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضہ نے اپنی نشست ایک زینہ نیچے کرلی تھی۔ حضرت عمر رضہ صدیق اکبر رضہ کی نشست سے بھی ایک زینہ نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضہ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ یہ سلسلہ تو بہت طویل ہوجائے گا اور پھر نبوی نشست پر ہی بیٹھ گئے۔

بہر حال منبر نبوی پر چڑھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے، سر پر وہ عمامہ تھا جو کسی سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھ دیا تھا۔ منبر پر کھڑے ہوئے اور دیر تک کھڑے رہے۔ پھر دعا کی جس کی آواز لوگوں تک نہ پہنچی، اس کے بعد حضرت علی رضہ کو اپنے پاس بلایا، اپنا ہاتھ بڑھا کر حضرت علی رضہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیا آپ اللہ کی کتاب، رسول کی سنت اور شیخین رضہ کی اتباع پر میری بیعت لیں گے؟ حضرت علی رضہ نے جواب دیا نہیں، میں اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق کوشش کروں گا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضہ کو بلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کیا آپ اللہ کی کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شیخین رضہ کی اتباع پر میری بیعت لیں گے؟ حضرت عثمان رضہ نے جواب دیا ہاں، عبدالرحمٰن رضہ نے کہا خدایا تو گواہ ہے، خدایا تو گواہ ہے، خدایا تو گواہ ہے، اس کے بعد لوگ بڑھے اور حضرت عثمان رضہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت علی رضہ نے بھی بلا پس وپیش بیعت کی، کہا جاتا ہے کہ ان کو تردد تھا اور جب عبدالرحمٰن رضہ بن عوف نے ان سے کہا کہ "علی رضہ! مواخذہ اپنے سر نہ لو، قرآنی ارشاد ہے جس نے عہد توڑ دیا، ذمہ داری اس کے سر ہے اور جس نے اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کیا خدا اسے اجر عظیم دے گا" تب حضرت علی رضہ آئے اور بیعت کی، لیکن میرا یقین ہے کہ حضرت علی رضہ کو تردد نہ تھا اور وہ ہرگز اس کے محتاج نہ تھے کہ کوئی انھیں عہد وفا کی یاد دلاتا، آپ کی پوری زندگی ہم کو بتاتی ہے کہ آپ کی ذات اس قسم کی یاد دہانی یا تنبیہ سے بالاتر تھی۔

مؤرخین کی صحیح روایت کی بنا پر اس دن کا سورج غروب نہیں ہوا تھا اور وہ ذی الحجہ ۲۳ھ کا آخری دن تھا، اور حضرت عثمان رضہ ۲۴ھ کی پہلی صبح کا مسلمانوں کے خلیفہ بن کر استقبال کر رہے تھے

خلافت کے بعد سب سے پہلی آزمائش

خلافت کے پہلے ہی دن سب سے پہلا مسئلہ جو حضرت عثمان رضؓ کے سامنے پیش ہوا وہ عبیداللہ ابن عمرؓ کا مقدمہ تھا، جنھوں نے پہلے ہرمزان، پھر جفینہ اور اس کے بعد ابُولولو کی لڑکی کو قتل کر دیا تھا، یہ خونی مقدمہ درحقیقت مسلمانوں کی بڑی سخت آزمائش تھی، ابُولولو حضرت عمرؓ کا قاتل ہے، اس نے فاروق اعظمؓ کو جبکہ وہ نماز کے لیے آگے بڑھ رہے تھے دو نوک والے ایک خنجر سے زخمی کر دیا، لوگ قاتل پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے سوال وجواب سے پہلے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر دیا، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے ابُولولو، ہرمزان (مسلمان) اور جفینہ (عیسائی) تینوں کو ایک جگہ بیٹھے کانا پھوسی کرتے دیکھا تھا ان کے ہاتھ میں یہی خنجر تھا جسے وہ الٹ پلٹ کر رہے تھے اور جب وہ ان کے پاس پہنچے تو سب کے سب کھڑے ہو گئے اور خنجر اُن کے ہاتھ سے نیچے گر گیا، پھر جب حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا تو عبیداللہ بن عمرؓ ننگی تلوار لیے نکلے اور ہرمزان تک پہنچ کر اس کو قتل کر دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ عبیداللہ بن عمرؓ نے دیکھا کہ تلوار کی کاٹ اپنا کام کر چکی تو کہا لا الٰہ الا اللہ، اور اس کے بعد وہ جفینہ کے پاس پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ جب عبیداللہ بن عمرؓ نے دیکھا کہ جفینہ مر چکا ہے تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان تلوار سے صلیب کی شکل بنادی، پھر ابُولولو کے گھر پہنچے اور اس کی لڑکی کا خاتمہ کر دیا۔ حضرت صہیبؓ نے جو اس وقت نماز پڑھانے کی خدمت پر مامور تھے، خبر پاکر لوگوں کو بھیجا کہ وہ عبیداللہ بن عمرؓ کو مسلمانوں کے قتل سے روکیں، چنانچہ سعد بن ابی وقاصؓ پہنچے اور انھیں قابو میں کر لیا، پھر جب تک ان کے ہاتھ سے تلوار نہیں لے لی، ساتھ ہی رہے، اس کے بعد وہ مقید کر لیے گئے تاکہ خلیفہ ان کے بارے میں فیصلہ کرے۔

بیعت کے معاملے سے فرصت پاتے ہی حضرت عثمان رضؓ نے ان مسلمانوں سے جو عبیداللہ بن عمرؓ کے سلسلے میں آپ کے پاس آئے تھے، مشورہ کیا، عبیداللہ نے خود ہی انتقام لیا اور وہ بھی بلا دلیل۔ انھوں نے ناحق ایک مسلمان اور دو ذمیوں کو قتل کر دیا۔ فقہاء اور اہل بصیرت نے جن میں خود حضرت علیؓ بھی شامل ہیں، عبیداللہ سے قصاص لینے کا خیال ظاہر کیا، اس لیے کہ انھوں نے کھلے طور پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے تجاوز کیا۔ لیکن بہت سے مسلمانوں نے یہ کہہ کر کہ "کل عمرؓ کو شہید کیا گیا اور آج ان کا بیٹا مارا جائے" مخالفت میں اپنی رائے دی، کہتے ہیں کہ عمرو بن العاصؓ نے

حضرت عثمان رضؓ سے کہا کہ میاں اللہ نے آپ کو اس قضیہ سے بچا لیا۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، آپ اس میں مداخلت نہ کیجیے۔

اس مقدمہ میں حضرت عثمان رضؓ نے کیا فیصلہ کیا؛ اس میں راویوں کا اتفاق نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے قصاص کا فیصلہ کیا اور عبیداللہ کو ہرمزان کے لڑکے کے حوالے کر دیا کہ وہ ان سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لے۔ لیکن مؤرخین کی اکثریت کا خیال ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے فرمایا کہ میں ہرمزان اور دوسرے مقتولین کا ولی ہوں، میں قاتل کو معاف کرتا ہوں اور بیت المال میں رکھے ہوئے اپنے مال سے خون بہا ادا کرتا ہوں۔ حضرت عثمان رضؓ کی افتاد طبع کے پیش نظر یہی خیال ان کی سیرت سے میل کھاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی خلافت کا آغاز ایک نوجوان قریشی یعنی فاروق اعظم رضؓ کے ایک بیٹے کے خون سے ہو لیکن وہ ایک مسلمان اور دو ذمیوں کے خون سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے انھوں نے ایک طرف عبیداللہ بن عمر رضؓ کو قتل ہونے سے بچا لیا، اور دوسری طرف اپنے مال سے مقتولین کو معاوضہ دے دیا، یہ فیصلہ، اگر لوگ معاملے کو سیاسی عینک سے دیکھنا چاہیں، ایک مدبرانہ سیاست تھی، اس میں ان حضرات کا بھی خیال رکھا گیا ہے جو عام طور پر کہا کرتے تھے کہ کل تو حضرت عمر رضؓ کو شہید کیا گیا اور آج ان کا بیٹا قتل کیا جائے، اگر حضرت عثمان رضؓ یہ منظور فرما لیتے کہ عبیداللہ کو قصاص میں قتل کر دیا جائے تو عام طور سے بنی عدی کے لوگوں اور خاص طور پر خطاب کے خاندان والوں کے دل آپ کی طرف سے پھر جاتے، یہی نہیں بلکہ سارے قریش اور غیر قریش کے لوگ بھی آپ سے بد اشتہ خاطر ہو جاتے اور اگر وہ عبیداللہ کو معاف کر دیتے اور مقتولین کی دیت ادا نہ کی جاتی تو اس سے بدنظمی اور بے عنوانی کا ایک ایسا دروازہ کھلتا جس کو بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ حادثہ محض سیاسی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی ایک مذہبی حیثیت بھی تھی، جو سیاست پر مقدم تھی، خلیفہ کو معاف کر دینے اور درگذر کرنے کے حقوق حاصل ہیں، لیکن اس میں یہ شرط بھی ہے کہ اس کی معافی اور درگذر دین کے حدود میں سے کسی حد کو معطل کر دینے کا باعث نہ ہو۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے متشدد مسلمان حضرت عثمان رضؓ کے فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ چنانچہ انصار میں ایسے لوگ تھے جو عبیداللہ کو ہرمزان کے قتل کی یاد دلاتے تھے اور دھمکی دیا کرتے تھے کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔ زیاد بن لبید بیاضی جب کبھی عبیداللہ کو راستے میں مل جاتا، کہتا۔

الایا عبید اللہ مالک مھرب
ولا ملجا من ابن اروی ولا خفر
اصبت دما واللہ فی غیر حلہ
حراما وقتل الھرمزان لہ خطر

عبید اللہ تم بچ نہیں سکتے۔ حضرت عثمانؓ کی پناہ بھی کام نہ آئے گی۔ ہرمزان کا خون ضرور رنگ لائے گا۔

زیاد کی طرف سے جب یہ زیادتی حد سے بڑھ گئی تو عبید اللہ نے حضرت عثمان رضہ سے اس کی شکایت کی۔ حضرت عثمان رضہ نے اس کی شکایت پر زیاد کو بلایا اور سختی سے منع کیا، لیکن اس نے ایک نہ سُنی بلکہ خود حضرت عثمان رضہ کو خطاب کرتے ہوئے حسبِ ذیل اشعار کہے۔

اباعمرو عبید اللہ رھن
فلا تشکک بقتل الھرمزان
فانک ان عفوت الجرم عنہ
واسباب الخطا فرسا رھان
تعفوا ذعفوت بغیر حق فما
لک بالذی تحکی یدان

اے ابوعمرو! عبید اللہ ہرمزان کے قتل میں ماخوذ ہے۔ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اگر تم اس کا یہ جرم معاف کردوگے ایسی حالت میں کہ جرم کے اسباب بازی کے گھوڑوں کی طرح یکساں ہیں، بلادلیل معاف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم کوئی طاقت نہیں رکھتے۔

پھر تو حضرت عثمان رضہ کو غصہ آگیا اور آپ نے سخت سرزنش کی اور پھر زیاد اپنی حرکت سے باز آگیا۔ بہر حال مسلمانوں کی ایک جماعت حضرت عثمان رضہ کے اس فیصلے سے خوش نہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رضہ کا تعلق اسی جماعت سے تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر عبید اللہ کو حضرت علی رضہ اپنے زمانۂ خلافت میں پا جاتے تو ان پر قصاص کی حد یقیناً جاری کرتے لیکن وہ تو صفین کے معرکے میں کام آچکے تھے۔ ناراض مسلمانوں کو غصہ اس بات کا تھا کہ حضرت عثمان رضہ کا فیصلہ کھلی ہوئی نص قرآنی کی رعایت سے خالی ہے، پھر یہ سخت حرج کی بات ہے کہ عبید اللہ کو خلیفہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا جائے اور اس لیے کہ انھوں نے تنہا ایک عجمی مسلمان اور دو ذمیوں کا خون کیا ہے۔ اس معافی سے تو امتیاز اور تفریق کی بو آرہی ہے۔ اس میں عبید اللہ عربی اور ہرمزان عجمی میں فرق کیا جارہا ہے، خدا نے تو مسلمانوں کی عزت وآبرو، ان کے مال و دولت اور ان کے خون کی حرمت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا، خواہ وہ کسی نسل اور کسی قوم کے ہوں، اور پھر یہ معافی شبہ پیدا کرتی ہے کہ دین میں ذمیوں کے لیے حرمت اور حقوق کے احکام کے باوجود ان کے خون سے بے اعتنائی برتی جا سکتی ہے۔ اب

اگر ایسا ہی ہونے لگے اور خلفاء اور ان کے ہم مرتبہ بزرگوں کے صاحبزادوں کو، بڑے بڑے انصار، مہاجر کے فرزندوں کو موقع دے دیا جائے کہ من مانا انتقام لے لیا کریں، دربار خلافت میں اپنے معاملات پیش نہ کریں، دلائل سے بھی اپنے کو بے نیاز تصور کریں تو پھر خرابیاں عام ہوں گی، انصاف لاپتہ ہوگا، بدنظمی کا دور دورہ ہوگا اور دین کے آثار ناپید ہوں گے۔

ہاں تو عرض یہ ہے کہ حضرت عثمان رضؓ مسلمانوں کے معاملات کے والی تھے، والی ہونیکی حیثیت سے ان کو اس کا حق تھا کہ وہ معاف کر دیتے اور ہم تو ایک قدم آگے بڑھا کر کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے عبیداللہ کو معاف کر کے نہ اللہ کی حدود میں سے کسی حد کو معطل کیا اور نہ ہرمزان اور اس کے دونوں ساتھیوں کے خون سے بے اعتنائی برتی۔ اس لیے کہ اپنے مال سے انھوں نے دیت ادا کر دی، لیکن اس قسم کی معافی دین کے معاملات میں شدت برتنے والوں کو مشتبہ کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عبیداللہ کو اس کے جرم کی کوئی سزا نہیں ملی بلکہ اپنے مال سے معاوضہ ادا کر کے حضرت عثمان رضؓ نے وہ سزا خود بھگتی جو عبیداللہ کو برداشت کرنا چاہیئے۔ اگر وہ معاوضے کی رقم عبیداللہ اور ان کے گھر والوں پر عائد کر دیتے۔ اور اس طرح ان کو بچاتے اور معاف کرتے تو بلا شبہ صحیح طور پر حد جاری ہوتی اور پھر کسی کو انکے فیصلے پر مجال گفتگو نہ ہوتی اور اگر خطاب کے گھرانے کے ساتھ نرمی اور سلوک کے تقاضے سے دیت کی رقم اپنے مال سے ادا کر دی تھی تو عبیداللہ کو سزا کے طور پر قید خانہ میں رکھنا تھا کہ وہ اپنے گناہ سے خدا کی جناب میں توبہ کرتے۔ ناحق خون کرنے پر نادم ہوتے۔ نیز عہد جاہلی کے معاندانہ جذبات کے تحت جس طرح انھوں نے دربار خلافت کی توہین کی اس پر شرمندہ ہوتے۔ اگر عثمان رضؓ یہ کرتے تو اس خار زار سے اپنا دامن بچا سکتے اور عبیداللہ جیسے قریشی نوجوان کو بتا سکتے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کا خون اللہ کے نزدیک اتنی حرمت رکھتا ہے کہ اسے بغیر حق کے بہایا نہیں جا سکتا، اس کی عظمت اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ قاتل بلا خوف و خطر زندگی کے دن چین و آرام سے گذارنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

بہر حال حضرت عثمان رضؓ نے خلافت کا استقبال جس سیاسی مسلک سے کیا اس میں آپ کی تصویر ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آتی ہے جو رحم دل اور نرم طبیعت کا ہے، صلح پسند ہے، دلوں میں بیٹھے ہوئے دشمنی کے جذبات سے بچنا چاہتا ہے۔ خصوصاً رنجش کے وہ جذبات جو ممتاز مہاجرین اور ان کی اولاد کے دلوں میں پنہاں تھے، اس سیاست کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ کچھ لوگ خوش اور کچھ ناراض ہوں، یہی وجہ تھی کہ حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کا آغاز ایک ایسے ماحول میں ہوا جو شکوک اور اختلافات سے گھرا ہوا تھا، اگر حضرت عثمان رضؓ کی جگہ حضرت عمر رضؓ ہوتے اور ان کے سامنے کسی نوجوان قریشی کا مقدمہ

پیش ہوتا پھر وہ کیسے ہی خاندان کا فرد اور کیسے ہی باپ کا بیٹا کیوں نہ ہوتا، وہ ایک پختہ کار کی طرح اپنا فرض انجام دیتے، ان کو خدا کے حدود جاری کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت متاثر نہیں کرسکتی تھی، پس اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عثمان رض کے اس فیصلے نے ان کی خلافت کو حضرت عمر رض کی خلافت سے جدا کر دیا۔ اس جدائی کے دامن پر ہم کو نرمی، نرم دلی کے نقوش ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لوگوں نے حضرت عثمان رض کے متعلق رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ اور پھر عجلت کا کیا موقع، فاروقِ اعظم رض کا جو نقشہ دلوں میں تھا اس کے پیش نظر لوگ عبیداللہ بن عمر رض کے قضیے سے متعلق خود ہی دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے، نبیؐ کا فرمان ہے کہ "شہادت کی حدود کی مدافعت کرو" یعنی شک کا فائدہ مجرم کو ملنا چاہیئے۔ شاید حضرت عثمان رض نے عبیداللہ بن عمر رض کی سزا کا دفاع اس شبہ میں پایا ہو کہ وہ والد کے غم میں مغلوب الغضب ہو چکے تھے اور خدا نے مسلمانوں کو عفو ودرگزر کے لیے غیر معمولی رغبت دی ہے جبکہ وہ قدرت رکھتے ہوں۔

حضرت عثمانؓ کے فرمان

مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ عنانِ خلافت سنبھالتے ہی حضرت عثمان رض نے اپنے عاملوں اور سپہ سالاروں کے نام فرمان لکھے، بعض فرمانوں میں عوام کو بھی خطاب کیا، ان سے وہ پالیسی واضح ہو جاتی ہے جس پر حضرت عثمان رض مسلمانوں کو چلانا چاہتے تھے۔ اور جس پر اپنی خلافت کی ابتدا میں وہ بقول مؤرخین عمل پیرا رہے۔ یہ فرمان اس قابل ہیں کہ ان کو پیش کیا جائے اور ان پر غور و فکر کے چند لمحات صرف کیے جائیں۔ تاکہ ان کی روشنی میں یہ معلوم کیا جاسکے کہ جو خاکہ آپ نے اپنے لیے تیار کیا تھا اس کی کہاں تک تکمیل ہو سکی۔

۲۴ھ کے واقعات میں طبری نے ان فرامین کو نقل کیا ہے جو حضرت عثمان رض نے اپنے عاملوں کے نام لکھے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ اللہ نے خلفاء کو حکم دیا ہے کہ وہ محافظ بنیں محصل نہ بنیں، اس امت کے صدر نشین حفاظت کرنے والے رہے وصول کرنے والے نہیں بنے۔

تمہارے امام نگرانی اور محافظت سے دور اور تحصیل داری سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔
اگر یہی حالت رہی تو حیا، امانت اور وفاداری کا خاتمہ ہو جائے گا، یاد رکھو، سب سے
زیادہ منصفانہ روش یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات اور ان کے فرائض پر گہری نظر ڈالو۔
ان کے حقوق دو اور جو کچھ ان پر واجب ہے لو، ذمہ داریوں کو دو حصوں میں بانٹ دو
ان کا جو کچھ حق ہے انھیں دو، ان پر جو کچھ ہے ان سے لو، اور پھر دشمنوں پر غلبہ حاصل
کرو لیکن وفا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔"

یہ مختصر فرمان جو تکلف سے خالی، تصنّع سے دور اور زیادتی کے تصور سے بالکل پاک ہے عاملوں کو چار خصلتوں کا حکم دیتا ہے۔ پہلی خصلت یہ ہے کہ عامل چرواہوں کی طرح محافظ اور نگہبان ہوں ٹیکس وصول کرنے والے افسر نہ بنیں، مطلب یہ ہے کہ حکومت کرنے سے ان کا مقصد رعایا کے ساتھ ہمدردی اور نرمی کا سلوک ہونا چاہیئے نہ کہ حکومت کا خزانہ بھرنا یا حاکموں کی حاجت کا رخ دولت و ثروت کی طرف پھیر دینا۔ حضرت عثمان رض اس خصلت کے پیدا کرنے پر پوری شدت کے ساتھ زور دیتے ہیں۔ "رعاۃ" اور "جباۃ" کے الفاظ کی بار بار تکرار بتاتی ہے کہ آپ کی نگاہ میں اس کی کس قدر اہمیت ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، اس لیے کہ آپ اس بنیادی مقصد کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں جو عربوں کی فتوحات کی طرف متوجہ ہو جانے پر اسلام کے پیش نظر تھا یعنی اصلاح اور صرف اصلاح اس لیے کہ اسلامی فتح جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے، غلبہ اور قبضہ کی فتح نہیں ہے، بلکہ اخوت، ہمدردی، اور اصلاح کی فتح ہے۔

پھر حضرت عثمان رض اعلان کرتے ہیں کہ اس امت کے امام ابتدا میں محافظ تھے، محصل نہ تھے، اور یہ امام اللہ کے نبیؐ، ابوبکر رض اور عمر رض تھے۔ حضرت عثمان رض ڈر رہے ہیں کہ ان کے بعد کے امام محافظ نہ رہ سکیں گے، محصل بن جائیں گے، اس وقت حیا جاتی رہے گی، حیا کی جگہ بے حیائی کا دور ہوگا جس کے نتیجے میں حق پامال ہوگا، باطل پر اصرار کیا جائے گا، بے غیرتی کی رسوائیاں گناہوں سے ہم آغوش ہوں گی اس وقت امانت نہ ہوگی، امانت کی جگہ فریب اور مکاری لے گی جو خلفاء اور رعایا دونوں کے حقوق برباد کر دے گی۔ وہ وقت شکوک اور شبہات کا وقت ہوگا، لوگ ایک دوسرے سے بدگمان ہوں گے معاملات کی بنیاد صفائی اور اخلاص کی جگہ فریب کاری اور مکاری پر رکھی جائے گی، اس وقت وفا کا سلسلہ ختم ہو کر بدعہدی کا آغاز ہوگا۔ اور لوگ ایک نہ ختم ہونے والی خرابی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ شرمناک خود غرضی لوگوں میں پھیل جائے گی، نہ کوئی کسی کی عزت کرے گا نہ کسی کے لیے کوئی وقار اور احترام رہے گا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ سب ہدایتیں وہی ہیں جس کی تلقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ فرماتے تھے۔

دوسری خصلت درحقیقت اس اجمال کی تفصیل ہے جو حضرت عثمانؓ نے عمال کے فرمان میں کیا ہے یعنی عام مسلمانوں اور خلفاء اور امراء کے تعلقات میں انصاف کی رعایت رکھی جائے پس ہرگز ہرگز حکومت کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں پر کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیئے، اسی طرح عام مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے حکومت پر کوئی زیادتی نہ ہونی چاہیئے۔ جو کچھ مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان سے لیں، اور ان کے جو حقوق ہیں ان کو دیئے جائیں، حکومت ظلم نہ کرے اور صدقات کی وصولی اور خراج کی تحصیل میں حد سے متجاوز نہ ہو، لوگوں کے کسی معاملے میں بھی جبر اور زبردستی روا نہ رکھی جائے، ایک ایسا انصاف ہو جو نہ حاکم کے لیے مضر اور نہ رعایا کے لیے تکلیف دہ ہو۔

تیسری خصلت درحقیقت دوسری ہی خصلت ہے، البتہ اس میں ان ذمیوں کا ذکر ہے جن سے معاہدہ ہو چکا ہے، ایسے ذمی انصاف کا استحقاق رکھنے میں بالکل مسلمانوں کی طرح ہیں جو حق ایک مسلمان کا ہے وہی بلا کم وکاست ایک ذمی کا ہے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ وہ خیر خواہ، مخلص اور وفاداری کے ساتھ معاہدے کا پابند ہو۔ پس مقررہ مقدار سے زیادہ وصول کر کے نہ ذمیوں پر دست درازی کی جائے اور نہ کوتاہی کر کے مسلمانوں کو زیر بار کیا جائے۔

چوتھی خصلت دشمن سے متعلق ہے جو مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں، اس سلسلے میں خلفاء کی ہدایات حیرت انگیز ہیں لیکن اس میں ایک بات بھی حضرت عثمانؓ کی طبع زاد یا ایجاد نہیں اور نہ ہی وہ اپنی طرف سے جدت پسند فرماتے تھے، جیسا کہ ناظرین آگے چل کر معلوم کرلیں گے۔ حضرت عثمانؓ نے سورۂ براءت اور دوسری سورتوں میں نازل شدہ آیات کی اتباع کرتے ہوئے اپنے عمال کو ہدایت کی کہ وہ دشمنوں پر فتح اور غلبہ ضرور حاصل کریں لیکن پاس وفا کے ساتھ، دشمنوں سے بھی غداری کسی طرح جائز نہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت ان پر پیش کریں، اگر انھوں نے منظور کرلیا تو ٹھیک ہے، ورنہ مصالحت کی تجویز پیش کریں، اگر قبول نہ کریں تو مقابلہ ہو۔

یہ سیاست جس کا نقشہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عمال کے سامنے پیش کیا ہے، بعینہٖ قرآن مجید کا پیش کردہ نقشہ ہے جو حضرت عثمانؓ کے قبل کے خلفاء اور مسلمانوں کا دستور العمل رہا ہے۔

خراج کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ اپنے عاملوں کو فرمان لکھتے ہیں:

"حمد وصلوٰۃ کے بعد! اللہ نے تمام مخلوقات کو برحق پیدا کیا اور وہ حق ہی کو قبول کرتا ہے۔

پس حق دو اور حق لو، بڑی بات امانت ہے امانت، تم اپنے اندر امانت کے جوہر پیدا کرو۔
خلاف امانت کارروائی میں پہل نہ کرو، کہ بعد والوں کی کارروائیوں میں شریک گنے جاؤ گے
اور ہاں وفا کا خیال رکھو، وفا کا، یتیموں اور ذمیوں پر زیادتی نہ کرو۔ اگر یہ مظلوم ہوں گے
تو اللہ تعالیٰ خود مقابل ہوگا۔"

یہ مختصر سا فرمان ہے جس میں نہایت دلکش اجمال کے ساتھ ان ہی باتوں کی تاکید کی گئی اور ان کی طرف رغبت دلائی گئی جن کا ذکر پہلے فرمان میں آ چکا ہے، البتہ اس میں ایک قسم کی شدت اور تیزی ہے جس سے پہلا فرمان خالی ہے۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو برحق پیدا کیا اور وہ حق ہی کو قبول کرتا ہے اس لیے خلفاء اور عاملوں کو چاہیئے کہ وہ اللہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے ایسے ہی اعمال کریں جسے وہ قبول کرتا اور پسند کرتا ہے، پس وہ لوگوں سے حق کی مقررہ مقدار ہی حاصل کریں، اس میں کمی بیشی ہرگز منظور نہ کریں، اور لوگوں کو واقعی حق دیں، اس سے انحراف یا اس میں اضافہ نہ کریں، اگر اس طرح حق کی پابندی ہو تو ان کا سب سے بڑا فرض ہوگا کہ وہ رعایا کی رقموں کی وصولی میں اپنے مصالح پر خرچ کرنے میں نیز اس رقم میں جو وہ مصالح عامہ پر خرچ کرنے کے لیے خلیفہ کو سپرد کرتے ہیں، سب میں امانت اور صداقت کو پیش نظر رکھیں۔ حضرت عثمان رضؓ خراج وصول کرنے والے افسروں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ امانت کی راہ چھوڑ دینے میں پیش قدمی نہ کریں، ورنہ وہ بعد کے خیانت کرنے والوں کے شریک جرم ہوں گے۔ امانت کے بعد حضرت عثمان وفاداری اور پاس عہد کا حکم فرماتے ہیں اور اس میں بھی اتنی ہی شدت فرماتے ہیں جتنی امانت کے لیے فرمائی تھی، پھر ذمیوں اور یتیموں پر زیادتی سے منع فرماتے ہیں۔ اور خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں جو ایسے ظالموں کے بالمقابل ہوگا۔

یہ سیاست بھی قرآن مجید ہی کی سیاست ہے جس پر اللہ کے نبیؐ اور ان کے دونوں ساتھیوں کا عمل رہا ہے۔ حضرت عثمان رضؓ اپنے پہلے فرمان کی طرح اس میں بھی کوئی بات اپنی طرف سے پیش نہیں کرتے اور اپنے اس عہد کا پوری طرح خیال رکھتے ہیں جو اپنی بیعت کے موقع پر عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کیا تھا کہ قرآن وسنت اور اتباع شیخینؓ سے سرمو تجاوز نہیں کروں گا۔

حضرت عثمان رضؓ نے سرحد کے محافظوں اور سپہ سالاروں کو فرمان بھیجا جس میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"حمد وصلوٰۃ کے بعد! آپ لوگ مسلمانوں کے حامی اور ان کی طرف سے مدافعت کرنے والے ہیں۔ حضرت عمر رضؓ نے آپ کے لیے جو نظم مرتب کیا وہ ہم پر مخفی نہیں، اس کی ترتیب ہماری ایک جماعت کی موجودگی میں ہوئی ہے، ہرگز ہرگز یہ اطلاع نہ آنے پائے کہ تم نے اس

نظم میں کوئی تبدیلی کر دی ہے۔ یاد رکھو کہ خدا تم کو بدل دے گا اور تمھاری جگہ کسی کو دیدیگا پس سوچو کہ تمھارا طرز عمل کیا ہو؟ میں ان تمام معاملات پر نظر رکھوں گا جس کی نگرانی خدا نے میرے ذمے کی ہے:

غور کیجئے کہ اس فرمان میں کس قدر تدبر اور پھر کس قدر شدت سے کام لیا گیا ہے اور یہ دونوں باتیں جنگی افسروں اور دفاع کے ذمہ داروں کے لیے کس قدر موزوں اور ضروری ہیں اور خاص طور پر توجہ کیجیے کہ حضرت عثمان رض حضرت عمر رض کے مقرر کردہ نظام کی پابندی کو کتنے زور کے ساتھ لازمی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ فاروق اعظم رض نے اس نظام کا خاکہ انصار و مہاجرین کی ایک جماعت کی موجودگی میں بنایا تھا۔ خود حضرت عثمان رض اس نظام کی تیاری میں شریک اور مشیر تھے، وہ سپہ سالاروں کو تاکید کرتے ہیں کہ حضرت عمر رض کے مرتبہ نظام میں کوئی تبدیلی نہ کریں اور اگر انھوں نے کچھ ردّو بدل کیا تو دھمکی دیتے ہیں کہ وہ معزول کر دیئے جائیں گے یا سزا کے مستحق ہوں گے۔ پس حضرت عثمان رض نظامت میں، مالیات میں اور جنگ میں غرض تینوں شعبوں میں اسی مسلک کے محافظ ہیں جو حضرت عمر رض کا تھا۔ پس جس طرح حضرت عمر رض مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے تھے، سنن کی طرف راغب اور بدعات سے دور رہنے کی تاکید کرتے تھے۔ حضرت عثمان رض کا بھی یہی حال تھا، مختلف شہروں اور صوبوں کے عوام کے نام آپ نے جو فرمان بھیجے ہیں، ان کا ترجمہ پڑھیئے:-

"حمد و صلوٰۃ کے بعد! اتباع اور فرمانبرداری کی بدولت آج جو تم اس درجے پر پہنچے ہو خبردار! کہیں دنیا تم کو تمھارے اصل کام سے غافل نہ کر دے، اس لیے کہ یہ امت بدعات کی طرف جھک جائے گی۔

۱۔ خوش حالی اور فارغ البالی انتہا کو پہنچ جائے گی۔

۲۔ قیدی لونڈیوں سے پیدا ہونے والی اس کی اولاد جوان ہو چکی ہو گی۔

۳۔ دیہاتی عرب اور عجمی قرآن پڑھ چکیں گے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کفر عجمیوں میں ہے جب کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی، وہ تکلف اور جدت سے کام لیں گے۔"

اس فرمان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان رض سنت کی حفاظت کرنے میں اور تکلفات اور بدعات کو روکنے میں کسی طرح بھی حضرت عمر رض سے کم کوشاں نہ تھے، انھوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ فتوحات اور اقتدار کے جس درجہ پر آج وہ ہیں یہ اتباع اور اطاعت ہی کی برکت ہے، آپ نے مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ

دنیا کہیں ان کی توجہ اصل کام سے ہٹا نہ دے۔ پھر ان کو خطرات کے تین مواقع سے ڈراتے ہیں:۔

۱۔ عیش و عشرت کی یہ پُر لطف اور لذت بھری زندگی جو روز بروز ترقی کرتی جا رہی ہے ان کو برباد کر دے گی۔

۲۔ قیدیوں لونڈیوں سے پیدا ہو کر جوان ہونے والی اولاد ان کے لیے خرابیوں کا باعث ہوگی۔ یہ نئی نسل جس کا خون خالص عربی خون نہیں ہوگا بلکہ اس میں غیر ملکی ماؤں کے خون کی آمیزش ہوگی۔ اتباع اور اطاعت کی جگہ اپنی طرف سے اضافہ اور جدت پسند کرے گا۔

۳۔ دین میں وہ باتیں داخل کی جائیں گی جو دین نہیں۔ سادہ اور آسان علم کو جہل اور تکلف میں الجھا دیا جائے گا۔ جب کہ دیہاتی عرب اور عجمی اسلام میں داخل ہوں گے اور قرآن پڑھ لیں گے آیات کا صاف اور سادہ مطلب نہ سمجھ کر اس میں اپنی طرف سے اضافے اور بناوٹ کی باتیں داخل کریں گے۔ فتوحات کے بعد مسلمان جن آفات میں مبتلا ہوئے، حضرت عثمان رض نے اپنے اس فرمان میں اس کی جو تصویر کھینچی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا نمونہ کسی اور نے پیش کیا ہے۔ مال اور دولت کی کس قدر بہتات ہوئی اور معیشت میں کیسی فراوانی آئی اور مسلمانوں کے لیے کس طرح تعیش اور ہوسناکی کا باعث بنی، پھر ایک نئی نسل پیدا ہوئی جس نے حد سے بڑھی ہوئی جرأتیں دکھائیں بے جا تکلفات اور دُور از کار جدتوں سے کام لیا۔ قرآن مجید کو اس کے طریقوں سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، کہیں بالکل ڈھیل چھوڑ دی اور کہیں حد سے زیادہ سختی برتی۔ چنانچہ حق ان کی سخت گیریوں اور حد سے زیادہ سہل انگاریوں کے درمیان گم یا تقریباً گم ہو گیا۔

عہدِ فاروقی رض کے گورنر جنکو حضرت عثمان رض نے باقی رکھا

جن عاملوں کے نام حضرت عثمان رض نے یہ فرمان لکھے تھے وہ سب کے سب حضرت عمر رض کے مقرر کردہ تھے۔ حضرت عثمان رض نے ان کو ان کے عہدوں پر سال بھر باقی رکھا جس کی خود حضرت عمر رض نے وصیت کی تھی۔ دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے پیش نظر اس سے صحیح کوئی اور وصیت ہو بھی نہیں سکتی تھی، حضرت عمر رض کو خطرہ ہوا کہ اقتدار سے فائدہ اٹھانے میں خلیفہ کہیں عجلت سے کام نہ لے اور کچھ نئے لوگوں کا تقرر اور بعض پرانے حاکموں کو برطرف نہ کر دے۔ ایسی حالت میں عمال نے جن کاموں کا آغاز کر رکھا ہے اس میں

رکاوٹ یا تعطل پیدا ہو جائے گا اور اس سے سرحدوں اور شہروں میں مسلمانوں کے معاملات میں یک گونہ بدنظمی اور انتشار پھیلے گا۔ حضرت عثمان رض نے اس وصیت پر پوری شدت کے ساتھ عمل کیا اور عاملین کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ عثمانی عہد میں یا اس کے پہلے سال تک اسی سیاست پر عمل درآمد کرتے رہیں جو حضرت عمر رض چلاتے رہے۔ حضرت عثمان رض نے پورے سال بھر عزل و نصب کی کوئی کارروائی نہیں کی اور جو کچھ عمال کی طرف سے ہوتا رہا اسے منظور فرمایا۔

مکہ کے گورنر نافع بن عبد الحارث خزاعی تھے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ قریشی نہیں ہیں۔ اور طائف کے گورنر سفیان بن عبد اللہ ثقفی تھے وہ بھی قریشی نہیں ہیں۔ طائف بنی ثقیف کا شہر ہے، صنعا کی گورنری پر یعلی بن منبہ تھے اور وہ بھی قریشی نہیں ہیں بلکہ بنی نوفل بن عبد مناف کے حلیف ہیں۔ جند کے گورنر عبد اللہ بن ابو ربیعہ ہے جو بنی مخزوم سے ہیں اور قریشی ہیں، کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ تھے جو ثقفی ہیں۔ بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری تھے جو نہ قریشی ہیں نہ مضری اور نہ عدنانی بلکہ یمنی ہیں۔ مصر کے گورنر عمرو بن عاص تھے جو بنی سہم سے ہیں اور قریشی ہیں۔ حمص کے گورنر عمیر بن سعد تھے جو انصاری ہیں اور دمشق کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان تھے وہ بنی امیہ سے ہیں اور قریشی ہیں، فلسطین کے گورنر عبدالرحمٰن ابن علقمہ تھے اور وہ کنانی ہیں۔ بحرین اور اس کے مضافات کے گورنر عثمان بن ابی عاص ثقفی تھے۔

ان گورنروں کی اکثریت جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں قریشی نہیں ہے اور حضرت عمر رض کے خاندان عدی کا تو ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ حضرت عمر رض کے گورنر بنانے کا معیار مضریت اور عدنانیت نہ تھی، آپ نے تو ان ہی عربوں کو پسند کیا جن کے اسلام اور قابلیت میں عمدگی پائی اور پھر جیسا کہ معلوم ہے دینی اور دنیاوی حیثیتوں سے آپ اپنے گورنروں کی سخت نگرانی کرتے تھے، بہرحال گورنروں کے عزل و نصب میں حضرت عمر رض کے پیش نظر کوئی خاندانی عصبیت نہ تھی۔

وظیفوں میں اضافہ

حضرت عثمان رض نے وصیت کے مطابق ان گورنروں میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور اپنی خلافت کے پورے ایک سال تک نہ کوئی جدید تقرر کیا اور نہ کسی کو معزول، لیکن اس کے سوا معاملات میں انھوں نے اقدامات کیے، چنانچہ عبید اللہ بن عمر رض کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے، گورنروں، افسروں اور عوام کے نام فرامین لکھنے کے بعد سب سے پہلا کام جو آپ نے انجام دیا وہ لوگوں کے وظیفوں میں اضافہ کر دینا تھا۔ آپ نے مقررہ روزینے میں سو اسو کا اضافہ کر دیا۔ حالانکہ آپ کی خلافت اور حضرت عمر رض کے وصال پر ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی گزرنے نہ پائے تھے۔ اور اس وقفے میں کوئی ایسی تبدیلی بھی نہیں ہوئی تھی جسے اس غیر معمولی اضافے کا باعث بتایا

جاسکے۔ تب اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضؓ اپنی خلافت کا آغاز لوگوں کی خوشحالی اور فارغ البالی سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن معلوم نہیں خلیفہ اس قسم کی عام خوشحالی کے لیے بیت المال سے اخراجات کرنے کا کہاں تک مجاز ہے؛ جب کہ نہ تو لوگوں کی ضروریات کا تقاضا ہوا اور نہ بیت المال کی آمدنی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہو۔

بہرحال یہ تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عثمان رضؓ کا یہ اضافہ، حضرت عمر رضؓ کے مالی مسلک سے کچھ تھوڑا سا انحراف ضرور ہے جس میں بیت المال کی بچت اور بقدر ضرورت خرچ دونوں باتیں پیش نظر تھیں۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کو حضرت عمر رضؓ کی مالی سیاست میں ایک قسم کی سختی محسوس ہوتی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس شدت کو ناپسند فرماتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ فاروق اعظم رضؓ جو کچھ لوگوں کو دیتے ہیں بیت المال میں اس سے زیادہ گنجائش ہے۔ لیکن یہ بالواسطہ حضرت عمر رضؓ کی اس زندگی پر تنقید ہے جس کا تعلق بیت المال کی سیاست سے نہ ہے۔

اور کیوں نہ ہم اشارات اور کنایات کا پردہ ہٹاکر کھلے طور پر عرض کریں کہ حضرت عثمان رضؓ نے خود عوام کے خرچ پر عوام تک پہنچنے کی کوشش کی کہ بیت المال خلیفہ کا نہیں عام مسلمانوں کا تھا اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے اس لیے کہ اگر وہ مسلمانوں کی طرف سے اس کے مجاز تھے، کہ ان کے روزینے مقرر کریں تو وہ اس کے بھی حقدار تھے کہ بیت المال کے حالات کے ماتحت وظیفوں کی مقدار بڑھادیں یا گھٹادیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کے اس اضافے نے وہ دروازہ کھول دیا جس کے بند کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے کہ اضافے کی تو حد ہی نہیں ہے پھر خلیفہ اگر آج عوام کے وظیفے بڑھا سکتا ہے تو کل اپنے خواص کے لیے بھی گنجائش نکال سکتا ہے اور پھر اس کے بعد عوام کی دولت کے لیے حرص وطمع کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ ایک فیاض اور دریادل سخی تھے۔ اللہ کی راہ میں اپنی دولت بے حساب خرچ فرماتے تھے، اپنے دوستوں اور عزیزوں پر بھی بے شمار صرف کرتے تھے، ان کا یہ عمل نہ صرف یہ کہ قابل اعتراض نہیں بلکہ خدا کے لیے جزائے خیر کا مستحق بھی ہے لیکن حضرت عثمان رضؓ کی دولت بہرحال عوام کی گنجائش کے لیے تنگ تھی اور وہ اس میں سے عوام کے وظیفوں کی مقدار نہیں بڑھا سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے خود عوام ہی کی دولت سے ان کے روزینوں میں اضافہ کر دیا اور ایک ایسا دروازہ کھول دیا جس میں داخل ہونا تو لوگ جانتے تھے لیکن اس سے نکلنا انھیں معلوم نہ تھا۔

پس یہ بات صحیح نہیں کہ حضرت عثمان رضؓ اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں بڑی احتیاط کے ساتھ

حضرت عمرؓ کے طریقِ کار کے پابند رہے، محض منصبِ خلافت کے حاصل ہونے پر یکایک وظیفوں میں اضافہ فاروقِ اعظم رضؓ کا طریقِ کار نہ تھا۔ حضرت عثمان رضؓ نے لوگوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کیا اور ان کی روزی بڑھادی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات عوام کی نگاہ میں قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اپنی خوشحالی میں اضافہ سے کوئی رنجیدہ نہیں ہوتا بلکہ فطری بات تو یہ ہے کہ لوگوں نے اس بات پر ٹھنڈی سانس لی ہو گی کہ حضرت عثمان رضؓ نے خلیفہ ہوتے ہی ان کی آمدنی بڑھادی، ان کو فاروقی شدت سے رہائی دلائی۔ اور ان کی معتدل فراغت میں جو حضرت عمرؓ کی مالی سیاست کا نتیجہ تھی غیر معمولی وسعت پیدا کردی۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے زندگی بھر اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش نظر رکھی:۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا	اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا، پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہوا ہارا ہوا۔

وظیفوں میں اضافہ اور وفود کی طلبی

پھر حضرت عثمان رضؓ نے وظیفوں میں اضافے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بقول مؤرخین شہروں سے وفود طلب کیے تاکہ لوگ وظیفے اور مراعات پاسکیں، اخراجات میں اضافے کی یہ وہ مَد تھی جس کا حضرت عمرؓ خیال بھی نہیں فرما سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ والوں کے لیے رمضان کے دنوں میں جو خصوصی اضافہ منظور فرمایا تھا۔ وہ ہر ایک کے لیے روزانہ ایک ایک درہم اور ازواجِ مطہرات کے لیے دو دو درہم تھا، یہ اضافہ ان کی فارغ البالی کے لیے کافی تھا اور وہ بال بچوں سمیت اس سے خوش تھے، حضرت عمرؓ نے لنگر خانوں میں بھی اضافہ فرمایا جب آپ نے محسوس کیا کہ اس طرح لوگوں کی خودداری بھی باقی رہتی ہے۔ اور ان افراد کے لیے بھی سہولت ہوتی ہے جو دوسروں کے کفیل ہیں لیکن حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں رمضان کے دن آئے تو انھوں نے فاروقی اضافے کے علاوہ لنگر خانوں کو تمام ضرورت مندوں اور ہر وقت آنے والوں کے لیے عام کردیا۔

بلاشبہ حضرت عثمان رضؓ کا یہ عمل نیکی اور سلوک میں ڈوبا ہوا عمل تھا لیکن اس میں بھی شک نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے عوام کے مال میں لوگوں کے لیے حرص و طمع کی ایک راہ نکلتی تھی اور زیادہ سے زیادہ اپنا بھلا کرنے کا جذبہ رغبت پا رہا تھا۔ ہر آدمی اپنی خواہش پر اتنا قابو یافتہ کہاں کہ انتہائی

مجبوری ہی پر لنگر خانوں میں داخل ہو بلکہ بہت سے لوگ ایسے ہو سکتے ہیں کہ اپنے عام مقررہ روزینے میں روزے کا اضافہ شامل کر لینے کے بعد بھی لنگر خانے چلے آئیں اور ضرورت مندوں اور تازہ واردوں کی طرح شکم سیر ہوں۔

یہ سب کچھ حضرت عثمان رضؓ کی فیاضی اور دریا دلی ہے اور یقیناً اس میں اچھائی اور بھلائی کے مواقع ہیں لیکن بعض ان خطرات سے خالی نہیں جو سیاسی اور اخلاقی پہلو رکھتے ہیں پھر اس میں بدگمانی اور فضول گوئی کے لیے بھی گنجائش ہے اور ایک نقاد کو کون روک سکتا ہے کہ وہ خود خیال کرے، یا لوگوں تک اپنا یہ خیال پہنچائے کہ یہ دریا دلی درحقیقت ایک پالیسی تھی جو ایک خلیفہ نے اپنے حق میں سخاوت اور فیاضی کے نام پر کی۔

صحابۂ کبار رضؓ کو عطیات

پھر حضرت عثمان رضؓ کی سخاوت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جیسے جیسے دن گذرتے گئے اور آپ کی خلافت آگے بڑھتی گئی، آپ نے ممتاز صحابہ رضؓ کو ان کے مقررہ وظیفے پر مستزاد عطیات دیئے، ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ نے زبیرؓ ابن عوام کو ۶ لاکھ، طلحہؓ کو ۲ لاکھ عطیہ دیا اور ان پر آپ کا جو کچھ قرض تھا وہ بھی معاف کر دیا، ابن سعد کہتے ہیں کہ زبیر رضؓ کو جب یہ عطیہ ملا تو وہ لوگوں سے پوچھتے پھرتے کہ کوئی بہتر سے بہتر کاروبار بتاؤ۔ جس میں اپنا سرمایہ لگا کر نفع حاصل کر سکوں، چنانچہ انھیں بتایا گیا کہ شہروں اور صوبوں میں مکانات تعمیر کرا لیجیے۔

عام معاملات میں فاروق اعظم رضؓ کی سیرت سے ہٹنے میں حضرت عثمان رضؓ یہیں آ کر نہیں رُک گئے، بلکہ انھوں نے اس سے بھی زیادہ خطرناک مخالف قدم اٹھایا اور جلیل القدر صحابہ رضؓ کو اجازت دے دی کہ وہ حجاز سے باہر نکلیں اور مختلف مقامات پر جا کر بسیں۔ حالانکہ حضرت عمر رضؓ نے ان کو مدینہ ہی میں روک رکھا تھا اور اپنی خاص اجازت کے بغیر کسی کو باہر نہیں جانے دیا۔ فاروق اعظم رضؓ فرماتے تھے کہ میں قریش اور فتنہ و فساد کے درمیان ایک دیوار ہوں۔ حضرت عثمان رضؓ نے یہ دیوار گرا دی۔

جب حضرت عثمان رضؓ نے لوگوں کے گذارے میں اضافہ کر دیا اور انعام و اکرام کے طور پر بڑی بڑی رقمیں عنایت کر دیں، پھر ان انعام و اکرام پانے والوں کو اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ ممالک محروسہ میں جہاں جی چاہے جا کر فاتح فوجیوں اور محکوم رعایا سے اپنے تعلقات بڑھائیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ایک طرف ان کی ثروت اور دولت میں غیر معمولی ترقی ہو، دوسری طرف ان کے

متبعین اور ماننے والوں کی تعداد بڑھے اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنی پارٹی کا لیڈر بنے اور اپنے کو مسلمانوں کے معاملات کا والی بننے کا زیادہ حقدار خیال کرنے لگے اور اس کے لیے فرصت اور مواقع کی تلاش میں بھی رہنے لگے۔

ابھی ابھی ہم نے وہ فرامین نقل کیے ہیں جن میں حضرت عثمان رض نے فاروق اعظم رض اور صدیق اکبر رض کے طرز عمل کی اتباع اپنے لیے ضروری قرار دی ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے کیوں ایک دوسری راہ اختیار کی؟ اس میں شک کی مطلق گنجائش نہیں کہ دین کے بارے میں انھوں نے کوئی لیپا پوتی نہیں کی۔ یہ بھی یقینی ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی انھوں نے اپنے مسلک کو شیخین رض کے طرز عمل کا مخالف نہیں سمجھا آپ نے جو کچھ کیا اس کا مقصد جان بوجھ کر کوئی زیادتی یا ہوس نہ تھی۔ لوگوں کا مال تھا لوگوں تک پہنچا دیا۔ بیت المال میں دولت جمع دیکھی، اس کے باقی رکھنے کی زیادہ فکر نہیں کی، لوگوں کو دے دینا زیادہ مناسب جانا اور اس میں کیا حرج ہے کہ وہ اس مال میں سے کم یا زیادہ نبیؐ کے ان اصحاب کو بطور صلہ دیدیں جو اسلام کے امام اور حکومت کے بانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے نبیؐ کی زندگی میں بڑی مصیبتیں برداشت کیں اور شدید ترین آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے۔ اللہ نے دولت کی فراوانی کرکے اپنا وعدہ پورا کیا۔ پھر ان مہاجرین کے علاوہ کون لوگ ہیں جنھیں اس دولت سے مستفید ہونے کا حق ہے؟

بلاشبہ حضرت عثمان رض کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ وہ موروثہ سنت کی کوئی خلاف ورزی کر رہے ہیں، انھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کی کریمانہ افتاد طبع تھی اور مسلمانوں کو خوشحال بنانے کا جذبہ، نیز اصحاب رسولؐ پر نظر عنایت۔ اور ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جسے گناہ کہا جاسکے، یہ تو آپ کی خوبی تھی، بھلائی تھی اور نیکی۔

لوگوں کو بھی اس میں کوئی حرج کی بات نظر نہ آئی انھیں دولت ملی، انھوں نے ناپسند نہیں کیا اور نہ واپس کیا۔ ان میں سے کسی کو اس میں بھی کوئی حرج نظر نہیں آیا کہ نبیؐ کے ممتاز اصحاب اور مہاجرین میں سے سابقین اولین انعام واکرام کے مستحق بنیں، اور میرا خیال ہے کہ اگر حضرت عثمان رض عوام کی خوشحالی اور جلیل القدر صحابہ رض کی قدردانی پر ہی اکتفا فرماتے تو لوگ ان سے ناراض نہ ہوتے اور شاید اسی مفہوم کی تعبیر مؤرخین کا یہ متفقہ بیان ہے کہ حضرت عثمان رض کی خلافت کا ابتدائی دور سکون اور خوش دلی کا دور تھا۔ نرمی، سہولت اور چشم پوشی نے مسلمانوں میں عثمانی خلافت کو حضرت عمر رض کے مسلک سے کہیں زیادہ مقبول بنایا جس کی بنیاد شدت اور تدبر پر تھی۔ شدت اور تدبر کا تقاضا ہے کہ لوگ صبر کریں۔ غیر معمولی

ثابت قدمی اور نا قابلِ برداشت مصائب برداشت کیں۔
مناسب ہوگا کہ ہم حضرت عثمان رضؓ کو ان کی خلافت کے پہلے برس یا ابتدائی برسوں میں نرم اور فیاض پالیسی پر گامزن رہنے دیں اور ایک نظر اس جماعت پر ڈالیں جو اس عثمانی مسلک کی پیدا کردہ تھی۔ تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ حضرت عثمان رضؓ کی سیاست کامیابی سے ہم کنار ہو بھی سکتی تھی یا نہیں۔؟

حضرت عُثمان رضؓ کی رعایا

طبری سَری سے اور وہ شعیب سے اور وہ سیف سے اور وہ عمارہ بن قعقاع سے اور وہ حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"حضرت عمر رضؓ نے ممتاز قریشی صحابہؓ پر پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ مدینہ چھوڑ کر باہر نہ جایا کریں اور اگر جانا ہو تو مقررہ مدت کے لیے اور وہ بھی خاص اجازت لے کر، اور جب ان لوگوں نے اس کی شکایت کی اور یہ شکایت حضرت عمر رضؓ تک پہنچی تو آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا سُن لو میں نے اونٹ کی طرح اسلام کی منزلیں مقرر کی ہیں۔ ابتدا میں اونٹ نوخیز ہوتا ہے پھر اس کے آگے کے دانت ٹوٹتے ہیں پھر اس کے بازو کے، اس کے بعد وہ سدیس ہوتا ہے یعنی عمر کا پختہ، اس کے بعد بازل یعنی بوڑھا، بوڑھے سے ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی، ہاں سُن لو کہ یہ اسلام کے لیے انحطاط کا دور ہے۔ قریش والے چاہتے ہیں کہ اللہ کا مال اسکے بندوں کے سوا دوسری ضرورتوں میں رکھ لیں لیکن یاد رکھو جب تک عمر رضؓ کی جان میں جان ہے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں مکہ کے پہاڑ حرہ کی گھاٹی پر قریش کی گردن اور کمر پکڑے کھڑا رہوں گا اور ان کو آگ میں کود پڑنے سے روکے رکھوں گا۔"

طبری ہی نے سَری سے اور وہ شعیب سے اور وہ سیف سے اور وہ محمد اور طلحہ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"جب حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان ممتاز صحابہؓ پر وہ نظر نہیں رکھی جو حضرت عمر رضؓ رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ شہروں میں جا بسے جہاں جاکر انھوں نے دنیا دیکھی اور دنیا نے انکو

دیکھا، پھر کیا تھا۔ عوام کا وہ طبقہ جس کا کسی ایثار اور قربانی میں حصہ نہ تھا اور جو کسی اسلامی خصوصیت کا مالک نہ تھا، جاہ طلبی بن بن کر ان حضرات کے گرد جمع ہونے لگا۔ ان کو ہر قسم کی امیدیں دلائیں اور حوصلے بڑھائے تاکہ ان کے مقتدر ہونے کے بعد اس کو مقرب اور ساتھی بننے کا موقع ملے۔ یہ سب سے پہلا رخنہ تھا جو اسلام میں پڑا اور یہ سب سے پہلا فتنہ تھا جس کے عوام شکار بنے۔

پھر طبری ہی سری سے اور وہ شعیب سے اور وہ سیف بن عمر اور شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ:

حضرت عمر رض کا وصال اس حالت میں ہوا کہ قریش ان سے تنگ آ چکے تھے جن کو انھوں نے مدینہ میں بند کر رکھا تھا اور ان کو مخاطب کر کے فرماتے تھے کہ مجھے قوم کے لیے سب سے زیادہ خطرہ شہروں میں تمھارے پھیل جانے سے ہے ان میں سے اگر کوئی جہاد میں جانے کی اجازت بھی چاہتا تو آپ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شرکت کر کے تم نے اپنے لیے بہت کچھ کر لیا ہے، اب تو تمھارے لیے جہاد سے بھی اچھا یہ ہے کہ نہ تم دنیا دیکھو اور نہ دنیا تم کو دیکھے۔ پھر جب حضرت عثمان رض خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان کے لیے راستہ صاف کر دیا اور وہ شہروں میں پھیل گئے اور لوگ ان کی طرف جھک پڑے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے حضرت عثمان رض حضرت عمر رض سے زیادہ مقبول تھے[1]

قریش رعایا

اب ہم حضرت عثمان رض کی قریش رعایا سے بحث کی ابتدا کرتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ اس رعایا کے متعلق حضرت عمر رض کا نقطۂ نظر کیا تھا؛ فاروق اعظم رض کو قریش سے جس قدر خطرہ تھا اتنا کسی اور سے نہ تھا۔ ساتھ ہی وہ اس سے بھی خائف تھے کہ کہیں خود قریش فتنوں کا شکار نہ ہو جائیں، اس لیے کہ وہ اس قبیلے کی رگ رگ سے واقف تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس میں بڑی سے بڑی خوبی کیا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی کمزوری کہاں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ قریش جس میں خود حضرت عمر رض نے پرورش پائی تھی اسلام کی حلقہ بگوشی سے پہلے قوت اور کمزوری یا خوبی اور خرابی دونوں میں ممتاز حیثیت کا مالک قبیلہ تھا، اس کی قوت کا سرچشمہ اس کی وہ پوزیشن تھی، جو کعبۃ اللہ کی وجہ سے اس کو حاصل تھی، حج کے مناسک تمام تر اسی کے ساتھ وابستہ تھے، یہی قبیلہ تمام عربوں کو حج کراتا تھا اور ان پر ایک رہنمایانہ فوقیت اور غلبہ رکھتا تھا اور یہ اس کا وہ امتیاز تھا جس میں کوئی اس کا شریک یا حصہ دار نہ تھا اور اس لیے وہ خیال کرتا تھا کہ تمام دوسرے عربی قبائل پر اس کو ایک سیادت اور سرداری حاصل ہے اور خود عربوں کو اس کی برتری اور سرداری کا اعتراف تھا

---

[1] تاریخ طبری ۳۵ھ کے حالات

اس لیے نہیں کہ وہ کوئی غیر معمولی جنگ جُو اور بہادر قبیلہ ہے یا اس کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے قریشی تو عربوں کی نگاہ میں لڑاکو اور زبردآزما تھے ہی نہیں بلکہ اس لیے کہ دین کے تمام معاملات کا اسی قبیلے سے تعلق تھا اور دین کی ہر چھوٹی بڑی بات اسی کے ذریعے انجام پاتی تھی۔ اس کی قوت اور اقتدار کا دوسرا سرچشمہ اس کی وہ زبردست اور غیر معمولی تجارت تھی جو پورے عرب کے کاروبار پر غالب اور حاوی تھی۔ ان قوتوں کی بنا پر قریش نے اپنے قدم جما رکھے تھے اور حرم اور اس کے گرد و پیش کے مقامات کو امن اور سلامتی کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ قوت کے ان ہی دو چشموں نے ان میں ہمت، حوصلہ، تدبر اور چالاکی کے وہ اوصاف پیدا کر دیئے تھے جن سے بنی ثقیف کے علاوہ تمام عربی قبیلے محروم تھے۔ بیوپار اور تجارت کی سرگرمیوں نے ان کو اس درمیانی کڑی کا درجہ دے دیا تھا جو مشرق قریب کو مغرب بعید سے ملا دیتی ہے۔ اور اس اتصال کی وجہ سے مشرق اور مغرب کے یا یوں کہیئے کہ روم اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کا سبب یہی قریش تھے۔ قریشیوں نے اپنی اس پوزیشن کی بدولت غیر معمولی دولت پیدا کی اور دولت سے بھی کہیں بڑھ کر تجربات حاصل کیے اور معاملات میں پختگی پیدا کی، پھر مال و دولت کی کثرت نے ان کو حرص کا سبق بھی دیا، حفاظت کرنا اور انتہائی احتیاط اور باریک بینی سے نفع اندوزی کے لیے سرمایہ لگانا بھی سکھایا، پھر مسلسل تجربات، مختلف قوموں سے معاملات اور میل جول، تیز دور دراز مقامات کے لمبے لمبے سفروں نے ان کو مشکلات کا مقابلہ کرنا، مصائب سے گذر جانا اور دشواریوں پر قابو پا لینا سکھایا، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش عربی قبائل میں سب سے زیادہ پختہ کار ماہر اور چالاک قبیلہ بن گیا۔

یہ وہ اسباب تھے جس کے نتیجے میں قریشیوں کے حوصلے بڑھے، ان کی خواہشوں کی کوئی حد نہ رہی۔ ان کی طاقتِ برداشت نے مصائب کو آسان کر لیا۔ مشکلات کی ہنسی اڑائی اور ان کو حل کیا۔ وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور اس سے بھی خطرناک منزل میں قدم رکھا۔ انھوں نے سماج کی مقررہ قدروں کو پامال کیا عوام کے مراسم اور دینی معتقدات کا مضحکہ اڑایا اور اپنے نزدیک یا دور کے مفاد کی راہ میں سب کچھ مباح کر دیا۔ وہ دین کی امانت کا پردہ اپنی تدبیروں کے لیے استعمال کرتے رہے۔ حالانکہ دین سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے کہ قریش کے سردار دین کو زیادہ سے زیادہ وسیلہ تصور کرتے تھے، مقصد نہیں، ان کی نگاہ میں بتوں کے مجسمے رزق اور اقتدار کا ذریعہ تھے اور کچھ نہیں۔ قریش کا ایک مطلبی چالاک اور دبنگ سردار جب مشکلات میں گھر جاتا تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بھنور سے کس طرح صحیح سلامت نکل سکے گا۔

حضرت عمرؓ قریش کا یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے، اس لیے ان کے فریب میں نہ آسکے اور اپنی رائے ان کے متعلق اس وقت بھی نہ بدل سکے جب قریشی اسلام کی طاقت کا یقین کر کے اس کے حلقہ بگوش ہو چکے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے پوری احتیاط برتی اور اپنے مسلک میں ان کے لیے کسی نرمی اور چشم پوشی کی گنجائش نہیں رکھی اور کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کو ہوس پورا کرنے، بڑے بڑے مقاصد پالینے کا، اپنی شان بڑھانے اور دوسروں کو گھٹانے کا موقع ملے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ کی نگاہوں سے مہاجرین کی فضیلت اور امتیاز کا وہ درجہ اوجھل نہیں تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان کو ہر طرح مکرم اور معزز رکھا اور اپنی بہت سی عنایتوں اور الطاف سے نوازتے رہے لیکن اعزاز و اکرام کی یہ تمام باتیں حضرت عمرؓ کو اس بات پر مطمئن اور رضامند نہ کر سکیں کہ اپنی خلافت کے دور میں مہاجرین کو من مانے مقاصد کے لیے آزاد چھوڑ دیں۔ قریش کے بارے میں حضرت عمرؓ کا نقطۂ نظر آپ کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے۔ پھر آپ کا یہ فرمانا کہ میں حرا کی گھاٹی پر کھڑا قریش کو آگ میں کودنے سے روکے رکھوں گا، اسی طرح جہاد میں شرکت کی اجازت مانگنے والے مہاجر صحابہؓ سے آپ کا یہ ارشاد کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہادوں میں شرکت کر کے اپنے لیے بہت کچھ کر لیا ہے اب آپ کے لیے جہاد سے بھی افضل یہ ہے کہ دنیا کا منہ نہ دیکھیں اور نہ دنیا آپ کا منہ دیکھے، آپکے نقطۂ نظر کو اور واضح کر دیتا ہے اور غالبًا حضرت خالد بن ولیدؓ کے معاملے میں شدت اور ان کی معزولی اور ان پر سخت احتساب، بحث کے وہ پہلو ہیں جو حضرت عمرؓ کے نقطۂ نظر کو سب سے زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ حالانکہ خالد بن ولیدؓ خدا کی ان پر رحمت ہو، عہدِ نبویؐ میں، پھر دورِ صدیقیؓ میں، عرب رومی جنگ کے سلسلے میں اور تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہ چکے ہیں لیکن حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کا سبب یہی تھا کہ وہ قریش کو اچھی طرح جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ قوت مل جانے کے بعد وہ کس طرح غلط استعمال کرنے لگتے ہیں اور اپنی کمزوریوں پر غالب آجاتے ہیں، اوپر کی سطروں میں قریش کی جس قوت کی ہم نے تصویر کھینچی ہے یہی درحقیقت اس کمزوری یا خرابی کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے کہ یہی قوت انھیں حد سے بڑھ جانے پر آمادہ کرتی اور وہ نخوت اور تکبر کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں، یہی قوت ان میں مال کی محبت اور پھر مال کی حرص پیدا کرتی جس کے نتیجے میں وہ استحصال اور ناحق وصولی کی زد میں آجاتے، یہی قوت ان کو اپنا بھلا چاہنے پر راغب کرتی اور وہ تیار ہو جاتے کہ غوری اور سہولت سے حاصل ہونے والے منافع سے لطف اندوز ہوں اور اس قسم کے منافع بسا اوقات گناہ سے خالی نہیں ہوتے، یہی قوت ان کو حرص و طمع کی دعوت دیتی جس کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ چنانچہ حرص و طمع کے ہاتھوں وہ حدود سے بڑھ جاتے۔

جن باتوں کی خواہش مناسب نہیں، ان کے حوصلے کرتے، اسی طرح جبر اور زیادتی کے مواقع بھی آجاتے۔ فاروق اعظم رضؓ کو جب ان مہاجرین سے بھی یہ سارے خطرات تھے جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت حاصل تھی جو تمام مواقع پر آزمائشوں میں ثابت قدم رہے تو پھر وہ قریشی جو بہت بعد میں مسلمان ہوئے ان سے تو حضرت عمر رضؓ کو بہت زیادہ محتاط اور پُر حذر رہنا ضروری تھا۔

یہ بعد میں اسلام لانے والے قریشی جن میں بہت سے جوان اور بوڑھے شامل ہیں ہنسی خوشی مسلمان نہیں ہوئے تھے، کچھ لوگوں نے تو فتح کے نقارچی بن کر جب دیکھا کہ اسلام کا پلہ بھاری نظر آتا ہے تو اس طرف جھک پڑے اور کچھ لوگ مجبور ہوئے کہ سارا مکہ امڈ آیا ہے اب ان کے لیے اسلام کے سوا چارۂ کار نہیں بہرحال اسلام کے متعلق ان ایمان لانے والوں کا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ایک دین ہے جس کا تعلق دلوں کی دنیا سے ہے جو اللہ کے شعائر اور حقوق سے وابستہ ہے بلکہ وہ تو اس کو غیر معمولی "چانس" تصور کرتے تھے جس طرح کہ وہ اور بہت سے مواقع سے کبھی اپنے ملک میں اور کبھی بیرونی ممالک میں فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسلام قبول کرتے وقت ان کے پیشِ نظر تھا کہ نبیؐ نے قریش سے اسلامی دعوت کے سلسلہ میں وعدہ کیا ہے کہ وہ دنیا کی عزت اور عقبیٰ کا ثواب دونوں دیں گے۔ چنانچہ بہت سے تو دنیا کی عزت اور خوشحالی کے خیال سے اور کچھ لوگ آخرت کے ثواب کا خیال کر کے مسلمان ہوئے، پھر اسی خیال سے انھوں نے جہاد اور فتوحات کی راہ میں مصائب برداشت کیے اور قربانیاں کیں اور یہ مصائب اور قربانیاں بعض مواقع پر اوروں سے بڑھ چڑھ کر رہیں۔

پھر بہتوں نے ان میں سے خلوص یا خود غرضی سے یہ چاہا کہ نبیؐ کے ساتھ غزوات میں شرکت نہ کرنے اور مصیبتیں برداشت نہ کرنے کی تلافی، اس وقت کی فتوحات میں شریک ہو کر اور اس کی راہ میں مصیبتیں اٹھا کر کر دیں، چنانچہ جب عربوں نے اس طرف رُخ کیا تو اس قسم کے لوگ دوڑ پڑے، ان میں بہتوں کا مقصد تو دنیا تھی اور کچھ تھوڑے سے آخرت کے چاہنے والے بھی تھے، ان کے لیڈر اور سردار خوب سمجھ رہے تھے کہ وہ فتح مکہ کی امان یافتہ پیداوار ہیں اور ان کا درجہ اسلام کے سابقین اوّلین سے کم ہے۔ یہ احساس ان کے لیے سخت کوفت کا باعث تھا اور ان میں احساس کمتری کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے بارے میں حضرت عمر رضؓ کی رائے کیا ہے؛ اور اسی وجہ سے وہ فاروق اعظم رضؓ سے برہم تھے اور چاہتے تھے کہ جہاد میں شرکت کر کے اور شدائد و مصائب کا مقابلہ کر کے ثابت کر دیں کہ ان کے متعلق خلیفہ ثانی کی رائے حقیقت سے کس قدر دور ہے اور یہی مطلب ہے اس جملے کا جو خالد بن ولید رضؓ کی زبان سے اس وقت نکلا جب وہ شام کی کسی لڑائی میں گر پڑے، اس وقت عکرمہؓ بن ابوجہل کی ران پر

اپنا سر رکھے ہوئے انھوں نے کہا " حنتمہ کا لڑکا سمجھتا ہے کہ ہم لوگ اللہ کی راہ میں جان دینا نہیں جانتے "۔
حنتمہ حضرت عمر رضؓ کی والدہ کا نام ہے۔

پھر قریش کے لیے حضرت عمر رضؓ کے مسلک میں جو شدت تھی اس کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ان کے اندرونی حالات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی طبیعت کیسی ہے، اپنی پوزیشن باقی رکھنے اور متوقع درجات تک پہنچنے کے وہ کتنے حریص اور کٹر ہیں، چاہے اس سلسلہ میں خود خلیفہ مشکلات اور مصیبتوں کا شکار ہو جائے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کو ریشم کا کُرتا پہننے کی اجازت دے دی تھی، ایک دن عبدالرحمٰن رضؓ حضرت عمر رضؓ کے پاس آئے ان کے ساتھ ان کا نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے جسم پر ریشمی قمیص تھی۔ حضرت عمر رضؓ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا یہ کیا؛ اور گریبان میں ہاتھ ڈال کر نیچے تک قمیص چاک کر دی۔ عبدالرحمٰن رضؓ نے کہا کیا آپ نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ریشمی کپڑے پہننے کی اجازت دے رکھی ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا ہاں! میں جانتا ہوں، تمھاری ایک مجبوری پر تم کو اجازت دی گئی، لیکن تمھارے لڑکے کو تو اس کی اجازت نہیں۔

اس طرح حضرت عمر رضؓ کو خطرہ لگا رہتا کہ مہاجرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھوڑی سی دی ہوئی رخصت کو بڑھا کر زیادہ کر دیں گے۔ حضرت عمر رضؓ دنیا کے خطرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے امیر معاویہ رضؓ کو بحری جہاد سے روکتے رہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس احتیاط میں حضرت عمر رضؓ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بحری جہاد میں جس پر امیر معاویہ رضؓ کو بڑا اصرار تھا مواقع سے فائدہ اٹھانے کے امکانات رہا کرتے ہیں۔ جس کے لیے قریش ہر وقت پا بہ رکاب رہا کرتے، حضرت عمر رضؓ یہ اپنی ذمہ داری تصور فرماتے تھے، کہ وہ عام مسلمانوں کو قریشی نوجوانوں کی ان معرکہ آرائیوں سے دور رکھیں جن میں مواقع سے فائدہ اٹھا لینے کے وہ جذبات کام کر رہے ہوں۔ یہ تو آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضؓ کی خلافت نے قریشیوں کو ایک جدید امتیاز کا مالک بنا دیا تھا۔ حضرت عمر رضؓ اسی امتیاز میں خطرہ دیکھ رہے تھے کہ اس کی حدبندی کر دی جائے اور اس کو بے لگام نہ ہونے دیا جائے۔

حضرت عثمان رضؓ جس رعایا کے خلیفہ بنے اس کے ایک طبقے کا یہ حال تھا اور اس کے پیش نظر ذی النورین کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ فاروق اعظم رضؓ کی طرح شدت سے کام لیتے اور ممتاز مہاجر صحابہ رضؓ کو مدینہ میں روکے رہتے۔ قریشیوں سے اپنے اندیشوں کا اظہار کرتے رہتے اور ایک مقررہ حد سے ان کو آگے نہ بڑھنے دیتے۔ حکومت کے معاملات اور حکمرانی کے عہدوں پر عام عربوں بلکہ عام مسلمانوں میں سے

ان ہی افراد کو مقرر فرماتے جو ذمہ داری سنبھالنے کے پورے اہل ہوتے یا پھر نرمی کی راہ اختیار فرماتے اور قریش کے لیے راستہ صاف کر دیتے جس پر چل کر وہ ذاتی مفاد کی نہ ختم ہونے والی منزل پر پہنچتے، آگے کی سطروں میں آپ پڑھیں گے کہ حضرت عثمان رض نے اپنی مرضی سے کہیئے یا مجبور ہو کر یہی دوسرا راستہ اختیار کیا۔

انصار رعایا

حضرت عثمان رض کی رعایا میں دوسرا طبقہ انصار کا تھا، اسلام میں انصار کا درجہ بیان سے بے نیاز ہے۔ قرآن مجید میں ان کی تعریف محفوظ ہے۔ نیز نبی ؐ نے ان کے لیے رعایت کے جو احکام دیئے ہیں وہ بھی برحق و برقرار ہیں۔ تم یہ جانتے ہو کہ حضرت ابوبکر رض کی اس روایت کے بعد کہ "امامت قریش میں ہے" خلافت میں انصار کا حصہ نہیں رہا تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ صدیق اکبر رض نے فرمایا تھا "ہم امیر اور تم وزیر" چنانچہ حضرت ابوبکر رض انصار سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہی حال حضرت عمر رض کا بھی تھا۔ حضرت عثمان رض نے بھی انصار سے مشورہ لینے میں کبھی کوتاہی نہیں کی لیکن یہ تینوں خلفا ان انصار سے مشورہ لیا کرتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رض تھے لیکن انصار کی وہ نئی نسل جو صدیق اکبر رض کے زمانے میں قابل ذکر نہ تھی، لیکن حضرت عمر رض کے عہد میں وہ کچھ سمجھنے بوجھنے لگی تھی اور حضرت عثمان رض کے عہد میں تو اس کے احساس میں کافی شدت پیدا ہو چکی تھی، اس نئی نسل اور اس کے نوجوانوں کو عام عربوں میں کوئی امتیازی شان حاصل نہ تھی۔ حضرت عمر رض حکمرانی کے عہدوں کے سلسلے میں صرف قریش تک اپنی تلاش محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ کی نگاہِ انتخاب پورے عرب کی طرف اٹھتی تھی اور اگر فاروق اعظم رض زندہ رہتے تو وہ انصار کے نوجوانوں کو مطمئن کر دیتے کہ حکومت دوسروں کی طرح ان کے حقوق کا بھی خیال رکھتی ہے اور اس سلسلے میں اس کی طرف سے کوئی بے نیازی یا کوتاہی نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عمر رض اور حضرت ابوبکر رض کے طرز عمل سے ممتاز انصاری صحابہ رض پورے اخلاص کے ساتھ خوش تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام انصاری اور خاص طور پر نوجوان طبقہ قریش کی امتیازی سیادت اور چودھری پنے سے سخت تنگ اور نالاں تھا، اور کیوں نہ ہوتا۔ بدر کے موقع پر انصار ہی نے تو قریشیوں کو نیچا دکھایا تھا۔ مہاجرین کے ساتھ مکہ میں داخل ہونے والے اور ہر طرف سے آئے ہوئے انصار ہی تو تھے۔ ان حالات میں انصار کی تسلی اور ان کے سکون کا یہ بہت سامان تھا کہ حضرت عمر رض قریشیوں کے لیے بڑے سخت تھے اور ان کو عام مسلمانوں پر کوئی فوقیت اور امتیاز نہیں دینا چاہتے تھے۔ پس حضرت عثمان رض کے خلیفہ ہو جانے کے بعد انصار کے نقطۂ نظر کا دار و مدار خلیفہ کے طرز عمل پر تھا، اگر خلیفہ حضرت عمر رض کے نقش قدم پر چلا تو ان کو بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح دنیاوی امور میں حصہ لینے کا پورا پورا موقع ہوگا۔ اور اگر اس نے قریش کو ترجیح دی اور ان کی طرف داری کی تو انصار یہ سمجھنے پر

مجبور ہوں گے کہ یہ ایک مطلق العنان اور مطلبی سیادت ہے اور ان کا درجہ قریش کے بالمقابل تبعین کا درجہ ہے۔ اور وہ امامت کے علاوہ معاملات میں بھی ان کی برابری کے نہیں ہو سکتے۔ آگے چل کر آپ پڑھیں گے کہ حضرت عثمان رض نے جبراً قہراً یا خوشی خوشی قریش کو ترجیح دی۔ اور اس ترجیح کا انصار کے دلوں پر بہت برا اثر پڑا۔ جس کے نقوش بعد میں ہونے والے انقلابات اور فتنوں میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کی رعایا میں تیسرا گروپ

مذکورۂ بالا دو طبقوں کے علاوہ حضرت عثمانؓ کی رعایا میں ایک تیسرا گروپ ان عام عربوں کا تھا جو دل سے یا بادلِ نخواستہ مسلمان ہوئے تھے اور حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض نے ان کو جہاد اور فتوحات کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ یہ لوگ فتوحات کے بعد اپنے شہروں اور سرحدوں میں مقیم ہوگئے تھے۔ یہی لوگ ایک طرف مسلمانوں کی حفاظت کے لیے دیوار کا مرتبہ رکھتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کی فوجی طاقت تھے جس سے مزید فتوحات کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا، اسلام نے ان سب سے وعدہ کیا تھا کہ سب لوگ مساوی ہیں، برابری کا درجہ رکھتے ہیں، ہاں فضیلت کی چیز تقویٰ، اہلیت اور آزمائش ہے پس یہی عام عرب در حقیقت اسلام کا سرمایہ اور اس کی دولت تھے جیسا کہ حضرت عمر رض فرمایا کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں نے ممالک فتح کیے، دشمنوں کو زیر کیا، اللہ کا دین دنیا کے گوشوں تک پہنچایا، اس لیے یہی حقدار ہیں ان کے سوا کسی کو ترجیح نہ دی جائے۔

لیکن ان تمام خصوصیات کے بعد چونکہ یہ نئے نئے مسلمان تھے، عہدِ جاہلیت سے قریب ہیں، ابھی وہ بھولے نہیں کہ اُن میں سخت دشمنی کے، عصبیت اور تفاخر کے جذبات ہیں، تکبر اور غرور کے جو اوصاف وہ رکھتے تھے اب ان میں بعض جدید امتیازات کا اضافہ ہو چکا ہے جو پہلے سے زیادہ شاندار ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے لیے مدبرانہ سیاست یہی تھی کہ اول ان کے دلوں سے وہ پرانی عصبیت اور گھمنڈ مٹایا جائے، پھر خالص اسلامی تربیت کے اثرات ان میں پیدا کیے جائیں اور عدل و مساوات کی وہ عملی مثال ان کے سامنے پیش کی جائے جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ حضرت عمر رض نے اسی سیاست کو عملی جامہ پہنانا چاہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حتی الامکان دلوں کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی عصبیت اور دماغوں میں بیٹھی ہوئی کدورت کو دور کیا۔ ان شاعروں تک کو متنبہ کیا جو اشعار و قصائد میں عہد جاہلیت کے مفاخر نظم کرتے تھے بڑے بڑے شہروں میں صحابہ رض کو مقرر فرمایا کہ وہ شہر والوں کو قرآن مجید کی تعلیم اور احادیثِ نبویؐ کا درس دیں اور دین کی تعلیمات انھیں سکھائیں اور اس طرح ایک خالص اسلامی سماج پیدا کریں۔ حضرت عمر رض نے

ایک فریق کو دوسرے پر فوقیت اور امتیاز کا موقع نہیں دیا۔ اور نہ حکومت کے معاملات میں کسی ایک قبیلے اور محلے کو ترجیح دی بلکہ عام لوگوں کو بالکل مساویانہ مواقع پیش کیے۔ چنانچہ گورنری کے لیے مصر، ربیعہ اور یمن سے افراد کا انتخاب کیا۔ پھر ان سب پر سخت نگرانی رکھی۔ حضرت عثمان رضؓ کے فرمانوں میں تم نے پڑھا ہوگا کہ وہ یعنی حضرت عثمان رضؓ اور ان کے گورنر، فاروق اعظم رضؓ کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے لیکن آگے چل کر تم دیکھو گے کہ حضرت عثمان رضؓ نے گورنروں کو ایک سال تک باقی رکھنے کی وصیت کے پورا ہوتے ہی انکی پالیسی مجبور ہو کر یا خوشی سے بہر حال بدل دی اور قریش عربوں پر ممتاز اور مسلط ہو گئے۔ چنانچہ بڑے شہروں اور اونچے عہدوں پر قریش ہی مقرر کیے گئے، دوسروں کو یہ موقع نہیں دیا گیا۔

حضرت عثمان رضؓ کی رعایا کا چوتھا عنصر

مفتوحہ ممالک کے شہری حضرت عثمان رضؓ کی رعایا میں چوتھا عنصر تھے۔ ان کے بارے میں اسلام کا مسلک بالکل صاف ہے کہ جو کچھ ان پر واجب ہو ان سے وصول کیا جائے، اگر وہ اپنا حق ادا کر دیں، تو پھر ان کے لیے وہی تمام حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ اس مسلک سے بخوبی واقف تھے اور جیسا کہ ان کے فرمانوں میں بتایا گیا ہے۔ وہ اور ان کے گورنر اس مسلک کے پابند بھی تھے۔

لیکن حضرت عثمان رضؓ کے دور میں ذمیوں کی کوئی آواز کہیں سے کانوں میں نہیں پڑتی۔ اس لیے نہیں کہ ان کے ساتھ اسلامی مسلک کے مطابق سلوک کیا گیا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مغلوب اور بے بس تھے اور سیاست میں قابل ذکر حصہ لینے کا ان کو موقع نہ تھا، ورنہ کوئی بتائے کہ اس گفتگو کا کیا مطلب ہے جو ایک دن حضرت عثمان رضؓ اور حضرت عمرو بن العاص رضؓ کے درمیان ہوئی، حضرت عثمان رضؓ، عمرو بن العاص رضؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قد درّت تلك اللقاح بعدك يا عمرو	اے عمرو! تمہارے بعد اس اونٹنی نے تو خوب دودھ دیا۔

عمرو بن العاص رضؓ نے جواب دیا کہ:۔

نعم وهلكت فصالها۔	ہاں مگر بچے تو سب مر گئے۔

حضرت عثمان رضؓ کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ بیت المال میں حضرت عمرو بن العاص رضؓ کے زمانۂ گورنری میں جو رقم آیا کرتی تھی وہ عثمانی رضؓ عہد کے گورنر ابن ابی سرح کی رقم سے کم تھی، حضرت عمرو بن العاص رضؓ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ آمدنی کا یہ اضافہ ذمیوں پر زیادتی کی بنا پر تھا۔ پھر اس واقعے

سے دو ہی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں، یا تو عمرو بن العاص رض خراج کی آمدنی کا کچھ حصہ اپنی ذات کے لیے بچا لیتے ہوں گے اور بیت المال میں داخل نہ کرتے ہوں گے۔ یا پھر یہ کہ ابن ابی سرح ذمیوں سے اور اہل معاہدہ سے مقررہ رقم سے زیادہ وصول کرتے ہوں گے اور یہ دونوں باتیں بُری ہیں۔

اور پھر معاملہ رعایا کے ساتھ ناہموار پالیسی تک محدود نہیں رہا۔ حضرت عمر رض تو قریش کے لیے نہایت سخت تھے، وہ قریش کی سطح عام عربوں کی سطح کے برابر تصور فرماتے تھے، وہ کسی قبیلے کو دوسرے قبیلے پر کوئی فضیلت اور فوقیت نہیں دیتے تھے۔ حضرت عثمان رض یہ مساوات بھی قائم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ انھوں نے قریش کو تمام عربوں پر قصداً یا سہواً فوقیت دی بلکہ وہ تو ایک قبیلہ قریش میں بھی مساوات باقی نہ رکھ سکے اور اس کی ایک پارٹی کو دوسری پارٹی پر ممتاز کر دیا اور دانستہ یا نادانستہ ایک کو بڑھایا دوسرے کو گھٹایا، کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رض کو کچھ خطرہ سا تھا کہ مساوات پورے طور پر باقی نہ رہ سکے گی اور انصاف نہ چل سکے گا اسی لیے حضرت عثمان رض سے انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا تھا کہ اگر خلیفہ ہو جانا تو عوام پر بنی امیہ اور ابو معیط کا خاندان مسلط نہ کر دینا اسی طرح آپ نے حضرت علی رض سے بھی چاہا تھا کہ اگر خلافت کی مسند مل جائے تو عبدالمطلب اور بنی ہاشم کے ہاتھ میں عوام کی لگام نہ دے دینا۔ حضرت عثمان رض نے حضرت عمر رض کی بات نہیں مانی اور لوگوں کی گردنوں پر بنی امیہ اور ابو معیط کو سوار کر دیا، کہا جاتا ہے کہ حضرت علی رض نے بھی فاروق اعظم رض کا کہنا نہیں مانا اور جب وہ خلیفہ ہوئے تو اپنے چچا کی اولاد میں سے تین کو بصرہ، مکہ اور یمن پر حاکم بنا دیا اور مالک اشتر کو کہنا پڑا "جب یہی کرنا تھا تو بوڑھے کی جان کیوں لی گئی"؛ لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک حضرت عثمان رض کے عمل اور حضرت علی رض کے اقدام میں بہت بڑا فرق ہے۔ خود حضرت علی رض نے گورنروں کے بارے میں جب حضرت عثمان رض پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ حضرت عمر رض نے بھی تو کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ رض کو مقرر کیا تھا حالانکہ ان میں کوئی بات نہ تھی۔ اور پھر انھوں نے معاویہ رض کو حاکم بنایا۔ اس جواب پر حضرت علی رض نے فرمایا کہ حضرت عمر رض اپنے گورنروں پر رعب اور شدید نگرانی رکھتے تھے اور تمھارے گورنر تو من مانے حاکم ہیں، ان کو تمھاری کچھ پروا نہیں اپنی طرف سے احکام جاری کرتے ہیں اور نام خلیفہ کا لگاتے ہیں اور آپ ان کے احکام میں کچھ ردوبدل بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت علی رض کا طرز عمل اپنے عزیز گورنروں کے ساتھ حضرت عمر رض کا سا تھا۔ وہ ان کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ خلاف ورزی یا کوتاہی کی صورت میں کوئی طاقت معزولی سے ان کو روک نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ حضرت عثمان رض اس درجہ بے بس تھے کہ بنی امیہ اور آل معیط میں سے کسی بھی گورنر کو اس وقت تک معزول نہ کر سکے جب تک رعایا نے مجبور نہ کر دیا۔

بہرحال حضرت عثمان رضؓ کی رعایا وہی تھی جو حضرت عمر رضؓ کی تھی اور اس میں خفیف سی تبدیلی اس وقت ہوئی جب عثمانی دور کا ایک حصہ گذر چکا اور حضرت عمر رضؓ کا مسلک وہ واحد راہ تھی جس پر چل کر یہ رعیت کامیاب اور بامراد ہوتی۔

لیکن ہر بدعی کے لیے دار ورسن کہاں سب لوگ فاروق کی سیرت نہیں پا سکتے۔ ہر ایک میں حضرت عمر رضؓ کی وہ شدت جو حق کی راہ میں نرمی نہیں جانتی، جو انصاف اور مساوات قائم کرنے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔ کہاں سے آئے۔ خود حضرت عثمان رضؓ بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے مخاطبین سے جبکہ دسترخوان پر نرم غذا حاضر تھی فرمایا۔ "ہر آدمی عمر رضؓ کی سی طبیعت کہاں سے لائے"۔ اور ایک مرتبہ بیت المال سے داد و دہش پر ملامت کرنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم میں عمر رضؓ جیسا کون ہے؟" اور ایک مرتبہ نبیؐ کے منبر سے کھڑے ہو کر فرمایا۔

> "ابن الخطاب نے تمھیں زدوکوب کیا، منہ توڑ جواب دیا، تم ان سے ڈرتے رہے اور ان سے ان باتوں پر خوش رہے، جن پر مجھ سے ناراض ہو اور یہ اس لیے کہ میں نے تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا، تمھارے خلاف زبان نہیں کھولی۔"

پس دونوں میں بڑا فرق ہے۔ طبیعت میں فرق ہے، مزاج میں فرق ہے اور عمر میں بھی فرق ہے لیکن یہ فرق فتنے کی جڑ نہیں ہیں، فتنے کے اسباب کچھ اور بھی ہیں، جن کا دفع کرنا حضرت عثمان رضؓ کے بس سے باہر تھا۔ آئندہ فصل میں ہم بعض ان اسباب پر روشنی ڈالیں گے۔

اپنے اختیار سے گورنروں کا تقرّر

خلافت کا پہلا سال ختم ہوا اور حضرت عمر رضؓ کی یہ وصیت کہ گورنروں کو ایک سال تک ان کے عہدوں پر باقی رکھنا، پوری ہوئی، اب حضرت عثمان رضؓ کو آزادی ملی اور وہ حاکموں کے تقرر اور معزولی میں اپنی طبیعت اور اقتدار سے کام لینے لگے۔ اس براہِ راست اقدام میں کچھ جلد بازی ضرور تھی لیکن پھر بھی کافی غور و فکر کے بعد اقدام کیا گیا تھا، آپ نے ایسے صوبوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جن کی سیاسی اعتبار سے کوئی اہمیت نہ تھی اور نہ انتظامی اور جنگی نقطۂ نظر سے وہ قابل ذکر تھے چنانچہ ان میں حضرت عمر رضؓ کے مقرر کردہ گورنروں کو ہی آپ نے برقرار رکھا، ہاں ضرورت پڑنے پر کوئی معمولی سی تبدیلی

بلاکسی خاص توجہ اور اہتمام کے کردی۔ اس زمانے میں صوبوں کی حیثیتیں مختلف تھیں، بعض صوبے سیاسی انتظامی اور جنگی نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے، خصوصاً وہ تمام علاقے جو مسلمانوں نے فتح کیے تھے اور بعض وہ جو رومی مملکت سے کٹ چکے تھے۔ اور جن پر فارسی عنصر غالب تھا، ایسے اہم صوبے چار تھے۔ شام، مصر، کوفہ، بصرہ، ان میں سے ہر صوبہ ایسا تھا جس کی سرحدیں حفاظت اور مدافعت کی محتاج تھیں، ہر ایک کے سامنے دارالحرب تھا۔ جس پر مسلمانوں کو گہرے غور و خوض کی ضرورت تھی، شام کے سامنے خود رومی آبادیاں اور سمندر کی سطح تھی۔ مصر کے بالمقابل دریا کی موجیں اور شمالی افریقہ تھا۔ عراق کے دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کے سامنے فارس کے مفتوحہ اور غیر مفتوحہ علاقے تھے، اسلامی قوت کے یہی چار مرکز تھے، انھیں میں اسلامی فوجیں مقیم تھیں، انھیں کے بالمقابل وہ سرحدیں تھیں جن میں لڑنے والی فوجیں کبھی کوچ اور کبھی قیام کرتی رہتی تھیں۔ یہی چار صوبے مسلمانوں کی دولت اور ثروت کے بھی سرچشمہ تھے، ان ہی میں تہذیب و تمدن کا شاندار اور پُر بہار دور تھا، ان میں زرخیز زمینیں تھیں جن میں خدا کا دیا بہت کچھ پیدا ہوتا۔ یہی صوبے خراج کی وصولی کے مرکز تھے، ان ہی میں وہ ذمی آباد تھے جو جزیہ ادا کرتے تھے۔ اور پھر یہی وہ صوبے تھے جنھیں کہنا چاہیے کہ فتوحات کے دست و بازو تھے۔ یہیں ہر سال فاتحین مالِ غنیمت لاتے اور یہیں سے اس کا پانچواں حصہ مدینہ منورہ بھیجا جاتا۔ پس اگر عرب فوجی قوت کے اعتبار سے اسلام کی ایک طاقت تھے تو یہ چاروں صوبے مالیاتی نقطۂ نظر سے اسلام کا غیر معمولی سرمایہ تھے۔ ان حالات کے پیش نظر کوئی تعجب کی بات نہیں اگر حضرت عثمانؓ نے ان صوبوں کی طرف خاص توجہ فرمائی اور دوسرے ایسے صوبوں کو نظر انداز کر دیا جن کی کچھ اہمیت نہ تھی۔ بلاشبہ مکہ مکرمہ، طائف اور یمن بھی صوبے تھے اور ان کا بھی درجہ ہے لیکن اول تو یہ کہ یہ صوبے کسی میدانِ جنگ کی زد میں نہ تھے اور پھر وہ آمدنی کا ذریعہ بھی نہ تھے، ان سے کسی ایسے ساز و سامان اور ایسی قوت کی توقع نہ تھی جو کسی نئی حکومت کے استحکام کا ضروری جُز ہو سکے، ان صوبوں کی اہمیت اور قدر و قیمت فتوحات سے قبل غیر معمولی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کوشش میں مصروف تھے کہ پورے عرب ملک میں اسلام پھیلا دیں لیکن فتوحات کے بعد جب کہ عربی سرزمین اللہ کی پرستش سے معمور ہوگئی اور اسلام محفوظ ہوگیا تو ان کی اہمیت دوسرے درجہ میں آگئی اور پہلا درجہ ان صوبوں کو ملا، جن کی فتح میں مسلمانوں نے ان عربی صوبوں سے کہیں زیادہ جانی اور مالی قربانیاں پیش کی تھیں ان ہی باتوں کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ مدینہ چھوڑ کر جانے والے مسلمانوں نے مکہ، طائف یا یمن کا رخ نہیں کیا بلکہ عراق، شام، مصر کا ارادہ کیا۔ ان جانے والوں میں جو نیک اور مخلص تھے ان کے پیش نظر فتوحات

میں وسعت کے ساتھ ساتھ سرحدوں کی حفاظت اور آخرت کا ثواب تھا اور جو کاروباری تھے وہ دنیاوی مقاصد رکھتے تھے ۔ تاجر تجارت کرتا اور کاشتکار زراعت ۔ اس طرح مختلف طبقے مختلف طریقوں سے فوائد حاصل کرنے میں مصروف تھے ۔

کوفہ پر سعد بن ابی وقاص رض کا تقرر اور معزولی

حضرت عمر رض نے جب وفات پائی تو کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ ثقفی تھے اور بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری رض ، ان دونوں کو حضرت عثمان رض نے پہلے سال باقی رکھا لیکن سال کے خاتمہ پر مغیرہ رض کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ پر سعد بن ابی وقاص رض زہری کو والی بنایا ۔ یہ تقرر حضرت عثمان رض نے حضرت عمر رض کی اس خواہش کی بنا پر کیا تھا کہ " میں نے سعد بن ابی وقاص رض کو کسی خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا ۔ میرے بعد اگر وہ خلیفہ نہ ہو سکے تو ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے ۔ لیکن سعد بن ابی وقاص رض کوفہ کی گورنری پر ایک سال اور کچھ دن سے زیادہ نہ رہ سکے ۔ اس کے بعد حضرت عثمان رض مجبور ہوئے کہ ان کو معزول کر دیں ۔

مؤرخوں کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رض سعد بن ابی وقاص رض کو معزول کر دینے پر مجبور ہو گئے ۔ ہوا یہ کہ عبداللہ بن مسعود رض بیت المال کے خزانچی اور سعد بن ابی وقاص رض کے درمیان اختلاف ہوا ۔ ایسا اختلاف جس نے حضرت عثمان رض کو دونوں پر سخت برہم کر دیا اور آپ نے دونوں کے خلاف ارادہ فرما لیا لیکن پھر رک گئے اور سعد بن ابی وقاص رض کی معزولی پر اکتفا کیا ۔

اس اختلاف کی بنیاد بھی واقعۃً حیرت انگیز ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سعد بن ابی وقاص رض نے بیت المال سے کچھ قرض لیا اور اس کا وثیقہ لکھ دیا ۔ اب عبداللہ بن مسعود رض نے قرض ادا کرنے کا مطالبہ کیا ، حضرت سعد رض نے مہلت کی درخواست کی ۔ عبداللہ بن مسعود رض اس پر راضی نہیں ہوئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف کوفہ والوں کی ایک جماعت کی حمایت حاصل کی ۔ ابن مسعود رض اپنی حامی جماعت کی امداد سے چاہتے تھے کہ سعد رض قرض ادا کر دیں اور سعد رض کی کوشش یہ تھی کہ اپنے حامیوں کے ذریعہ ابن مسعود رض سے مہلت حاصل کریں ۔ بالآخر دونوں اکٹھا ہوتے ہیں اور بات گستاخی کی حد تک پہنچتی ہے ۔ بقول راویوں کے حضرت سعد رض ارادہ کرتے ہیں کہ ابن مسعود رض کے حق میں بددعا کریں ۔ یہ دیکھ کر ابن مسعود رض گھبراتے ہیں ۔

اور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے دعا کی ہے کہ "جب کبھی سعد رضؓ کوئی دعا کرے تو اسے قبول کریجیو" راوی کہتے ہیں کہ حضرت سعد رضؓ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا "اللّٰھم رب السمٰوات والارض" اتنا سن کر ابن مسعود رضؓ نے کہا "سعد رضؓ! منہ سے اچھا کلمہ نکالنا" یہ کہہ کر فوراً وہاں سے لوٹ آئے۔ اب معاملہ حضرت عثمان رضؓ تک پہنچا آپ دونوں پر سخت غصہ ہوئے اور دونوں کے خلاف کارروائی کا ارادہ کیا۔ لیکن بعد میں رک گئے، اور سعد رضؓ کو معزول کر دیا اور ان سے جو کچھ ان پر تھا وصول کر لیا اور کوفہ کے لیے ایک نئے گورنر کا تقرر کر دیا۔

تمام راوی اس واقعہ پر متفق ہیں لیکن میں اس مقام پر انتہائی احتیاط برتنا چاہتا ہوں۔ میری اس احتیاط کے کئی اسباب ہیں۔ حضرت سعد رضؓ کے متعلق حضرت عمر رضؓ کی آنے والے خلیفہ سے یہ سفارش تھی کہ انھیں موقع دیا جائے، اور یہ کہ انھوں نے کسی خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا تھا۔ اور مذکورہ بالا قصے کا کم از کم اتنا تو مفہوم ہے کہ حضرت سعد رضؓ نے بیت المال سے کچھ قرض لیا تھا اور اس قرض کی ادائیگی میں تاخیر کر رہے تھے یا ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جسے فاروقِ اعظم رضؓ نے مجلس شوریٰ کے لیے پسند کیا ہو۔ جسے منصبِ خلافت کا امیدوار بنایا ہو اور اگر خلیفہ نہ ہو سکے تو اس کے تعاون کو ضروری قرار دیا ہو، وہ ایسی کمزوری دکھائے اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضؓ سے یہ ممکن نہیں کہ عوام کی بھلائی اور خیرخواہی کے خلاف کسی ایک شخص کے لیے ذاتی فائدے کے خواہاں ہوں، انھوں نے تو ہمیشہ عام مسلمانوں کے مفاد کو مقدم رکھا۔ بلاشبہ جب وہ خلیفہ سے سفارش کر رہے تھے کہ سعد رضؓ سے کام لینا، ان کو گورنر بنانا تو اس کا مطلب سعد رضؓ کو خوش کرنا یا ان کی طرف داری کرنا یا اپنے ساتھیوں پر ان کو مقدم کرنا نہ تھا۔ بلکہ آپ خلیفہ اور مسلمانوں کو مخلصانہ مشورہ دے رہے تھے اور ہدایت فرما رہے تھے کہ سعد کی قابلیت اور جنگی معاملات میں ان کی مہارت سے فائدہ اٹھانا، اس لیے کہ ایرانی علاقوں کے معاملات مسلمانوں کی منشاء کے مطابق اطمینان بخش نہ تھے، ایرانی اقتدار کا بڑی حد تک خاتمہ ضرور ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کی شوکت ٹوٹی نہ تھی، کسریٰ یزدگرد شکست کھا چکا تھا لیکن وہ مارا نہیں گیا تھا اور نہ قید کیا جا سکا تھا، وہ اپنے ملک میں تھا اور شہروں اور دیہاتوں میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ فارس میں بہت سے شہر تھے۔ بعض تو ایسے تھے جہاں اب تک مسلمان پہنچ ہی نہ سکے تھے اور بعض ایسے تھے جن سے مسلمانوں کی صلح ہو چکی تھی۔ لیکن مطلع ہنوز غبار آلود تھا۔ ایسے مقامات، فرصت کے منتظر اور وقت کی تاک میں تھے کہ جیسے ہی موقع ملے، بغاوت کر بیٹھیں، سرزمین ایران پر فتوحات کی ابتدا ہوئی۔ تو بڑی

تیزی کے ساتھ سلسلہ آگے بڑھا۔ لیکن فتح کی تکمیل بہر حال نہیں ہو سکی۔ اور معرکۂ قادسیہ کے مرد میدان سعدؓ ابن ابی وقاص ہی کسریٰ کی حکومت کے فاتح تھے۔ ایسی حالت میں یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ حضرت عمرؓ کے دماغ میں سعدؓ بن ابی وقاص کے متعلق یہ خیال آئے کہ فتوحات کا جو سلسلہ انھوں نے شروع کر دیا تھا وہی اس کی تکمیل کر دیں اور غالب گمان ہے کہ اگر فاروق اعظمؓ زندہ رہتے تو سعدؓ کو پھر کوفہ پر واپس کر دیتے کہ وہ آگے بڑھیں یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں فتح کی تکمیل ہو جاتی۔ اور یہ سعدؓ اسلام کی طرف سبقت کرنے میں مشہور ہیں، چنانچہ وہ اپنے متعلق کہا کرتے تھے کہ میں تو ثلث الاسلام ہوں، ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں صدیق اکبرؓ کے بعد مسلمان ہوا ہوں اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکرؓ اور ان کے بعد میں اور اگر حضرت ابو بکرؓ اور زید ابن حارثہؓ کے بعد وہ مسلمان ہوئے ہوں تو وہ ان تین میں سے ایک ہیں جو سب سے پہلے اسلام لائے اور پھر حضرت سعدؓ باتفاقِ محدثین بطن رابغ جانے والے فوجی دستہ " سریہ" کے سب سے پہلے تیر انداز ہیں۔ یہ دستہ عبیدہؓ ابن حارث بن عبدالمطلب کی قیادت میں جا رہا تھا۔

علاوہ بریں حضرت سعدؓ ہی وہ صحابی ہیں جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد کے موقع پر ان کی پامردی اور استقلال کے پیش نظر فرمایا " فداہ امی وابی " کسی اور صحابی کے لیے آپ نے ماں اور باپ دونوں کو جمع نہیں کیا، سعدؓ بہترین تیر انداز تھے اور اُحد کے معرکے میں سرفروش مجاہدوں کے ساتھ انھوں نے اپنے تیروں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی تھی۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے " ارم سعد ابی وامی " پس جو شخص ایسی قسمت والا ہو کہ اسے تہائی اسلام کہا جائے، اسلام کا پہلا تیر انداز کہا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اپنے ماں باپ فدا کریں، اس سے خوش ہوں اور اسے ان دس آدمیوں میں شمار فرمائیں جن کیلیے جنت کی ضمانت دی جو ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دینے والا اور قادسیہ کا فاتح ہو۔ جس کی حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ میں حاضری کا حکم دیا ہو۔ جس کو خلافت کا امیدوار بنایا ہو، جسے خلافت نہ ملنے پر گورنر بنانے کی خواہش ظاہر کی ہو، جس کے مقدر میں یہ ساری فضیلتیں اور خوبیاں ہوں، ممکن نہیں وہ بیت المال کے قرض کے بارے میں خواہ کم ہو یا زیادہ ٹال مٹول سے کام لے۔ ممکن نہیں کہ اس کے بارے میں عبداللہ بن مسعودؓ شک و شبہ کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت عثمانؓ اس پر غصے ہوں، اس کے خلاف اقدام کا ارادہ کریں اور پھر بقایا وصول کر کے معاف کر دیں۔ غالب گمان تو یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ کو سعدؓ کے لیے کسی بھی گورنری کی طرف متوجہ نہیں کیا بلکہ خاص طور پر کوفہ کی گورنری کا اشارہ کیا ہے اس لیے کہ وہی

ایک ایسا شہر تھا جس میں سعد رضؓ کا قیام ضروری تھا تاکہ فتوحات کی تکمیل کر کے جنگ کا خاتمہ کیا جاسکے، ابن مسعود رضؓ کی سعد رضؓ کے ساتھ بد گمانی بھی حقیقت میں حیرت انگیز ہے وہ جانتے تھے کہ سعدؓ السابقون الاولون میں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اور شیخینؓ کی نظر میں ان کا خاص مرتبہ ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے، اس لیے کہ ابن مسعود رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بہت زیادہ رہے، صحابہؓ میں سب سے زیادہ حدیثوں کے راوی، سب سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ، صحابہؓ میں سب سے زیادہ اس بات کے واقف کہ کس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا رائے ہے، اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ سعد رضؓ کے متعلق شک کریں اور قرض ادا کرنے کا بار بار تقاضا کریں، یہاں تک کہ جب وہ بد دعا کرنے کا ارادہ کریں تو ڈریں اور گھبرا کر ان کو رضامند کرلیں اور بہت جلد وہاں سے چل دیں۔ بات یہ ہے کہ سعدؓ بن ابی وقاص فتنے کے موقع پر غیر جانب دار رہے اور فریقین میں سے کسی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور کہا میں اس اختلاف میں اسی وقت حصہ لوں گا جب مجھے کوئی ایسی تلوار لا دے جو خود بولے کہ فلاں فریق حق پر ہے اور فلاں حق پر نہیں۔ ان کی یہی غیر جانب داری اس عجیب و غریب قصے کی بنیاد ہے۔ اگر سعد رضؓ حضرت علی رضؓ کے حامیوں کی طرف داری کرتے تو یقیناً شیعہ ان کی طرف سے جواب دہی کرتے اور اگر وہ حضرت عثمانؓ کے حامیوں کی طرف داری کرتے تو وہ ان کی طرف سے مدافعت کرتے، لیکن سعد رضؓ نے دونوں برسرِ پیکار جماعتوں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جماعتوں کے لوگ سعد رضؓ سے کنارہ کش رہے اور کسی نے ان کی طرف سے مدافعت نہیں کی۔

ولید بن عُقبہ کا تقرّر اور اس کے نتائج

میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حضرت سعد رضؓ کی معزولی کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ بنی امیہ اور ابو معیط کے خاندان والے حکومت کے عہدے حاصل کرنے میں عجلت سے کام لے رہے تھے، اور اس سلسلے میں ہر قسم کی تدبیریں اور حیلے کر رہے تھے اور حضرت عثمان رضؓ پر دباؤ ڈالتے تھے، کہ وہ ان کے مقاصد کے لیے راہیں نکالیں اور مواقع فراہم کریں۔ اس بات کا پتہ اس طرح بھی چلتا ہے، کہ سعد رضؓ کی معزولی کے بعد حضرت عثمان رضؓ نے بڑے بڑے انصار و مہاجر صحابہ رضؓ میں سے کسی کو کوفے کا

گورنر مقرر نہیں کیا، نہ طلحہ رضہ کو، نہ زبیر رضہ کو، نہ عبدالرحمٰن رضہ کو، نہ محمد بن مسلمہ رضہ کو، نہ ابوطلحہ رضہ کو بلکہ ولیدؓ بن عقبہ بن ابی معیط کو موقع دیا۔ حالانکہ خود عام مسلمان ولید بن عقبہ سے مطمئن نہ تھے اس لیے کہ اس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دیا اور آپؐ پر بہتان باندھا، اسلام کے بعد کفر کی آلائش سے آلودہ ہوا۔ اللہ نے قرآن میں آیت نازل کی:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ -

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنی المصطلق میں اس تصدیق کے لیے بھیجا کہ کیا واقعی اس قبیلہ کے لوگوں نے صدقات کے ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے! تو ولید نے آکر اطلاع دی کہ ہاں یہ خبر صحیح ہے۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقابلے کی خاطر نکلے، تو راہ میں ولید کی مکاری کھل گئی اور خدا نے حقیقت حال سے باخبر کر دیا۔ پھر اس کے بعد ولید اسی وقت اسلام لایا جب مسلمان ہوئے بغیر چارہ نہ تھا اور حتی الامکان اپنی اصلاح کر لی، کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر رضہ نے بھی تو ولید کو بنی تغلب سے صدقات وصول کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ اور انکے کسی حاکم کا ولید کو جزیرہ کے کسی دیہاتی حصہ میں ایک نصرانی قبیلے سے صدقات وصول کرنے پر مقرر کرنا اور حضرت عثمان رضہ کا سب سے بڑے اسلامی شہر پر جس کی کئی سرحدیں ہوں اس کو گورنر بنا دینا، اور وہ بھی سعد بن ابی وقاص رضہ کی جگہ پر، دونوں میں بڑا فرق ہے۔

جن لوگوں نے کوفہ کی گورنری پر ولید کے تقرر کو نامناسب خیال کیا، انھوں نے کوئی دور کی بات نہیں کی اس لیے کہ کوفہ کی گورنری بہرحال بڑی اہم خدمت تھی۔

ایک اور بات جو اس سارے قصے کو جس پر حضرت سعد رضہ کی معزولی اور ولید کے تقرر کی بنیاد ہے مشکوک بنا دیتی ہے یہ ہے کہ بیت المال کے معاملات میں خود حضرت عثمان رضہ کی روش مدینہ منورہ میں اس بات سے زیادہ خطرناک ہے جس کو حضرت سعد رضہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے ایک عزیز کو ایک بڑی رقم عطیہ دینا منظور کر لیا۔ لیکن خزانچی نے رقم کی بڑی مقدار کے پیش نظر دینے سے انکار کر دیا، حضرت عثمان رضہ نے اصرار کیا لیکن خازن بدستور اپنی بات پر اڑا رہا۔ حضرت عثمانؓ نے دورانِ بیان میں جس کا تذکرہ ہم موقع پر کریں گے، کہا کہ تم کو پس و پیش کا کیا حق ہے؟ "تم تو ہمارے خازن ہو۔" خزانچی نے جواب میں کہا۔ میں اپنے آپ کو خازن خیال نہیں کرتا، آپ کا خازن تو آپ کا کوئی غلام ہوگا۔ میں تو مسلمانوں کا خازن ہوں، اس کے بعد وہ بیت المال کی کنجیاں منبر نبویؐ پر رکھ کر اپنے گھر بیٹھ رہا۔

پس جب حضرت عثمان رض کا عمل بیت المال سے ایسا متعلق ہے تو کس قدر حیرت کی بات ہوگی کہ وہ سعدؓ سے محض اس لیے ناراض ہوں کہ انھوں نے بیت المال سے کچھ قرض لے لیا تھا اور اس کی ادائگی کے لیے مہلت طلب کر رہے تھے۔ جس طرح حضرت عمر رض نے سعد رض کو کسی خیانت کی بنا پر برطرف نہیں کیا تھا، ہمارا خیال ہے اسی طرح حضرت عثمان رض نے بھی ان کو کسی خیانت یا ایسے سبب کی بنا پر برطرف نہیں کیا جس کا نزدیک یا دور سے کوئی تعلق خیانت سے رہا ہو، انھوں نے حضرت عمر رض کی وصیت پر عمل کیا اور اس کے بعد سعد رض کو اس لیے معزول کر دیا کہ ان کی جگہ ابو معیط کے خاندان کے ایک آدمی کو مقرر کر دیں۔ اور یہ بات ہمیں تسلیم کرنا ہوگی کہ ولید نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اخلاص اور آزمائش کی غیر معمولی مثالیں پیش کیں، سرحدوں کی حفاظت اور فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی بلکہ اس سلسلے میں اس کے کارنامے خود اس کی زندگی میں اور مرنے کے بعد عوام کا موضوع سخن رہے۔ اس نے کوفہ کے عوام پر تدبر، پامردی اور حوصلے کے ساتھ حکومت کی، امن عامہ برقرار رکھا، نئے خون والے مفسد نوجوانوں کا صفایا کیا، جو کسی نظام کا نہ احترام کرتے تھے اور نہ دین کا وقار جانتے تھے۔

ایک مرتبہ چند نوجوانوں نے ایک کوفی جوان پر زیادتی کی اور اسے مار ڈالا۔ ولید نے ان سے مواخذہ کیا اور ان پر حد جاری کی۔ چنانچہ اپنی کوٹھی کے سامنے ان کی گردنیں اڑا دیں، بعض راوی خیال کرتے ہیں کہ ولید کے اس اقدام نے مقتول کے قاتلوں کے سرپرستوں کو ولید کا دشمن بنا دیا اور ان کے دلوں میں عداوت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ چنانچہ وہ ولید کی لغزشوں کی تلاش میں رہنے لگے اور اس کے خلاف تہمتیں تراشنی شروع کر دیں اور لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے لگے، بالآخر ان میں سے ایک ولید کی مجلس تک جا پہنچا اور داستان سرائی شروع کر دی، قصہ گوئی میں رات کافی گذر گئی، اور ولید کو نیند آ گئی، تب اس داستان سرا نے ولید کی انگلی سے اس کی انگوٹھی نکال لی اور اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ حضرت عثمان رض کی خدمت میں انگوٹھی سمیت حاضر ہوا، پھر دونوں نے اس بات کی شہادت دی کہ ولید نے شراب نوشی کی ہے۔

اس واقعہ کا بناوٹی ہونا کسی بیان اور تشریح کا محتاج نہیں، کوئی امیر قصہ گویوں کی موجودگی میں سو نہیں جاتا اور وہ بھی ایسی گہری نیند کہ کوئی انگلی سے انگوٹھی اتار لے اور اسے خبر تک نہ ہو اور نہ اس کے خادم اور پہرہ داروں کو پتہ چل سکے۔ اور پھر ولید اگر اتنا ہی بے پروا اور غافل حاکم تھا، جو اس انگوٹھی کے نکل جانے کی خبر نہ رکھتا ہو، جس سے اپنے فرمانوں پر مہر لگاتا تھا۔ خلیفہ کو اور سرحد کے محافظوں کو

خطوط لکھتا تھا تو اس کے دور اندیش، بیدار مغز اور عالی حوصلہ ہونے کے کیا معنی! یہ بات تو ایسی ہے جیسے ولید کے مخالف کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے دوست اور اپنے شاعر ابوزبید کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کیا کرتا تھا۔ یہ ابوزبید وہی ہے جس کی ملاقات ولید سے اس وقت ہوئی جب وہ بنی تغلب میں صدقات کی وصولی پر مقرر تھا اور اس کے ماموؤں کے ساتھ اس کا جو جھگڑا تھا اس میں انصاف کر کے اس کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ابوزبید ماں کی طرف سے تغلبی اور باپ کی طرف سے طائی تھا اور مذہباً عیسائی۔ ولید جب کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو وہ اس کے پاس آیا جایا کرتا تھا، اس کے ہاں قیام کرتا تھا اور اس سے انعامات بھی پاتا رہتا۔ تا آنکہ مسلمان ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور میرا خیال ہے کہ ابوزبید کا اسلام بھی ولید کی طرح کوئی گہرا اسلام نہ تھا اور اس خیال کی تصدیق اسی سلسلے میں اس طرح ہوتی ہے کہ حضرت عثمان رض نے ولید پر حد جاری کی، حالانکہ حدود جاری کرنے میں شبہات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر حضرت عثمان رض مذکورہ بالا دونوں گواہوں کی شہادت میں قوی یا کمزور کسی طرح کا بھی شبہ پاتے تو ولید پر حد جاری کرنے میں ضرور پس وپیش فرماتے۔ پھر شبہ کی بنا پر حد جاری نہ کرنے پر حضرت عثمان رض کے لیے کوئی مضائقہ بھی نہ تھا، مضائقہ تو اس میں ہے کہ شبہ خواہ کتنا ہی کمزور ہو، حد جاری کر دی جائے۔

لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ حضرت عثمان رض کے حکم سے ولید پر کس نے حد جاری کی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لوگ خلیفہ کا حکم ماننے سے گریز کر رہے تھے تو حضرت علی رض نے ولید کو مارا۔ ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ حضرت علی رض دین کی باتوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔ اور سنتوں کے محافظ۔ اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے نفاذ میں سب سے زیادہ شدید تھے۔ شبہ کی موجودگی میں وہ حد جاری نہیں کر سکتے تھے۔ اکثر راویوں کا خیال ہے کہ ولید کو سعید بن العاص اموی نے مارا اور یہ سعید حضرت عثمان رض کے اور ولید کے قریبی رشتہ دار تھے۔ ان کو اپنے نزدیک اور دور کے رشتہ داروں اور خلیفہ کی نگاہ میں اپنی وقعت کا بڑا ناز تھا، اگر وہ ذرا بھی مشکوک ہوتے تو یقیناً حضرت عثمان رض سے ان کے فیصلے کے متعلق گفتگو کرتے اور اگر کامیابی نہ ہوتی تو کم از کم ولید کو مارنے سے معذرت کر دیتے۔ لیکن انھوں نے ولید کو مار کر دونوں کی نسلوں میں ایک نہ ختم ہونے والی عداوت پیدا کر دی۔

ولید کے مخالفوں کی ایک دماغی پیداوار جسے ہم غلو کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے، یہ ہے کہ ایک دن ولید نے شراب کے نشے میں مست صبح کی نماز میں امامت کی اور تین یا چار رکعتیں پڑھا دیں اور

پھر مصلیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا، اگر تم چاہو تو میں کچھ اور رکعتیں زیادہ کردوں۔ تب بعض لوگوں نے اس کو ملامت کیا اور بعضوں نے اس پر کنکریاں پھینکیں اور عوام نے حضرت عثمان رضہ سے درخواست کی کہ انھیں ولید سے معاف رکھائے۔ چنانچہ آپ نے ان کی درخواست منظور کرلی، اس کے بعد یہ واقعہ عوام کے زبان زد ہوگیا اور بذلہ سنجوں کے لطائف و ظرائف اور شعراء کے لیے طبع آزمائی کا موضوع بن گیا چنانچہ حطیئہ نے کہا۔

شهد الحطيئة يوم يلقى ربه　　ان الوليد احق بالعذر
نادى وقد نفدت صلاتهم　　أأزيدكم ثملا ولا يدري
ليزيدهم خيرا ولو قبلوا　　منا لزادهم على عشره
فابوا ابا وهب ولو فعلوا　　لقرنت بين الشفع والوتر
حبسوا عنانك اذ جريت ولو　　خلوا عنانك لم تزل تجري

میرا خیال ہے کہ یہ قصہ سر سے پاؤں تک بے اصل من گھڑت ہے اگر ولید نے نماز میں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کیا ہوتا تو کوفہ کے مسلمان جن میں بعض صحابہ رضہ اور متعدد قاری اور صالحین موجود تھے۔ ہرگز اس کی اتباع نہ کرتے اور نہ اس بات پر راضی ہوتے کہ حضرت عثمان رضہ صرف شراب کی حد جاری فرمادیں، اس لیے کہ مذاق نماز کا، یا اس میں اپنی طرف سے اضافہ خدا اور مسلمانوں کے نزدیک شراب نوشی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

پھر یہ اشعار حطیئہ کے نہیں ہیں، حطیئہ نے تو دوسرے اشعار کہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولید کا محب مخلص اور اس کی رضامندی کا طالب ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:-

شهد الحطيئة يوم يلقى ربه　　ان الوليد احق بالعذر
خلعوا عنانك اذ جريت ولو　　تركوا عنانك لم تزل تجري
ورأوا شمائل ماجد متبرع　　يعطي على الميسور والعسر
فنزعت مكذوبا عليك ولم　　تردد الى عوز ولا فقر

بعض شیعوں نے حطیئہ کے ان اشعار کا جواب بھی دیا ہے جو اس نے ولید کی مدح میں لکھے ہیں۔

ذیل کے تین شعر بھی ہرگز ہرگز حطیئہ کے نہیں ہیں، بلکہ یہ ولید کے مخالفوں کی تہمت تراشی رنگ آمیزی ہے :-

تکلم فی الصلوۃ و زاد فیہا علانیۃ و جاھر بالنفاق

ومج الخمر عن سنن المصلی و نادی والجمیع الی افتراق

ازیدکم علی ان یحمدونی فما لکم ومالی من خلاق

ولید کے عہد گورنری میں حطیہ نے اس کی مدح میں بہترین اشعار کہے ہیں جبکہ اس کے خلاف سازش یا اعتراض کا کسی دل میں خیال بھی نہیں تھا[1]

غالباً اس روایت میں بھی کھینچ تان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ ولید کے پاس ایک جادوگر لایا گیا۔ ابن مسعود رض نے اس کے بارے میں سوال کیا اور جب یقین ہوگیا کہ جادوگر سحر پر ایمان رکھتا ہے تو انھوں نے اس کے قتل کا حکم کردیا اور کوفہ کے ایک باشندہ نے عجلت سے کام لے کر بلا ولید کی منظوری کے اس کو قتل کردیا۔ اس کے بعد کوفہ والوں نے اس سلسلے میں حضرت عثمان رض سے ولید کی شکایت کی، جسپر آپ نے جواب دیا کہ کیا صرف گمان کی بنا پر لوگوں کو تم قتل کردیتے ہو۔

میرے خیال میں یہ کوئی بعید بات نہیں کہ ولید کے پاس کوئی جادوگر لایا گیا ہو جس کے شعبدے اور کھیل اس نے دیکھے۔ اس پر کوفہ کے بعض بزرگوں کو غصہ آگیا ہو، اور انھوں نے اس غریب شعبدہ باز کو قتل کردیا۔ پھر اس حرکت پر ولید نے اور خلیفہ نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا، اس لیے کہ لوگوں کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ خلیفہ کی منظوری کے بغیر یا محض گمان کی بنا پر کسی کا خون بہائیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ولید ایک قریشی تھا بظاہر مسلمان لیکن بباطن جاہلیت پر قائم، وہ اپنے ایسے ساتھیوں میں جن کی زبان پر اسلام، لیکن دل کفر و ایمان کے بین بین ہو، کوئی پہلا شرابی نہیں تھا اور نہ مخفی طور پر ہنسی مذاق کرنے میں کوئی انوکھا اور نیا تھا۔ میرے خیال میں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ولید نے کسی شعبدہ باز سے اپنا دل بہلایا اور اس کے تماشوں میں دلچسپی لی، اور یہ بھی بعید نہیں کہ ابن مسعود رض کی مداخلت کا ضمیمہ ولید کی مدافعت میں چسپاں کردیا گیا ہو۔ بہرحال میرا یقین ہے کہ ولید کی معزولی کا براہ راست سبب اگر اس کی شراب نوشی تسلیم کرلی جائے تب بھی یہ ماننا ہوگا کہ اس میں بعض دوسرے اسباب بھی دخیل ہیں جو شاید شراب نوشی اور کسی شعبدہ باز سے دلچسپی رکھنے سے کہیں زیادہ مؤثر ہیں، اور جن کا تعلق ولید کے اس سیاسی مسلک سے ہے جو کوفہ والوں کے لیے اس نے طے کیا تھا اور جس کے ماتحت ان سے پیش آتا تھا، کوفہ کی آبادی میں کثرت یمنیوں کی تھی، مضری بہت کم تھے، ولید قریشی تھا۔ اور حضرت عثمان رض کا رضاعی بھائی تھا۔ اس کو اپنی قریشیت اور حضرت عثمان رض سے اس نسبت پر بڑا ناز تھا

[1] اس کے مصنف نے حطیہ کے تیرہ شعر نقل کیے۔ مترجم۔

اغلب ہے کہ یمنی اکثریت اس قریشی حاکم سے جو اپنی برتری اور فوقیت کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا تنگ آچکی ہو اور بتدریج مخالف ہوگئی ہو، خود ولید نے اس بدلی ہوئی حالت اور یمنیوں کی مخالفت کا احساس کیا۔ لیکن برداشت کرتا رہا، اندازہ ہے کہ ولید نے یمنیوں کے اقتدار اور امتیاز کا مقابلہ کرنے کی بھی کوشش کی کہا جاتا ہے کہ یمنیوں کا ممتاز طبقہ کوفہ میں بذریعہ منادی اعلان عام کیا کرتا تھا کہ "باہر سے آنے والوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر ان کو کوئی قیام کی جگہ نہ ملی ہو تو وہ فلاں شخص کے ہاں بے تکلف چلے آئیں۔" اس طرح وہ مہمانوں کے استقبال والی عربی سنت کو زندہ رکھنے کا بازار گرم رکھتے تھے اور اس میں باہم مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ولید نے ایک دار الضیافۃ اپنی مرضی سے یا حضرت عثمان رضؓ کی اجازت سے قائم کر کے یمنی اشراف کے لیے فخر و امتیاز کے مقابلے کا یہ دروازہ بھی بند کر دیا۔ ابوزبید جب کوفہ آتا تو اسی دار الضیافۃ میں قیام کرتا اور ولید کے ہاں آتا جاتا اور کون جانے کہ اسی شاعر نے اپنی کسی ملاقات سے واپسی پر دار الضیافۃ میں آکر بدمستی کے عالم میں قابو نہ پاکر کچھ ایسی باتیں منہ سے نکال دی ہوں، جو خود ولید کی جاسوسی کا باعث بن گئی ہوں۔

اس کے بعد ولید نے لوگوں کی عام ناراضی اور مخالفت کے پیش نظر ایک نئی سیاست کا آغاز کیا جس کا ظاہر خیر خواہی کرنا اور نیکی پھیلانا تھا لیکن باطن میں عوام اور جماعتوں تک پہنچنا۔ اور ان میں ہر دلعزیزی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے غلاموں کے لیے وظیفے مقرر کیے جن سے وہ بہت آسودہ اور خوشحال ہوگئے۔ ہر غلام کو ماہانہ تین درہم مقرر کیے اور جو کچھ ان کو مالکوں سے ملے وہ مزید براں، ولید یہ وظیفہ غلاموں کو بچے ہوئے مال میں سے دیا کرتا تھا۔ یہ بچا ہوا مال ان مجاہدین کو دیا جا سکتا تھا جن کے جہاد کی بدولت یہ ملا ہے لیکن ولید اس کو لونڈیوں اور غلاموں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ گویا اس طرح وہ غنیمت کے بعض حصوں کو غنیمت میں ملا دیا کرتا تھا اس لیے کہ یہ لونڈیاں اور غلام بھی تو مال غنیمت کا ایک حصہ تھے جو چاندی سونے کی طرح فاتحین میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ جو لوگ ایک ایسی عربی طبیعت سے واقف ہیں جن میں جاہلیت کے کافی اثرات موجود ہیں اور جس میں اسلام کی محض ظاہری آمیزش ہے ان کو ہرگز حیرت نہ ہوگی کہ کوفہ کے یمنی اس قریشی سے تنگ آچکے تھے جو ان کے غلاموں اور لونڈیوں کو خوشحال بنا کر اپنانے اور اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح چاہتا ہے کہ غلاموں کی طاقت کو ان کے مالکوں کے مقابلے میں اگر ضرورت پڑے تو استعمال کرے راویوں کا بیان ہے کہ ولید کی معزولی پر غلاموں اور لونڈیوں نے غیر معمولی سوگ منایا۔ طبری کی روایت کے

سلہ طبری واقعات ۳۰ھ ۔

مطابق لونڈیوں کے مرثیے کے دو شعر یہ ہیں:۔

یا ویلتا قد عزل الولید	افسوس ولید معزول ہوگیا۔ اور ہم پر
وجاءنا مجوعا سعید	سعید مسلط ہوگیا جو بھوکا رکھنے والا ہے
ینقص فی الصاع ولا یزید	ناپ تول میں اضافہ نہیں کیا کرتا ہے۔ پس
فجوع الجاریۃ والعبید	لونڈی اور غلام بھوکے ہیں۔

مجھے تو یہ رجزیہ اشعار بناوٹی معلوم ہوتے ہیں اور یہ ولید کے طرف داروں کا نتیجۂ فکر ہیں، کوفہ میں رہنے والے ایرانی لونڈی اور غلام عربی ادب میں ایسی مہارت کے مالک نہیں بن گئے تھے کہ عربوں کی طرح ولید اور سعید سے متعلق اشعار کہنے لگیں، لیکن ان اشعار سے بہر حال اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی خواہ آزاد ہوں یا غلام، ولید کے حامی تھے اور اس کو دوست رکھتے تھے اس لیے کہ وہ انکی دلجوئی کرتا۔ اور ان سے محبت کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ راوی کوفہ والوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ دو گروہوں میں تقسیم تھے، عوام تو اس کے ساتھ تھے لیکن خواص اس کے مخالف تھے۔

اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ولید عوام کے لیے نرم اور خواص کے لیے نہایت سخت تھا۔ اگر ولید اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کی اتباع کرتا تو کوئی بھی اس کی مخالفت نہ کرتا، حضرت عمرؓ عوام کے ساتھ نرمی سے پیش آتے تھے اور خواص کے ساتھ سختی فرماتے تھے، اس حقیقت کے پیش نظر کہ خواص میں ایک قسم کی خود غرضی ہوتی ہے اور وہ جاہلی عصبیت کے زیر اثر بلندی اور برتری چاہتے ہیں، ولید نے اس حقیقت کو سامنے نہیں رکھا، وہ تو صرف اقتدار کے تقاضے پورے کرتا رہا۔ اس راہ میں لونڈیوں اور غلاموں کا سہارا لیتا رہا۔

بہر حال ولید معزول ہوا، کوفہ کے اہل الرّائے اس سے تنگ اور بیزار ہو چکے تھے اور شہر کے رئیس بھی اس کے دشمن تھے اس لیے کہ وہ جیسا کہ ہم نے واضح کیا ان کے غلاموں کے ذریعے ان کی حیثیت پست کرنا چاہتا تھا، شہر کے فقہاء، قرّاء اور صالحین بھی اس کے خلاف تھے، اس لیے کہ ان میں جاہلیت کے اثرات تھے، جس کی وجہ سے اس کی زندگی بیہودگی اور تمسخر کی زندگی تھی جو کبھی کبھی اللہ کی مقررہ حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی تھی۔

کوفہ پر سعید بن العاص کا تقرر

حضرت عثمان رضہ نے یہ تو ٹھیک کیا کہ ولید کو معزول کر دیا اور اس کے حاکم بنے رہنے پر زور نہیں دیا۔ یہ بھی ٹھیک کیا کہ اس پر حد جاری کی اور اس کی حمایت نہیں کی، لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ کوفہ کی حکومت مہاجر یا انصار میں سے کسی قابل صحابی کے سپرد کی جاتی، اگر وہ ایسا کر دیتے تو کوفہ کی حالت ٹھیک ہو جاتی۔ اور وہاں کے لوگ اختلاف اور افتراق کا شکار نہ بنتے لیکن آپ نے ابو معیط کے خاندان کے ایک شخص کو ہٹا کر اس کی جگہ بنی امیہ کے ایک آدمی کو مقرر کر دیا۔ حالانکہ حضرت عمرؓ نے آپ کو متنبہ کر دیا تھا کہ ان دونوں خاندانوں میں سے کسی ایک کے آدمی کو بھی عوام کی گردنوں پر سوار نہ کرنا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ کوفہ والے یہ جانتے تھے کہ حضرت عمر رضہ حضرت عثمان رضہ سے کیا چاہتے تھے۔ بعد میں انھوں نے متعدد صحابہ رضہ کو نہایت متقی اور نیک پایا۔ ان کی سیرت سے خوش ہوئے ان کو پسند کیا۔ پھر حضرت عثمان رضہ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ کوفہ والے سعد بن ابی وقاصؓ کے بعد ولید سے تنگ آ چکے تھے۔ پس مناسب یہ تھا کہ وہاں سعد رضہ کے مرتبے کا کوئی آدمی بھیجا جاتا، ولید کے درجے کے آدمی کی ضرورت نہ تھی۔ سعید بن العاص بنی امیہ کے نوجوانوں میں ایک خلیق اور معتدل مزاج نوجوان تھا۔ اس نے اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح شام کے معرکوں میں آزمائش کی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کی تھیں۔ خلیفہ ہونے سے قبل حضرت عثمان رضہ نے اس کی پرورش کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے قریشیوں کی تلاش میں جب اس کے متعلق دریافت کیا تو ان کو بتایا گیا کہ وہ شام میں امیر معاویہؓ کے پاس ہے۔ مریض ہے اور موت سے قریب ہے تو حضرتؓ نے امیر معاویہ رضہ کو لکھ بھیجا کہ سعید کو پوری حفاظت کے ساتھ میرے پاس بھیج دو۔ سعید مدینہ پہنچتے ہی چنگا ہو گیا اور جنسی خوشی حضرت عمرؓ سے ملا۔ فاروق اعظم رضہ شفقت اور دردمندی سے اس کے ساتھ پیش آئے اور ساتھ رکھا، پھر اس کی شادی کر دی اور ممتاز قریشی نوجوانوں کا ہم مرتبہ بنا دیا۔ لیکن سعید بہر حال ایک اموی قریشی تھا۔ حضرت عثمان رضہ سے قریب تھا، اس کی راستبازی شک سے بالاتر تھی لیکن اس کو عام قریش پر اور خصوصاً بنی امیہ پر بڑا ناز تھا، وہ کوفہ یہ ارادہ لے کر گیا کہ ولید کی پیدا کردہ خرابیوں کی اصلاح کر دے گا چنانچہ اس سلسلے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں، بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ولید کے گناہوں سے متاثر ہو کر اس نے منبر کو دھلوایا۔ جس سے بعض قریشیوں کو سخت کوفت ہوئی۔

بہرحال اتنی بات یقینی ہے کہ کوفہ والوں نے سعید کو مرحبا کہا اور اس کا استقبال کیا۔ سعید نے بھی ابتدا میں ان کی پذیرائی کی اور شہر کے حالات اور معاملات کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ ان ممتاز کوفیوں اور قاریوں کو اپنی مجلس میں جگہ دی جن کو ولید نے دل برداشتہ اور ناراض کر دیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ حقیقتِ حال سے باخبر ہو گیا اور حضرت عثمان رضؓ کو مطلع کر دیا۔ اس سلسلے میں اس نے جو خط لکھا ہے اس میں نہ صرف کوفے کا نہایت تفصیلی نقشہ کھینچا ہے بلکہ دوسرے شہروں کی بھی مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔ اس کی رائے میں کوفہ دو باتوں کی وجہ سے فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، ایک تو یہ کہ وہ حضرات جو فاتح بن کر یہاں آئے اور تمدن کی ترقی نے ان کو یہیں روک لیا، ایک عرصہ دراز گذر جانے کی وجہ سے ان کے نظم میں ابتری اور ان کی قوت میں کمزوری پیدا ہو گئی ہے ان میں ایسے حضرات بھی ہیں جو اپنی قوم میں بڑی وجاہت اور سیاست کے مالک ہیں۔ ایسے قاری اور عالم بھی۔ جن کا دینی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور صحابہ رضؓ کی رفاقت کی وجہ سے بہت بلند ہے، پھر جنگ ہو یا صلح، موت، دونوں حالتوں میں ان کی تعداد کم رہی ہے۔

کوفہ میں آبادی کی کثرت

دوسری بات جو کشمکش کا سبب ہے وہ باہر سے آنے والوں کی کثرت اور خود کوفہ کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ، دیہاتی عرب بہت بڑی تعداد میں اپنے ارادے سے یا فوج میں بھرتی کے لیے خلیفہ کے حکم سے کوفہ میں آ رہے ہیں اسی طرح جہاد کے معرکوں میں مال غنیمت کے ساتھ تقسیم ہونے والے غلام اور لونڈیاں اپنے مالکوں سمیت بڑی کثرت سے شہر میں آ کر بس رہے ہیں، پھر وہ نئی نسل جو خواتین اور لونڈیوں سے پیدا ہو رہی ہے اور وہ نسل جو غیر عربی عنصر اور غلاموں سے پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہ تمام اضافے نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں اور کوفہ کی شہری زندگی پر ان اضافوں کا غیر معمولی اثر پڑ رہا ہے۔

عجمیوں کا کوفہ میں کثرت سے داخلہ اور دیہاتی عربوں کی غیر معمولی آمد، پھر ان دونوں میں پیدا ہونے والی اولاد کی کثرت نے سابقین کے لیے میدان تنگ کر دیا ہے ان کے اقتدار کی بساط تقریباً الٹ چکی ہے اور یہ آنے والے علم سے زیادہ جہل کے ساتھی ہیں، نرمی اور سنجیدگی سے کہیں زیادہ ان میں شدت اور سنگدلی ہے۔ دیہات کے عرب اپنی موروثی جہالت، اُجڈ طبیعت اور کٹر عصبیت لے کر آئے ہیں، فارس کے قیدی، تہذیب و تمدن کا ورثہ ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ کمزوریاں اور خرابیاں بھی ان کے ساتھ ہیں جو متمدن زندگی کے آخر میں پیدا ہوتی ہیں، شکست اور غلامی نے ان کی طبیعتوں میں ذلت، ماضی پر حسرت اور مستقبل سے مایوسی پیدا کر دی ہے، وہ اپنے مالکوں سے متنفر اور خوفزدہ ہیں

ان میں مکر اور چالبازی کے جذبات پیدا ہیں۔ اس قسم کے مالکوں اور اس قسم کے محکوموں کے اخلاق وعادات کے سائے میں ایک نئی نسل پرورش پارہی ہے جو مشکلات میں مبتلا ہے اور دوسروں کے لیے بھی مشکلات کا باعث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کے کاموں میں شدید قسم کا الجھاؤ پیدا ہوگیا ہے اور حکام جب کسی ایک مشکل کو دور کرتے ہیں تو دوسری رونما ہوجاتی ہے۔

اس قسم کی باتیں مختصراً لکھ کر سعید نے حضرت عثمان رضؓ کو کوفہ کی حقیقت حال سے باخبر کر دیا۔ حضرت عثمان رضؓ نے سعید کو جواب لکھا جس میں ہدایت کی کہ وہ حتی الامکان بھلائی اور عافیت کو مقدم رکھے اور جہاں تک ہو سکے اپنے کو اور عوام کو فتنے سے بچائے۔ سابقین کو دوسروں پر ترجیح دے۔ اور اس کے بعد سچائی کے ساتھ حسب مراتب پیش آئے، نہ کسی کی طرف داری کرے اور نہ کسی پر زیادتی۔

خطرناک اقتصادی انقلاب

لیکن حضرت عثمان رضؓ نے اسی وقت محسوس کر لیا کہ لوگوں کے حالات بدل گئے۔ فتنہ وفساد کے آثار پیدا ہورہے ہیں اور اس سے احتیاط نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آپ نے عوام کے سامنے خطبہ دیا اور جو کچھ آپ کو معلوم ہوا تھا اس سے باخبر کر دیا۔ فتنہ وفساد سے بچنے کی تاکید کی اور ڈرایا، آپ نے جس سیاسی مسلک کی پابندی کی سعید کو ہدایت کی تھی اس کے متعلق حاضرین سے بھی مشورہ لیا۔ سبھوں نے آپ کی تائید کی لیکن آپؓ نے اس کے بعد ایک اہم تجویز پیش کی جسے سنکر مدینہ والے بہت خوش ہوئے۔ حضرت عثمان رضؓ کا خیال تھا کہ وہ اس تجویز کے ذریعے بعض خرابیوں کی اصلاح کرسکیں گے لیکن تجویز کا نتیجہ برعکس نکلا۔ حضرت عثمان رضؓ کی تجویز یہ تھی کہ بلاد عربیہ میں جہاں کہیں بھی کوئی سکونت اختیار کرے اس کا مال غنیمت وہاں پہنچا دیا جائے تاکہ شہروں میں فوجیوں کے علاوہ وہی لوگ رہیں جن کو وہاں قیام کی ضرورت ہے۔

مدینہ کے لوگ یہ سنکر سخت حیران ہوئے اور انھوں نے حضرت عثمان رضؓ سے دریافت کیا، اللہ نے مال غنیمت میں، ہمیں جو زمینیں دی ہیں آپ وہ کس طرح منتقل کردیں گے؟ حضرت عثمان رضؓ نے جواب دیا اور یہی تجویز کی روح ہے کہ ہم انھیں حجاز کے مالکان اراضی سے جس سے بھی چاہیں فروخت کردیں گے، یہ سُن کر وہ خوش ہوگئے، اللہ نے ان پر ایسا دروازہ کھولا جس کا ان کو وہم وگمان بھی نہ تھا، اب تو وہ منتشر ہوگئے۔ خدا نے ان کی مصیبت دور کردی[1]۔ تجویز کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے پہلے حجاز والوں کو اور پھر تمام عربی بلاد کے شہریوں کو موقع دیا کہ اگر ان کی کوئی زمین عراق یا کسی دوسرے

[1] طبری واقعات ۳۱ھ۔

صوبے میں ہوتو وہ حجاز کی زمین سے یا کسی عربی شہر کی زمین سے بدل لیں، ایسا کرنے سے لوگ اپنے اپنے شہروں میں اپنے اہل وعیال اور متعلقین کے ساتھ مستقل قیام کریں گے اور وہاں سے منتقل نہ ہوں گے اس طرح دیہاتی عربوں کی ہجرت صوبوں میں کم ہو جائے گی۔ اور پھر حجاز میں اور عربی شہروں میں زمینیں خریدنے والوں کو زمین کی درستگی اور انتظام کے لیے اس کو نفع بخش بنانے کے لیے بہت سے مزدوروں اور کام کرنے والوں کی ضرورت ہوگی۔ پس باہر سے عربی بلاد میں غلام اور کام کرنے والے آبسیں گے اور صوبوں کا مسلسل بڑھنے والا دباؤ ان قیدیوں کی بھر مار سے کم ہوگا۔

اس تجویز پر لوگوں کا خوش ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ حجاز والوں کے لیے عراق کی زمین میں وہ کشش نہیں ہو سکتی جو خود حجاز کی زمین کے لیے ہو سکتی ہے، اسی طرح یمن والوں کو مصر اور شام کی زمین سے زیادہ مرغوب یمن کی زمین ہوگی جو ان سے قریب ہے اور وہ آسانی سے اس کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں، اس میں ان کو نہ لمبے یا مختصر سفر کی زحمت اٹھانی ہوگی اور نہ باپ دادا کی زمین سے ہجرت کرنے کی تکلیف۔

حضرت عثمان رض نے اپنی اس تجویز سے تمام صوبوں کو مطلع کر کے ایک ایسی راہ کھول دی جس نے ان کی زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا، سیاست، اجتماع اور اقتصاد غرض کہ فکر و نظر کا ایسا کوئی گوشہ باقی نہ رہا جہاں اس کے اثرات نہ پہنچے ہوں۔

چند مثالیں سنیے: ۔ حجاز میں جلیل القدر صحابہ رض کی منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں بہت زیادہ تھیں ان لوگوں نے خبر پاتے ہی ان تمام جائدادوں کو فروخت کر کے صوبوں میں زمینیں خرید لیں اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ زمینیں حجاز سے کہیں زیادہ زرخیز ہیں، پھر بونے جوتنے میں آسانی اور پیداوار زیادہ ۔ حضرت طلحہ رض بن عبید اللہ نے بڑی کوشش اور کاوش کر کے ان لوگوں سے جو خیبر کی فتح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک جہاد تھے ان کا حصہ ان سے یا ان کے وارثوں سے خرید لیا تھا، حضرت عثمان رض کے اس اعلان کے بعد انھوں نے یہ ساری جائداد ان حجازیوں کے ہاتھ اس جائداد کے بدلے میں فروخت کر دی، جو فتح عراق کے موقع پر ان کو ملی تھی۔ طلحہ رض چونکہ کافی دولت مند تھے اس لیے انھوں نے اور بہت سے حجازیوں سے ان کی عراق کی زمینیں خرید لیں۔ خود حضرت عثمان رض سے اپنی حجاز کی مملوکہ زمین کے بدلے میں ان کی عراق والی زمین لے لی، لوگوں نے اس اعلان سے فائدہ اٹھایا، ہر وہ آدمی جس پر یہ گراں تھا کہ وہ حجاز چھوڑ کر صوبوں میں اپنی زمینوں کا انتظام کرے، اس نے اپنی وہ زمین فروخت کر دی اور اس کے بدلے میں اپنے قریب کوئی جگہ لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اول تو عراق اور

دوسرے صوبوں میں بڑی بڑی جائدادوں اور زمینوں کے مالک پیدا ہوگئے، اس لیے کہ حضرت عثمان رض کی اس تجویز سے وہ بڑے بڑے سرمایہ دار ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے جن میں چھوٹی چھوٹی جائداد والوں سے انکی ملکیت خرید لینے کی سکت تھی۔ چنانچہ طلحہ رض نے خریدا، زبیر رض نے خریدا اور مروان بن الحکم نے خریدا۔ یہ سال مالیاتی نقطۂ نظر سے بڑی سرگرمیوں کا گذرا۔ خوب خوب خرید و فروخت ہوئی، قرضے لیے گئے، تبادلے کیے گئے۔ اشتراک اور حصہ داریاں قائم ہوئیں۔ پھر یہ سرگرمیاں حجاز اور عراق تک محدود نہ رہیں، پورے عربی بلاد اور مفتوحہ علاقوں تک پھیل گئیں، ایک طرف طویل و عریض اراضی کی بڑی بڑی ملکیتیں قائم ہوئیں دوسری طرف ان کے انتظام اور بندوبست کے سلسلے میں بہت سے مزدور، کام کرنے والے غلام اور آزاد کام سے لگ گئے، اس طرح اسلام میں ایک نیا طبقہ (بوتقراطیہ) پیدا ہوا۔ جس کی امتیازی شان میں وہ سیادت بھی ہے جس کا سرچشمہ دولت کی فراوانی، مال کی بہتات اور ماتحتوں کی کثرت ہے۔

اسلام میں بڑی بڑی جاگیروں کی ابتدا

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ جن لوگوں نے عربی بلاد میں، خاص طور سے حجاز میں زمینیں خریدی تھیں انھوں نے اس کی کاشت کا ارادہ کیا اور باہر سے کام کرنے والوں اور غلاموں کو بلوایا، اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ حجاز جنت ارضی کا ایک خوبصورت ٹکڑا بن گیا۔ جو اپنے باشندوں کے لیے سب سے زیادہ زرخیز، بارآور، دولت آفریں ہوا۔ اور ان کی خوشحالی و فراغت کا باعث بنا، اس کے بعد بہت جلد مکہ میں، مدینہ میں اور طائف میں امراء اور سرمایہ داروں کا وہ طبقہ پیدا ہوگیا جو خود کچھ کام نہیں کرتا تھا۔ اپنا سارا وقت گپ شپ اور لہو و لعب میں گذارتا، مزدور اور غلام اس کے لیے کام کرتے۔

اس کے بعد تو حجاز میں اور دوسرے عربی شہروں میں تمدن کا دور دورہ ہوگیا، تعیش بڑھا، فرصت اور فضولیات نے قدم جمایا۔ فرصت اور بیکاری کے دن طرح طرح کے شوق پیدا کرتے ہیں، چنانچہ رقص و سرود شروع ہوا، اور ایسی شاعری جو ہمت، حوصلہ اور سرگرمیوں کا نقشہ نہیں کھینچتی، بلکہ ایسی فرصت اور ایسی فراغت کی تصویر پیش کرتی ہے جو لذت گیری کے لیے وقف ہو، جو نفس کے جذبات اور اس کے بار بار کے تقاضوں کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہو، ان ہی فارغ البال سرمایہ داروں کے سایہ میں وہ غلام آباد تھے، جو اپنے آقاؤں کے مالک اور ان کی زندگی کے منتظم تھے اور ان کے لیے جذبات اور ہوس کا ساز و سامان فراہم کرنے والے تھے، پھر ان مالک غلاموں یا غلام مالکوں کے پڑوس میں دیہاتی عربوں کا ایک طبقہ رہتا تھا جو اتنا نادار تھا کہ اس کے پاس نہ حجاز میں کوئی زمین تھی کہ عراق کی زمین کے بدلے میں بیچ لیتا۔ اور نہ عراق میں کسی زمین کا مالک تھا کہ حجاز کی کوئی

زمین خرید لیتا۔

حضرت عثمان نے، خدا کی ان پر رحمت ہو، جب اس تجویز پر غور کیا، یا ان کے رفقاء اور مشیروں نے جب ان کو اس طرف متوجہ کیا تو اس کے دور رس نتائج ان کی نگاہوں کے سامنے نہ تھے انھوں نے ایک خرابی دیکھی اور چاہا کہ اس کا خاتمہ کر دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ شہروں میں لوگوں کی آمد کم ہو، اور دیہاتی عرب اپنے گھروں پر رہیں۔ البتہ غلام اور قیدی عربی بلاد میں لائے جائیں، ان حجازیوں کو جو صوبوں میں چھوٹی چھوٹی جائدادوں کے مالک ہیں۔ حجاز میں ایسی زمینیں حاصل ہو جائیں جس کی وہ قریب سے نگرانی کر سکیں۔ لیکن حضرت عثمان رض اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، اس تجربہ سے تو خلاف توقع خرابیاں ہی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ دیہاتی عرب، شہروں میں ہجرت کرنے سے کسی وقت رُک سکے یا نہیں، اس لیے کہ تاریخ اس باب میں خاموش ہے، لیکن مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ حضرت عثمان رض اور ان کے مشیروں نے مسلمانوں کی اقتصادی زندگی میں اس قدر غیر معمولی اور اہم انقلاب پیدا کرنے کا جو ارادہ کیا تھا تاریخ نے اسے تاڑا بھی یا نہیں؛ مجھے اس میں شبہ نہیں کہ قیدیوں اور غلاموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا جو دباؤ شہروں پر پڑ رہا تھا۔ حضرت عثمان رض اس کے کم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، اس لیے کہ فتوحات کا سلسلہ آپ کے زمانے ہی میں ختم نہیں ہو گیا، بلکہ جیسا کہ ناظرین آگے چل کر پڑھیں گے، بعد میں بھی معرکے رہے اور مسلسل فتوحات ہوتی رہیں اور مال غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار حصہ فاتحین میں تقسیم ہوتا رہا جو شہروں میں مقیم تھے، ہر چار سال میں ایک مرتبہ وہ اپنے قریب کی سرحد پر جاتے اور کم و بیش چھ مہینہ قیام کرتے، پس مال غنیمت جس میں غلام بھی شامل ہیں ان تک پہنچتا رہتا، اور آنے والے غلاموں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہتی اور اس کے سوا چارۂ کار بھی نہ تھا، یہ بات تو اسی وقت رک سکتی تھی جب فتوحات کا سلسلہ رک جاتا اور حکومت امن و صلح کے زیر سایہ دن گذارتی، اور یہ موقع عثمانی عہد تک تو میسر نہ آ سکا تھا۔ آپ کے زمانہ میں تو صوبے کے گورنروں میں شدید مقابلہ رہا کہ فتوحات میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے، پھر سرحد کے سپہ سالاروں میں بھی بڑے مقابلے کی بات تھی کہ اس میدان میں یا اس معرکے میں کون پہلے دشمن پر حملہ کرتا ہے، اس شہر پر یا اس آبادی پر کون پہلے قبضہ کرتا ہے اور کون سب سے زیادہ مال غنیمت حاصل کر کے ایک طرف فوج کو، دوسری طرف صوبے کے حاکم کو اور تیسری طرف مدینہ میں خلیفہ اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرتا ہے۔ پس عثمان رض وہ دباؤ جو دیہاتی عربوں اور مفتوح قیدیوں کی وجہ سے عام عربی شہروں اور خاص طور پر عراق کے دونوں شہروں بصرہ اور کوفہ پر پڑ رہا تھا۔

کسی طرح کم نہیں کرسکتے تھے، اور جن لوگوں نے اپنی صوبوں کی زمینیں فروخت کرکے حجاز میں جائدادیں پیدا کیں وہ اپنا نظام ٹھیک نہیں کرسکے اور ضرورت کے مطابق باہر سے کام کرنے والے بلا نہ سکے۔ جو شاید آتے تو شہروں میں غلاموں کی تعداد کم ہوجاتی۔ حضرت عثمان رضؓ نے ۳۳ھ میں یہ اقتصادی انقلاب پیدا کیا اور ۳۵ھ میں شہید ہوئے اور ان دو برسوں کے درمیان حالات انتہائی اضطراب انگیز رہے، اس لیے اس مختصر مدت میں جن نتائج کی توقع تھی وہ برآمد نہ ہوسکے۔ البتہ اس کے خراب اور خطرناک اثرات کم سے کم وقت میں ظاہر ہوگئے اور حجاز کے سرمایہ دار جس بات کا بڑی بیتابی سے انتظار کررہے تھے وہ ان کو حاصل ہوگئی۔ مدینہ منورہ میں قریش کو روک کر حضرت عمر رضؓ نے صرف ان کی شخصیتوں کو نہیں روکا تھا۔ بلکہ بڑی حد تک ان کی دولت کو بھی مدینہ سے باہر جانے نہیں دیا۔ بلاشبہ مدینہ کے دولت مند حجاز میں اور دوسرے صوبوں میں تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ اور روپیہ پیسہ کی شکل میں غیر معمولی دولت کماتے بھی تھے۔ لیکن اپنی اس روزافزوں دولت کو وہ کسی کاروبار میں لگا نہیں سکتے تھے، ان کیلئے آسان نہ تھا کہ وہ وسیع پیمانے پر بڑے بڑے کاموں میں اپنا سرمایہ لگائیں، اس لیے ہوتا یہ تھا کہ نقد کی صورت میں نقد اور مال کی صورت میں مال بڑھتا چلا جاتا تھا۔ جس کو عوام اور غریب دیکھ کر حیرت کرتے۔ بعض اوقات دولت کی اس فراوانی پر کچھ فقرے چست کرتے جس سے متاثر ہوکر دولتمند خیر و خیرات کی راہیں نکالتے، اچھوں کے لیے یہ بات اللہ اور عوام کی خوشنودی کا باعث تھی اور دوسروں کے لیے حسد اور دشمنی سے بچنے کا سامان۔

پس حضرت عمر رضؓ نے قریش کو کاروبار کرنے اور نفع کمانے سے روکا نہیں تھا اور وہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن ان کو یقین تھا کہ دولت مند اپنی دولت سے اس قدر نفع کماتے ہیں جو مناسب نہیں اسی لیے زندگی کے آخری دنوں میں آپ نے فرمایا۔

"جو کام میں نے آخر میں کیا اگر وہ پہلے کرتا تو دولت مندوں سے ان کا بچا ہوا مال لے کر غریبوں میں تقسیم کردیتا۔"

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک دن صبح صبح مدینہ والوں نے بڑا شور سنا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کے اونٹوں کی آواز ہے جن پر اسباب تجارت لدا ہوا ہے حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ "ایسا سمجھو کہ پل صراط پر میرے ساتھ عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ ہیں، کبھی جھک جاتے ہیں اور کبھی سیدھے ہوجاتے ہیں تا آنکہ پار ہوگئے" عبدالرحمٰن رضؓ کو جب اس کی خبر پہنچی تو آپ نے کہا، وہ تمام اونٹ اور جو کچھ ان پر ہے، سب خدا کی

راہ میں صدقہ ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ ان اونٹوں پر بہترین مال تجارت تھا اور اونٹ کُل پانچ سو تھے[1]

ابن سعد سلیمان سے اور سلیمان عبدالرحمٰن دمشقی سے اور وہ خالد بن یزید ابن ابی مالک سے اور وہ اپنے باپ سے اور وہ عطا ابن رباح سے اور وہ ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف سے اور وہ اپنے باپ سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اے ابن عوف! تم ایک دولت مند ہو، لیکن جنت میں تم کھسکتے کھسکتے جاؤ گے، اللہ کو قرض دو کہ تمھارے پاؤں کھول دے۔ ابن عوف رض نے جواب میں کہا، اللہ کے رسول! میں اللہ کو کیا قرض دوں، آپ نے فرمایا جس پر تمھاری شام گذری ہو اس سے شروع کرو۔ ابن عوف رض نے کہا، کیا سب کا سب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا ہاں! ابن عوف رض ارادہ کر کے وہاں سے نکلے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کہلا بھیجا کہ جبریل نے کہا ہے کہ ابن عوف رض کو مہمان نوازی کا، مسکینوں کو کھانا کھلانے کا اور سائل کی طلب پوری کرنے کا حکم دیجیے۔ اور آغاز اپنے عزیزوں سے کریں، اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کے مال کی زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

یہ تھی دولت عبدالرحمٰن رض کی عہد نبوی میں، پھر اس میں چند در چند اضافہ ہوا، کچھ تو کاروبار اور اس کی ترقیوں سے اور کچھ مال غنیمت کے حصوں سے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے پچاس ہزار سُرخ دینار کی وصیت فرمائی اور ایک زبردست وراثت ترکے میں چھوڑی چنانچہ ان کی ملکیت میں ہزار اونٹ اور تین ہزار بکریاں تھیں۔ وہ مقام جرف کی زمینوں پر بیس اونٹوں کی آبپاشی سے زراعت کرتے تھے، انھوں نے چار بیویاں چھوڑیں۔ ہر ایک کے حصے میں جو وراثت آئی اس کی قیمت کا اندازہ اسی ہزار سے ایک لاکھ تک کیا جاتا ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن رض ابن عوف سونے کی اتنی مقدار چھوڑ کر مرے کہ اسے کلہاڑی سے کاٹنا پڑا اور لوگوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ اور یہ عبدالرحمٰن رض دولت مندی میں کوئی یگانہ نہ تھے۔ قریش کے سرداروں اور صحابۂ کبار کی جو حالت تھی وہی ان کی تھی۔ حضرت عثمان رض کے اس اقتصادی انقلاب نے ان دولت مندوں کو موقع دیا کہ وہ اپنا سرمایہ کسی کاروبار میں لگائیں۔ چنانچہ وہ بڑے بڑے کاروبار اور غیر معمولی دولت کے مالک بن گئے۔ اور اس طرح جیسا کہ ہم نے کہا تھوڑے ہی عرصے میں بڑی زبردست جاگیریں پیدا ہو گئیں اور اسلام کے آغاز ہی میں وہ تعیش پیدا ہو گیا جو رومی جمہوریت کے آخر میں پیدا ہوا تھا

[1] طبقات ابن سعد مطبوعہ لندن، تیسرا حصہ، پہلی قسم ص ۹۳

اور جو رومی جمہوریت کے خاتمے کا باعث تھا۔ اسی نے اسلامی خلافت کو بھی برباد کیا۔ گنے چنے چند رومی اٹلی کی سرزمین کے مالک ہو گئے تھے اور عوام ان ہی سے وابستہ ہو کر ٹولیوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت نے صوبوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور لوگ جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو کر اسی مختصر جماعت سے وابستہ ہو گئے۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت عثمان رضہ نے اپنی رائے سے یا اپنے مشیروں کے مشورے سے جو نظام پیدا کیا اس کے نتائج سیاست ہی تک محدود نہیں رہے اور صرف یہی نہیں ہوا کہ ایک حد سے زیادہ مال دار طبقہ پیدا ہوا جس نے عوام کو شکار بنایا، ان کو جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم کر دیا پھر اس تقسیم کی بدولت ان پر اپنا اقتدار جمانے کے لیے باہم لڑتے رہے۔ بلکہ اجتماع اور سماج بھی اس سے متاثر ہوا۔ اسی انقلاب نے پوری طرح ایک طبقاتی نظام پیدا کر دیا۔ چنانچہ امراء کا اونچا طبقہ پیدا ہوا جس کے پاس غیر معمولی دولت اور دولت پیدا کرنے کے ذرائع اور زبردست اقتدار تھا۔ اور ایک طبقہ مصیبت کے ماروں کا بنا جو مزدوری کرتا تھا اور اونچے طبقے کے مصالح کے لیے مشقت کرتا تھا۔ اور ان دونوں جدا طبقوں کے بین بین ایک درمیانی طبقہ پیدا ہوا جو عام عربوں کا طبقہ تھا۔ یہ شہروں میں رہتا تھا۔ دشمنوں پر حملہ آور ہوتا، سرحدوں کی حفاظت کرتا اور اپنے زیرسایہ لوگوں کی مدافعت کرتا۔ یہی درمیانی طبقہ ہے جس کا دولت مندوں نے مقابلہ کیا اور ان کو مختلف جماعتوں اور فرقوں میں منتشر کر دیا۔ مسلمانوں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ پہلی آویزش تو دولت مندوں میں ہوئی لیکن اس کے بعد اسی درمیانی طبقے اور دولت مندوں میں معرکہ رہا۔ تیسرا طبقہ جو زمین پر کام کرتا تھا اور جس کی زندگی مختلف مفاد کی نذر تھی۔ اس کا معاملہ بہت بعد میں ظہور پذیر ہوا اور اس کی بھی ایک داستان ہے۔

پہلا فتنہ

اخراج اور جلا وطنی

پس فتنہ دراصل عربی فتنہ تھا، جو دولت اور اقتدار کی خاطر مقابلہ کرنے والے دولت مندوں کی سرگرمیوں سے پیدا ہوا۔ جس میں عام عربوں کا وہ جذبہ حسد بھی شامل ہے جو ان کو مالداروں سے تھا۔ حضرت عثمان رض کی تجویز کی اطلاع پاتے ہی دولت منداس سے فائدہ اٹھانے کے لیے دوڑ پڑے اور فتنے کے آثار رونما ہوگئے۔ اور سب سے پہلی خرابی کوفہ سے شروع ہوئی اور خود سعید بن العاص کی مجلس سے، ۳۳ھ کے دن تھے، سعید نے جیساکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اپنی مجلس کے لیے ممتاز افراد متقی بزرگوں اور قاریوں کو منتخب کر لیا تھا جو دن میں جبکہ عوام نہ ہوتے یا رات میں داستان گوئی کے موقع پر حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ دن میں یا رات میں سعید نے مجلس میں کہہ دیا کہ "سواد کوفہ قریش کا ایک باغ ہے"۔ اس پر مجلس کے حاضرین میں جس میں اکثر یمنی تھے غصے کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے سعید کو نہایت سختی اور تلخی کا جواب دیا اور کہا "سواد تو اللہ کا مال غنیمت ہے اور اس میں قریش کا حصہ دوسرے مسلمانوں سے کچھ زیادہ نہیں"۔ سعید کا محافظ افسر بہت خفا ہوا اور اس نے حاضرین کی سخت کلامی پر ان کو ڈانٹا ڈپٹا۔ لیکن حاضرین اس کی طرف بڑھے اور اس کو اتنا مارا کہ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی اس کے بعد سعید نے داستان گوئی کی مجلس اٹھادی اور ان لوگوں سے ملنا ترک کر دیا۔ اب یہ لوگ اپنی اپنی مجلسوں اور نشست گاہوں میں جمع ہونے لگے۔ اور سعید کے خلاف اور حضرت عثمان رض اور قریش کے خلاف تنقید میں اپنی زبانیں آزاد کر دیں۔ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچی اور کچھ لوگ انکی مجلسوں میں آنے جانے لگے۔ تب سعید نے حضرت عثمان رض کو ان کے بارے میں مراسلہ لکھا اور اس میں اس بات کا اظہار کیا کہ "مجھے ان کی وجہ سے خطرہ ہے کہ عوام فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے"۔ حضرت عثمان رض نے جواب دیا کہ ان کو شام بھجوا دو، اور شام میں امیر معاویہ رض کو لکھا کہ "ان آنے والوں سے ملو اور ان کی اصلاح کی کوشش کرو"۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ سعید کی مجلس میں ایک دن یہی قاری اور بزرگانِ کوفہ موجود تھے اور بات طلحہ بن عبیداللہ رض کی سخاوت اور فیاضی کی چھڑ گئی، سعید نے کہا جس کے پاس طلحہ جتنی دولت اور زمینیں ہوں اس کو دریادل اور فیاض ہونا بھی چاہیئے اور اگر میرے پاس اتنی ہوتی تو میں تم کو فارغ البال اور خوش حال بنا دیتا۔ مجلس میں بنی اسد کا ایک لڑکا بھی تھا۔

اس نے سعید سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کاش فرات کی فلاں زمین جو حکومت کی ہے امیر کی ملکیت ہوتی تو وہ عام مسلمانوں کے لیے مال غنیمت بن جاتی۔ حاضرین نوجوان کی اس بات پر برہم ہو گئے اور اس کو لعنت ملامت کیا۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ لوگوں نے اس نوجوان کو اور اس کے باپ کو مارا اور اتنا مارا کہ دونوں بیہوش ہو گئے ۔ اس پر بنو اسد کو غصہ آگیا اور وہ بگڑ بیٹھے۔ سعید نے بڑی کوشش کی کہ معاملہ رفع ہو جائے لیکن بات نہ بن سکی۔ پھر کوفہ والوں نے اس سے اصرار کیا کہ ان لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے چنانچہ سعید نے خلیفہ کے حکم سے ان کو شام بھیج دیا۔

بہر حال قابل ذکر بات یہ ہے کہ سعید نے ان لوگوں کو ان کے شہر سے جلا وطن کر دیا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ حاکم کو اپنی مرضی سے یا خلیفہ کے حکم سے کس حد تک یہ جائز ہے کہ مسلمانوں کو ان کی زمین سے جلا وطن کر دے اس لیے کہ ان کو اسی وقت جلا وطن کیا جا سکتا ہے۔ جب دلیلوں سے یہ ثابت ہو چکا ہو کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے مقابلہ کی ٹھان لی، یا زمین پر فساد پھیلانے کی کوشش کی، ایسا ہونے کی صورت میں بلاشبہ خلیفہ مجاز ہے کہ ان کو قتل کر دے ۔ یا سولی پر چڑھا دے ، یا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے یا جلا وطن کر دے ۔

شہر کے ان بزرگوں کے متعلق جن میں قرآن مجید کے قاری اور اسلامی معرکوں میں فدا کاری دکھانے والے حضرات موجود تھے، یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی یا زمین پر فساد پھیلایا، نہ اطاعت سے انکار کیا نہ خلیفہ اور اس کے حاکم کے حکم سے سرتابی کی یہ لوگ تو حاکم کے ساتھ مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے اور جو کچھ ان کے ذمے تھا ادا کرتے تھے زیادہ سے زیادہ ان کا جرم یہ تھا کہ حاکم کے طرز عمل یا اس کی بعض دوسری باتوں پر انھوں نے تنقید کی اور اپنی حد سے تجاوز کر کے اس نوجوان کو یا حاکم کے محافظ افسر کو مارا، لیکن حاکم کے بعض کاموں ، یا اس کی بعض باتوں پر تنقید ان کا حق ہے جس کو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ خود صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضؓ لوگوں سے اس کی درخواست کیا کرتے تھے، پس محض تنقید پر تو ان کو سزا دینا مناسب نہ تھا۔ اب رہا ان کا مارنا تو بلاشبہ اس پر ان کو خفیف سی سزا دی جا سکتی تھی۔ سرزنش کر دی جاتی قید میں رکھا جاتا، یا پاؤں کاٹ دیئے جاتے، جلا وطن کر دینا تو بہت بڑی سزا تھی۔ اگلے وقت کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بھی نصر بن حجاج کو اس خوف سے کہ عورتیں فتنے میں مبتلا ہوں گی مدینہ سے جلا وطن کر دیا تھا پس حضرت عثمان رضؓ یا ان کے حاکم کے لیے بھی بالکل جائز ہے کہ مسلمانوں کے فتنے میں پڑنے کے اندیشے سے ان لوگوں کو کوفہ سے نکال دیں۔ لیکن نصر بن حجاج کی جلا وطنی

صحیح معنوں میں نہ جلاوطنی تھی اور نہ سزا۔ اس لیے کہ ان کا کوئی گناہ نہ تھا، اور نہ انھوں نے عورتوں کو اپنے پیچھے آنے کے لیے پھسلایا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بے نظیر قد و قامت عطا کیا تھا اور لاجواب حُسن و جمال کی نعمت دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے میرے خیال میں ان کو مدینہ چھوڑنے کی ترغیب دلائی اور کچھ مالی امداد دی۔ یہ ترغیب نہ کوئی شدت تھی نہ جبر لیکن جس حکیمانہ لب و لہجہ میں آپ نے یہ بات کہی اس میں شدت کی جھلک تھی، پھر حضرت عمرؓ کی اس کارروائی پر سب لوگ خوش بھی نہ تھے، لیکن میں تو عرض کروں گا کہ اس نوجوان کو حضرت عمرؓ نے نہ جلاوطن کیا اور نہ سزا دی، انھوں نے اس کو مدینہ چھوڑ دینے پر اکسایا اور اس سلسلے میں اس کی مالی مدد کی۔

لیکن سعید نے ان لوگوں کو کوفہ چھوڑ دینے پر نہ اکسایا اور نہ ان کی مالی مدد کی بلکہ حاکمانہ جبر کے ساتھ ان کو کوفہ سے نکال کر غربت میں بھیج دیا۔ جہاں وہ بال بچوں سے دور پریشانی کے عالم میں تھے۔ ان کو اس نے یا حضرت عثمان رضؓ نے امیر معاویہ رضؓ کے حوالے کر دیا تاکہ ان کو آزاد نہ رہنے دے اور جس طرح ہو سکے ان کی اصلاح کر دے۔ اس طرح اس نے ان کو گھر سے بے گھر کیا، ان کی آزادی چھین لی، بال بچوں کے بارے میں ان کو حیران و پریشان کیا۔ اور ان باتوں کا اس کو کچھ بھی حق نہ تھا۔ شاید کوئی یہ کہے کہ سعید نے بھی ان کو صحیح معنوں میں جلاوطن نہیں کیا، اس نے تو ان کو ایک دارالاسلام سے نکال کر دوسرے دارالاسلام میں داخل کر دیا اور اسلامی زمین سب کی سب ہی مسلمانوں کا ہی گھر بار ہے۔

لیکن حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں صحابہ رضؓ اور تابعین میں جتنے لوگ بھی تھے سبھوں نے اس اخراج کو بہر حال برا اور ناجائز جلاوطنی خیال کیا، اس میں کچھ شک نہیں کہ امام کو سزا دینے کا حق ہے۔ لیکن اس کو سزا دینے میں جانی بوجھی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ حضرت عثمان رضؓ کے گورنروں نے جلاوطن اور شہر بدر کر کے خود اپنی جان پر، خلیفہ پر اور عوام پر کیسے کیسے مظالم کیے۔

کوفہ سے نکالے ہوئے ان افراد سے امیر معاویہ رضؓ نے ملاقات کی اور ان کو ایک گرجا گھر میں ٹھہرایا ان کی ضروریات کا انتظام کر دیا اور کوشش شروع کر دی، کبھی ان کے پاس خود جاتے کبھی اپنے پاس بلاتے۔ لیکن یہ سب بے فیض رہا۔ ایک مرتبہ عربوں پر قریش کی فضیلت کے موضوع پر بحث کی لیکن وہ لوگ عربوں پر قریش کی فضیلت نہ سمجھ سکے اور اسلام کے نزدیک قریش کو عربوں یا غیر عربوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے اس امتیاز کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قبیلے میں پیدا ہوئے، لیکن

قریش میں نبیؐ کا مبعوث ہونا اس کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگوں کی گردنوں کا مالک بنا رہے یا اس کو تمام مسلمانوں پر ایک برتری حاصل رہے جیسی عثمانی عہد میں رہی۔ بہرحال یہ بات کسی قریشی حاکم کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ

انما السواد بستان لقریش سواد کوفہ قریش کا ایک باغ ہے۔

کہہ دے۔ ان لوگوں سے ایک مرتبہ امیر معاویہ رضہ نے خلیفہ اور اس کی اطاعت کے مسئلہ پر گفتگو کی، لیکن بات بے نتیجہ رہی۔ اس لیے کہ وہ امام کی اطاعت کے منکر نہ تھے، اگر وہ عدل قائم کرتا ہے۔ حق جاری کرتا ہے سنتوں کو زندہ کرتا ہے۔ بدعتوں کو مٹاتا ہے۔ ان کو توا امام کی اور اس کے حاکموں کی اطاعت سے اس وقت انکار ہے جب وہ اعتدال کی راہ سے ہٹ جائیں۔ امیر معاویہؓ نے اپنی ذات کے متعلق بحث کی۔ اس بحث میں بھی وہ ان پر کچھ اثر نہ ڈال سکے۔ انھیں یہ ناگوار تھا کہ امیران کو وعظ و نصیحت کریں اور ان سے حاکم اور روالی کی حیثیت سے پیش آئیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ معاویہؓ کو منصب خلافت سے سبکدوش ہونا چاہیئے تاکہ ان کی جگہ وہ شخص آئے جو اسلام لانے میں ان سے پہلے تھا۔ جس کا خاندان ان سے بھی زیادہ بزرگی رکھتا ہے۔ اور اسلام کے حدود قائم کرنے میں ان سے بھی زیادہ اہلیت و قابلیت کا مالک ہے۔

اندازہ لگتا ہے کہ امیر معاویہ رضہ نہ صرف ان لوگوں کی اصلاح سے مایوس ہوگئے بلکہ ان کو شامیوں کے لیے خطرہ تصور کرنے لگے اور وہ اس بات سے حد درجہ خائف تھے کہ شام کے لوگ کہیں کسی تحریک کا شکار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عثمان رضہ کو ایک خط لکھا جس میں ان لوگوں کو اپنے یہاں مقیم رکھنے سے معذرت چاہی۔ حضرت عثمان رضہ نے معذرت قبول کرتے ہوئے لکھا کہ ان کو ان کے شہر واپس کر دو۔ یہ لوگ کوفہ واپس پہنچتے ہی سعیدؓ معاویہ رضہ اور حضرت عثمان رضہ کے خلاف خیالات کا اظہار کرنے لگے، اور ان کی تحریک کچھ پھیلنے لگی، سعیدؓ نے پھر حضرت عثمان رضہ کو لکھا کہ وہ ان لوگوں کے کوفہ میں قیام سے معاف رکھیں، حضرت عثمان رضہ نے جواب دیا کہ ان لوگوں کو جزیرہ میں جلا وطن کر کے عبدالرحمٰن بن خالد بن الولیدؓ کے پاس بھیج دے جو امیر معاویہ رضہ کی طرف سے حمص اور جزیرہ پر حاکم تھے۔ چنانچہ یہ لوگ عبدالرحمٰنؓ کے پاس بھیج دیئے گئے جس نے ان کے ساتھ نہایت شدت برتی اور سخت اہانت آمیز سلوک کیا، وہ دلیل اور مناظرے سے نہیں، سخت کلامی اور بدسلوکی کے زور سے اپنی، اپنے باپ اور قریش کی بات منواتا تھا۔ چنانچہ خود سوار ہو کر چلتا تھا اور ان کو اپنے رکاب میں پیادہ پا چلنے پر مجبور کرتا تھا، انھیں ڈانٹتا تھا، سخت سست کہتا تھا۔ انھیں دوسروں کے لیے

عبرت بنائے ہوئے تھا۔ جب یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تو انھوں نے توبہ کی اور اطاعت کا اعلان اور معافی بھی چاہی۔ عبدالرحمٰن نے ان کی معافی قبول کرلی اور ان میں سے اشتر کو توبہ اور معافی کے ساتھ حضرت عثمان رض کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت عثمان رض نے اس کو اجازت دی کہ وہ جہاں چاہے جائے اس نے عبدالرحمٰن کے پاس اپنے دوستوں میں رہنا پسند کیا۔ لیکن یہ قیام زیادہ عرصہ تک نہیں رہا۔ جیسے ہی سعید حضرت عثمان رض کے پاس آیا، یہ جلاوطن دوڑ پڑے اور طے کیا کہ وہ سعید کی راہ میں حائل ہوگئے انھوں نے اپنے ساتھیوں کو خط لکھ کر بلوایا اور بڑی تیزی کے ساتھ کوفہ پہنچے اور یقین کرلیا کہ اگر ان کی تلواریں ہاتھوں میں ہیں تو سعید کوفہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر ایک جماعت بنا کر جس کی قیادت اشتر کر رہا تھا مقام جرعہ تک پہنچے اور سعید کا انتظار کرنے لگے۔ تا آنکہ سعید آیا اور اس کو واپس چلے جانے پر مجبور کر دیا اور حضرت عثمان رض پر جبر کیا کہ وہ سعید کو معزول کر کے کسی اور کو ان کا حاکم مقرر کریں۔ ان لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری رض کو پسند کیا، حضرت عثمان رض کے لیے منظوری کے سوا چارہ کار نہ تھا، کوفہ والے اس طرح حضرت عثمان رض کو دو مرتبہ مجبور کر چکے کہ اپنا حاکم معزول کر دیں۔ ایک ولید کو معزول کرایا اس لیے کہ وہ لہو و لعب میں مبتلا تھا، متکبر تھا، تمسخر کرتا تھا اور شراب پیتا تھا۔ دوسرے سعید کو معزول کرایا۔ اس لیے کہ وہ نہایت سخت ظالم تھا اور قریشی امتیاز رکھنے میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ ولید کی معزولی کے موقع پر کوفہ والوں نے کسی کا نام پیش نہیں کیا تھا۔ حضرت عثمان رض نے سعید کو مقرر کر دیا، لیکن سعید کی معزولی پر انھوں نے حضرت عثمان رض کے لیے اپنی پسند کا اختیار بھی نہیں دیا۔ بلکہ صحابہ رض میں سے ایک کو پسند کیا جو یمنی بھی تھے۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعری رض نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ اور قدرے سکون ہوا۔ لیکن یہ سکون تھوڑے ہی دن باقی رہا۔

ابوموسیٰ کی بصرہ سے معزولی اور عبید بن عامر کا تقرر

حضرت عمر رض نے ابوموسیٰ اشعری رض کو بصرے کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت عثمان رض نے ان کو برسرِ حکومت کے منصب پر باقی رکھا، کچھ راوی تین سال اور اکثر چھ سال بتاتے ہیں، بصرہ کے باشندوں میں اکثریت مضریوں کی تھی، ربعی بھی بہت تھے، یمنیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ کسی مصلحت سے فاروق اعظم رض نے چاہا تھا کہ بصرہ کا حاکم جہاں مضریوں کی اکثریت تھی یمنی ہو، اور کوفہ کا گورنر جہاں یمنیوں کی اکثریت تھی

ایک ثقفی یعنی مغیرہ بن شعبہ ہو۔ اور شام اور مصر کے صوبوں میں جو یمنی عربوں کی اکثریت والے صوبے تھے دو قریشی مضری حاکم بنائے جائیں۔ غالباً حضرت عمرؓ کا اس سے مقصد یہ تھا کہ عصبیت کے جذبات کا مقابلہ کرکے اس کا خاتمہ کیا جائے پس انھوں نے رعایا اور حاکم کے قبیلے میں فرق کیا بصرہ کے معاملات ابو موسیٰ اشعری رض کے ماتحت عثمانی عہد میں برسوں ٹھیک رہے۔ نہ حاکم کو رعایا سے کوئی شکایت پیدا ہوئی نہ رعایا کو اپنے حاکم سے۔ ابو موسیٰ رض صحابہ میں ممتاز اور مقدم تھے نیک سیرت پاکیزہ خصلت، فتوحات میں غیر معمولی حصہ لینے والے، لیکن عثمانی عہد میں عصبیت نے زور پکڑا، ہر قبیلہ مطلبی بن کر اپنی مصلحتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ قریش اور حضرت عثمان رض کے رشتہ دار تو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چار بڑے صوبوں میں سے تین کے حاکم قریشی تھے۔ کوفہ کے حاکم ولید بن عقبہ اور پھر سعید ہوئے شام کے حاکم معاویہؓ بن ابی سفیانؓ تھے مصر کے لیے پہلے عمرو بن العاصؓ کا تقرر ہوا اور بعد میں عبداللہ بن سعد بن سرح کا۔

اب ایک ہی صوبہ رہ گیا تھا جس کا حاکم نہ اموی تھا نہ قریشی اور نہ مضری بلکہ یمنی تھا، اسی طرح ابو موسیٰ اشعری رض کی پوزیشن بالکل الگ تھی، وہ اکیلے ایسے یمنی حاکم تھے جن کی حکمرانی میں ایک اہم شہر تھا اور اس میں مضریوں کی اکثریت تھی، قریش اس سے غافل نہ تھے، حضرت عثمان رض کے رشتہ دار بھی خیال کر رہے تھے اور خود بصرہ کے مضری بھی محسوس کرتے تھے۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ بنی ضبّہ کا ایک مضری شخص جس کا نام غیلان بن خرشہ ضبی ہے حضرت عثمان رض کے پاس آیا اور کہنے لگا، تمھارے پاس کوئی لڑکا نہیں ہے جسے جوان کرکے بصرہ کا گورنر بنادو۔ یہ بوڑھا کب تک بصرہ کا گورنر بنا رہے گا ابو موسیٰ رض حضرت عمر رض کی وفات کے بعد سے چھ سال تک بصرہ کے گورنر رہے، پھر حضرت عثمان رض نے ان کو معزول کر دیا، یہ بھی ایک روایت ہے کہ بعض مفتوحہ علاقوں میں سے ایک نے ابو موسیٰ رض کے خلاف سر اٹھایا تو انھوں نے جہاد پر آمادہ کرتے ہوئے لوگوں میں تقریریں کیں اور رغبت دلائی، کہ پاپیادہ دشمن پر حملہ کریں، چنانچہ کچھ لوگ آمادہ ہو گئے۔ اور بعض منتظر رہے کہ دیکھیں حاکم خود کیا کرتا ہے، جب ابو موسیٰ رض نکلے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ سوار ہیں اور چالیس خچروں پر اپنا سامان لادے ہوئے ہیں تو وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے ہمیں بھی ان خچروں پر سوار ہونے دیجیے، ابو موسیٰ رض نے ان کو ڈانٹا اور وہ لوگ واپس ہو گئے اور حضرت عثمان رض کی خدمت میں ایک وفد بھیجا، جس میں درخواست کی کہ ابو موسیٰ رض سے ہم کو معاف رکھیے، جب حضرت عثمان رض نے ان سے پوچھا کہ پھر وہ کس کو پسند کرتے ہیں۔ تو انھوں نے کسی کا نام پیش نہیں کیا بلکہ یہ کہہ دیا کہ جس کو آپ چاہیں، والی بنا دیجیے، آپ جس کو بھی پسند کریں گے وہ ان کا بدل ہوگا۔ وفد نے مزید کہا کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے، ہم

نہیں چاہتے کہ وہ سب کا سب آپ کے سامنے پیش کر دیں، ان لوگوں نے ابو موسیٰ پر الزام لگایا کہ وہ ہماری زمینیں کھا رہے ہیں اور اپنی اشعری قوم کو کھلا رہے ہیں، حضرت عثمان رض نے ابو موسیٰ کو معزول کر دیا اور اپنے ماموں کے لڑکے عبداللہ بن عامر بن کریز کو بصرے کا حاکم بنا دیا، جب وہ گورنر بن کر بصرہ آئے تو ان کی عمر پچیس[۲۵] سال کی تھی۔

جب ابو موسیٰ رض کو اس نوجوان کے تقرر کا پتہ چلا تو آپ کو اس میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آیا۔ آپ نے لوگوں سے کہا اب تمھارا حاکم ایک ایسا نوجوان آرہا ہے جو بے چین حوصلہ اور بیتاب ہمت رکھتا ہے، اونچے خاندان کا ہے اس کی حکومت میں دو شہر ایک ساتھ ہوں گے[۱]

بڈھے کی یہ بات غلط نہ تھی۔ عبداللہ بن عامر قریشی جوانوں میں بلا کا بہادر، بیدار مغز، باہیبت ارادے اور ہمت کا قوی جوان تھا۔ مشکلات کا حل خوب جانتا تھا، فتوحات کے میدان میں خود اترا، اور عوام کو بھی اتارا، اس سلسلے میں وہ سعید بن العاص سے بھی بازی لے گیا، لوگوں کے ساتھ اس کا طرز عمل ایک باہمت شریف عالی آدمی کا سا تھا، یہی وجہ ہے کہ بصرہ والوں کے ہاتھوں اس کا وہ انجام نہیں ہوا جو کوفہ میں ولید اور سعید کا اور مصر میں عبداللہ بن ابی سرح کا ہوا۔ ایک طرف اس کی پختہ سیرت، تدبر اور دور اندیشی تھی اور دوسری طرف رعایا میں مضریوں کی اکثریت، عبداللہ کو کامیابی اور مقبولیت کا موقع ملا، لیکن پھر بھی بصرہ شہر سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکا، اس لیے کہ بصرہ والوں کی ایک جماعت حضرت عثمان رض کے خلاف خروج کرنے میں اس کی ساتھی تھی۔ اگرچہ یہ جماعت مختصر تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بھی حضرت عثمان رض اور ان کے حاکم سے پوری طرح خوش نہ تھا اور جو شکایتیں کوفہ والوں کو تھیں بصرہ اس سے بالکل خالی نہ تھا۔ کوفہ والوں کی، یہاں کے بعض باشندوں کو بھی شہر بدر کیا گیا اور شام بھیجا گیا، لیکن بصرہ والوں کی جلاوطنی بدگمانی کی بنا پر کھلی ہوئی زیادتی تھی اور امیر معاویہ رض کو بہت جلد پتہ چل گیا، ہوا یہ کہ عبداللہ بن عامر سے کسی نے عامر بن عبدالقیس کی چغلی کھائی کہ وہ بعض ایسے مسائل میں جو خدا کی طرف سے حلال ہیں، مسلمانوں سے اختلاف کرتا ہے، چنانچہ وہ گوشت نہیں کھاتا شادی نہیں کرتا اور جمعہ میں حاضر نہیں ہوتا، عبداللہ بن عامر نے اس کی اطلاع حضرت عثمان رض کو دی بعض راویوں کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رض نے عامر بن عبدالقیس کو مدینہ طلب کیا اور جب معلوم ہوا کہ اس پر غلط الزامات لگائے گئے ہیں تو فوراً اعزاز کے ساتھ اس کو بصرہ واپس کر دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عثمان رض نے بصرہ کے حاکم کو ہدایت کی کہ وہ اس کو امیر معاویہ رض کے پاس بھیج دے، جب وہ

---

[۱] طبری، واقعات ۲۹ھ

امیر معاویہ رضؓ کے پاس پہنچا تو کھانے میں شرکت کی۔ امیر معاویہ رضؓ نے دیکھا کہ وہ گوشت کھاتا ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ یہ الزام غلط ہے، پھر انھوں نے اس سے باز پرس کی تو اس نے جواب میں کہا کہ گوشت سے پرہیز کی بنیاد یہ ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ایک قصاب کو دیکھا کہ وہ ذبح کے وقت بکری کے ساتھ بڑی بے رحمی کر رہا تھا۔ جمعہ کی نماز کے سلسلے میں اس نے کہا، وہ مسجد میں سب سے پچھلی صف میں پہنچتا ہے اور سب سے پہلے نکل آتا ہے، شادی کے متعلق اس نے کہا کہ اس کی نسبت طے ہو رہی تھی کہ بصرہ سے اس کو نکال دیا گیا، امیر معاویہ رضؓ نے چاہا کہ اس کو بصرہ واپس کر دیں لیکن اس نے اس شہر میں جانے سے انکار کر دیا جہاں کے لوگ چغلی کھاتے ہیں اور جلا وطن کرتے ہیں، پھر وہ شام ہی میں ٹھہر گیا اور زہد و اتقار کی زندگی گذارنے لگا۔ امیر معاویہ رضؓ بھی اس سے محبت کرنے لگے اور از راہ ہمدردی جب کبھی رستے میں مل جاتا اس سے سوال کرتے کہ اگر کچھ ضرورت ہو تو پوری کردوں، وہ جواب دیتا کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ ایک مرتبہ جب امیر معاویہؓ نے بہت اصرار کیا تو کہا آپ کے اس شہر میں روزہ بہت بے کیف ہے اگر ہو سکے تو بصرہ کی کچھ گرم ہوائیں لا دیجیئے۔

میرے خیال میں حضرت عثمان رضؓ کو دو ہی حاکم ایسے ملے جو خاطر خواہ تھے۔ بصرہ میں عبداللہ بن عامر، اور شام میں امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ، عراق کے دونوں شہروں کی ہم نے سیر کرلی اور مشاہدہ کرکے معلوم کرلیا کہ لوگوں کو عبداللہ بن عامر پر صرف یہ اعتراض ہے کہ وہ حضرت عثمان رضؓ کا رشتہ دار ہے اور یہ کہ وہ کمسن ہے اور ابو موسیٰؓ کے بعد آیا ہے، لوگوں کے ساتھ اس کے طرز عمل میں قریشی امتیاز نمایاں رہتا ہے، جو گو صحابہ رضؓ کے اخلاق سے میل نہیں کھاتا لیکن مصریوں کی عصبیت کے لیے، فتوحات کے لیے، ان کے حوصلوں اور مالِ غنیمت کے لیے ان کی حرص و ہوس کے مناسب حال تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عامر سمجھ گیا تھا کہ اس کی حکومت کے خلاف عوام کے اعتراضات کیا ہیں، اس لیے بڑی کوشش کے ساتھ اس نے معترضین کو بتانا چاہا کہ وہ گورنری کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور اس کا مستحق ہے، اس نے دین کی بعض باتوں میں غلو سے کام لیا، کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ فتوحات کے سلسلے میں اس مقام تک پہنچ گیا جہاں جانا چاہتا تھا، لوگوں نے کہا "آپ نے تو فتوحات میں ریکارڈ قائم کر دیا" اس نے جواب میں کہا اس میں کیا شک ہے اور اب میں خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے اسی مقام سے عمرے کا احرام باندھوں گا، حضرت عثمان رضؓ نے سرزنش کی کہ ایران کے اندرونِ ملک سے احرام باندھا حالانکہ احرام کے لیے مقررہ میقات ہیں، اس سے پہلے وہی شخص احرام باندھ سکتا ہے جو اپنے نفس پر زیادتی کرتا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عبداللہ بن عامر اس بات کی کس قدر کوشش کرتا تھا کہ

لوگ اس کے کردار کی دین و دنیا دونوں اعتبار سے تعریف کریں۔

اس کے بعد ہم کو شام کا رُخ کرنا چاہیئے۔

پُورا شام امیر مُعاویہ رضہ کے اقتدار میں

عثمانی عہد میں امیر معاویہ رضہ تمام گورنروں سے زیادہ خوش نصیب اور ہر حیثیت سے کامیاب گورنر تھے۔ حضرت عمر رضہ نے ان کو دمشق کا حاکم بنایا تھا۔ جب ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان رضہ کا انتقال ہوا جو اُردن کے حاکم تھے تو حضرت عمر رضہ نے ان کا کام بھی امیر معاویہ رضہ کے سپرد کر دیا۔ ابوسفیان رضہ نے اس پر حضرت عمر رضہ کا شکریہ ادا کیا، لیکن امیر معاویہ رضہ فاروق اعظم رضہ کی نگاہ میں بہت پسندیدہ نہ تھے اور نہ بھائی کا منصب ان کو دے کر ابوسفیان رضہ کے ساتھ کوئی غمخواری یا ہمدردی کی۔ بات صرف اتنی تھی کہ آپ نے معاویہ رضہ میں قابلیت، ہمت اور دوراندیشی دیکھی اور چاہا کہ اُردن کا کام سنبھال لیں، انھوں نے سنبھال لیا۔ حضرت عمر رضہ کی وفات کے وقت ان دونوں شہروں کے امیر معاویہ رضہ تھے۔ حضرت عثمان رضہ نے ان کو بدستور باقی رکھا، جس طرح سال بھر تک انھوں نے حضرت عمر رضہ کے تمام گورنروں کو ان کے عہدوں پر باقی رکھا اس کے بعد فلسطین کے حاکم علقمہ کنانی کا انتقال ہوتا ہے اور حضرت عثمان رضہ فلسطین کی حکومت بھی امیر معاویہ رضہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر حمص کے فاروقی حاکم امیر بن سعد انصاری بیمار ہوتے ہیں اور حضرت عثمان رضہ سے استعفیٰ کی درخواست کرتے ہیں، حضرت عثمان رضہ ان کی درخواست منظور کرکے حمص کی حکومت بھی امیر معاویہ رضہ کے حوالے کر دیتے ہیں، اس طرح شام کی سرزمین بہ تمام و کمال حضرت امیر معاویہ رضہ کے زیر حکومت آجاتی ہے اور وہ عثمانی عہد کے سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان گورنر بن جاتے ہیں، ان کی حکومت میں چار بڑے شہر جمع ہو جاتے ہیں اور جغرافیائی مرکز کے اعتبار سے ان کی قوت غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی ہے، ان کی حکومت حجاز اور مصر کے درمیان واقع تھی۔ حجاز خلافت کا مرکز اور امیر المومنین کا مستقر تھا، مصر قوت اور شوکت میں شام کی برابری کا صوبہ تھا اور زرخیزی اور دولت میں اس سے بڑھا ہوا۔ ان کی حکومت ایک طرف بحر روم کے سواحل اور دوسری طرف رومی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی، جہاں سے وہ ضرورت پڑنے پر خلیفہ سے مدد لے سکتے تھے اور خلیفہ کو مدد پہنچا بھی سکتے تھے، اسی طرح مصر سے بھی بروقت امداد لی اور دی جا سکتی تھی۔

علاوہ ازیں ان کے سامنے جہاد کے دو بڑے دروازے کھلے تھے، ایک بحری سمت کا اور دوسرا رومی سرحدوں کی برّی سمت کا، پس ان کے امکان میں تھا کہ وہ اپنی شان بلند کریں اور حکومت کی بھی۔ اور اسلام کا بول بالا کر کے اپنے لیے عزت کا ایسا بلند مقام حاصل کریں جہاں تک کسی گورنر کی رسائی نہ ہو سکے۔

امیر معاویہ رض کا دور شام میں کافی لمبا دور رہا۔ حضرت عمر رض کی پوری خلافت، پھر حضرت عثمان رض کا پورا عہد، اس طویل مدت میں ان کو شام کے جاننے پہچاننے کا کافی موقع ملا۔ وہ شام والوں سے خوش اور شام والے ان سے خوش تھے پھر دونوں خلیفہ بھی ان سے راضی رہے۔ رعایا کے ساتھ ان کے گہرے اور اچھے تعلقات نے اور حکومت کی طویل مدت نے ان کو گورنر نہیں بادشاہ جیسا بنا دیا تھا خلافت کی تاریخ ایسا کوئی گورنر نہیں جانتی جس کی حکومت ان کی حکومت کی طرح طویل مضبوط اور بتدریج وسعت پذیر ہوئی ہو، پس کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی اگر وہ اپنے کو کامیاب اور خوش قسمت تصور کریں۔ وہ دیکھتے تھے کہ حضرت عمر رض اور حضرت عثمان رض کی خلافت کے دور میں وقتاً فوقتاً حاکموں کی برطرفی ہو رہی ہے اور وہ اپنی جگہ برابر جمے ہوئے ہیں اور یکے بعد دیگرے صوبے ان کی حکومت میں ضم ہو رہے ہیں، اگر امیر معاویہ رض اپنے کاموں میں کوتاہی کرتے یا رعایا پر زیادتی، تو حضرت عمر رض ہرگز ان کو باقی نہ رہنے دیتے۔ اور نہ صرف معزول کر دیتے بلکہ اگر ضرورت پڑتی تو سزا بھی دیتے حضرت عمر رض کی وفات سے حضرت عثمان رض کے خلیفہ ہونے تک غالباً امیر معاویہ رض نے شام والوں کے ساتھ اپنے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور انقلاب خلافت کے بعد بھی اپنا سابقہ سلوک باقی رکھا اور اس بات کی ضرورت باقی نہ سمجھی کہ ایک سخت گیر اور متشدد خلیفہ کے عہد میں جس طرز عمل کے پابند رہے، ایک نرم اور چشم پوش خلیفہ کے وقت اس میں تبدیلی کر دیں، یہی وجہ ہے کہ دوسرے صوبوں کی رعایا نے اپنے حاکموں کی بدنامی اور خلیفہ کی بغاوت میں جو کارروائیاں کیں، شام کی رعایا اس سے بالکل الگ رہی، چنانچہ حضرت عثمان رض کا محاصرہ کرنے والے کوفہ سے، بصرہ سے اور مصر سے آئے۔ لیکن شام سے ایک آدمی بھی نہیں گیا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان رض جب کسی کو اپنی یا اپنے کسی گورنر کی مخالفت کی وجہ سے جلاوطن کرنا چاہتے تو خواہ وہ مدینہ کا ہو اس کو شام بھیج دیتے، آگے چل کر تم کو معلوم ہوگا کہ جب آپ ابوذر رض سے تنگ ہوئے تو ان کو شام بھیج دیا تاکہ مدینے کے لوگ ان کی زبان اور ان کی تحریک سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ وہ بسلسلۂ جہاد شام پہنچ گئے اور وہاں کے دفتر میں ان کا نام لکھا گیا۔

پس امیر معاویہ رضؓ کا تدبر اور ان کی دور اندیشی وہ سہارا تھا جو حضرت عثمان رضؓ اس وقت لیتے جب اپنے یا اپنے عمال کے کسی شدید مخالف کو سیدھا کرنا چاہتے اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ امیر معاویہ رضؓ خود حضرت عثمان رضؓ سے بھی بڑے مدبر اور دور اندیش تھے۔ وہ ان جلاوطنوں سے ملتے۔ ان کی اصلاح کی کوشش کرتے، ہاں جب مایوس ہوجاتے تو حضرت عثمان رضؓ سے معذرت خواہ ہوتے اور حضرت عثمان رضؓ ان کی کوئی درخواست رد نہیں فرماتے۔

امیر معاویہ رضؓ نے اپنی کامیابی اور خوش قسمتی سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ چنانچہ وہ شام میں چین سے بیٹھے صرف حکومت کے کاموں پر قانع نہیں رہے بلکہ معرکوں اور فتوحات کے لیے بے چین تھے۔ فاروق اعظم رضؓ کے عہد میں تو ان کی کیفیت اس گھوڑے کی سی تھی جو دوڑنے کی بیتابی میں لگام چباتا رہے۔ لیکن حضرت عمر رضؓ ان کو روکتے تھے اور اجازت نہیں دیتے تھے، بحری لڑائیوں کیلئے وہ جس طرح اصرار کے ساتھ درخواست کرتے تھے۔ حضرت عمر رضؓ اسی شدت کے ساتھ مسترد فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت عمر رضؓ نے ان کو تنبیہ کردی کہ آئندہ وہ سمندر کی بات نہ کریں۔ پھر جب حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے وہی درخواست ان کے سامنے پیش کردی۔ حضرت عثمان رضؓ نے اس شرط پر منظور کرلی کہ مجاہدوں کا انتخاب وہ خود نہ کریں اور نہ قرعہ اندازی سے فیصلہ ہو بلکہ لوگوں کے اختیار کی بات ہو۔ چنانچہ جس نے اپنی مرضی سے حصہ لینا پسند کیا اس کو منظور کیا اور اس کی مدد کی اور جس کا جی نہ چاہا اس کو عافیت سے رہنے دیا، تھوڑے ہی دنوں بعد امیر معاویہ رضؓ نے بحری بیڑہ تیار کیا اور پچاس یا اس سے بھی زیادہ بحری لڑائیاں لڑیں۔ یہ دیکھ کر مصر کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح کی رگِ حمیت بھی پھڑکی اور ان کے نقش قدم پر چل پڑا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ قبرص پر شام کی طرف سے امیر معاویہ رضؓ نے اور مصر کی طرف سے ابن ابی سرح نے حملہ کیا اور دونوں کی فوجیں جزیرے میں آکر مل گئیں۔

رومی شہروں سے متصل سرحدوں کی حفاظت بھی امیر معاویہ رضؓ کا ایک فرض تھا چنانچہ وہ سرما اور گرما دونوں موسموں میں دشمنوں سے نبرد آزما رہے۔ اور اس طرح کافی مال غنیمت حاصل کرکے ایک طرف فوج کو خوش کرتے اور دوسری طرف بیت المال کو کامیاب بناتے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان رضؓ ہی نے امیر معاویہ رضؓ کے لیے وہ راستہ ہموار کیا جس پر چل کر ان کو موقع ملا کہ وہ ایک دن ابی سفیان رضؓ کی اولاد میں خلافت منتقل کرکے اس کو بنی امیہ کے لیے مستقل کردیں۔ حضرت عثمان رضؓ ہی نے حمص اور فلسطین کو ضم کرکے امیر معاویہ رضؓ کے حدود حکومت میں وسعت کردی

اور ایک شامی وحدت بنا دی۔ جس کے گوشے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت عثمان رض ہی تھے چار بڑے مرکزی شہروں کی قیادت ان کو دی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی سب سے بڑی اور سب سے اعلیٰ فوج ان کے قبضے میں تھی۔ پھر حضرت عثمان رض اپنی خلافت کے پورے دور میں حکومت کے معاملات میں ان کو موقع دیتے رہے۔ جیساکہ حضرت عمر رض نے دیا، پھر شام کے معاملات میں انھوں نے حضرت عمر رض سے بھی زیادہ ان کو اختیار اور آزادی دے دی۔ پھر جب فتنے کے دن آئے تو امیر معاویہ رض نے دیکھا کہ حاکموں میں وہ سب سے زیادہ پرانے گورنر ہیں، ان کی فوج سب سے زیادہ طاقتور فوج ہے اور وہ تمام حاکموں سے زیادہ اپنی رعایا پر قابو رکھتے ہیں۔

اگر حضرت عثمان رض حضرت عمر رض کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تو ان کے بس میں تھا کہ وہ دمشق اور اُردن پر امیر معاویہ رض کو رکھتے۔ اور حمص اور فلسطین کی حکومتوں کو براہ راست مدینہ سے ملا دیتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ایک طرف حضرت عمر رض کی اتباع کرتے اور دوسری طرف ممتاز صحابہ رض اور نوجوان عربوں کے لیے ایسے کام مہیا کر سکتے جس سے ان کی بیکاری دور ہوتی، ان کی ناراضی اور غصے کی بھی روک تھام ہوتی اور مخالفت اور بغاوت پر آمادہ کرنے والے جذبات بھی مُردہ ہو سکتے، اگر حضرت عثمان رض ایسا کرتے تو فتنے کی آگ بھڑک اٹھنے پر امیر معاویہ رض من مانے اقدامات نہ کر سکتے اور مسلمانوں کو موقع ملتا۔ کہ وہ اپنے معاملات شوریٰ کے ذریعے طے کرتے۔ لیکن امیر معاویہ رض کو ان کی وسیع اور مضبوط حکومت نے قدم جمانے کا موقع دیا اور ایسی فرصت مہیا کی کہ وہ مصر میں اپنا آدمی بھیج کر اس کو مرکزی خلافت سے الگ کر دیں۔ حجاز اور دوسرے عربی بلاد میں حضرت علی رض کے خلاف اپنی حمایت کی فضا پیدا کریں۔ اور حضرت علی رض جب آنکھ کھولیں تو ان کو معلوم ہو کہ امیر معاویہ رض حکومت کے بہترین شہروں اور صوبوں پر قابض ہیں، یہ سب امیر معاویہ رض کی مہارت اور ان کی زبردست حکومت کا کرشمہ ہے۔

عمرو بن العاص رض کی معزولی
اور
ابن ابی سرح کا تقرر

شام کو چھوڑ کر اگر ہم مغرب کی طرف چل پڑیں تو مصر پہنچیں گے، حضرت عمر رض نے مصر پر عمرو بن

العاص رضؓ کو حاکم مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمان رضؓ نے ان کو دوسرے فاروقی حاکموں کی طرح باقی رکھا۔ لیکن جیسے ہی ایک سال پورا ہوا، ان کے رشتہ داروں کی نگاہیں ادھر اٹھنے لگیں۔ عمرو بن العاصؓ کی معزولی اور ان کی جگہ ابن ابی سرح کے تقرر میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ مصریوں نے حضرت عثمان رضؓ سے عمرو بن العاص رضؓ کی شکایت کی۔ اس پر انھوں نے ان کو برطرف کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عمرو بن العاص رضؓ کی معزولی مصریوں کی ناراضی یا شکایت کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ وہ ایک چال تھی جس سے ایک حاکم معزول اور اس کی جگہ دوسرا مقرر ہو گیا۔ راویوں کے بیانات سے جو بات نمایاں ہوتی ہے وہ یہ کہ حضرت عثمان اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن ابی سرح کو کسی بڑے کام کے لیے پیش کر رہے تھے۔ راویوں کا بیان ہے کہ عمرو بن العاص رضؓ نے افریقہ پر حملہ کیا اور مختصر سا مالِ غنیمت لے کر واپس آگئے۔ اس سلسلے میں مناسب بات یہی تھی کہ حضرت عثمان رضؓ اپنے مصر کے حاکم ہی کو یہ موقع دیتے کہ وہ اپنی سرحدوں پر پہلے اطلاعی، اور پھر فاتحانہ اقدام کرتا، جیسا کہ کوفہ اور بصرہ اور شام کے صوبوں میں وہاں کے حاکم کرتے رہتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمان رضؓ نے عمرو بن العاص رضؓ کو مزید اقدام سے روک دیا اور افریقیا ایک فوج بھیجی جو مصر کے گورنر کے ماتحت نہ تھی بلکہ اس کا تعلق براہِ راست مدینہ سے تھا اور اس فوج کا امیر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا اور اس کو کہا کہ اگر تو نے افریقیا فتح کر لیا تو مالِ غنیمت میں تجھ کو خمس کا پانچواں حصہ ملے گا۔

ایک فطری بات تھی کہ حضرت عثمان رضؓ کے اس طرزِ عمل سے عمرو بن العاص رضؓ ناراض ہوں اس لیے کہ اس طرح انھوں نے ہم عصروں میں مصر کے والی کا درجہ کم کر دیا۔ حضرت عمرؓ اس سے قبل سرحدوں پر خود فوجیں نہیں بھیجا کرتے تھے۔ یہ معاملہ صوبوں کے گورنروں کا تھا۔ رومی سرحدوں پر امیر معاویہ رضؓ اور سرزمین فارس میں بصرہ اور کوفہ کے حاکم معرکہ آرا تھے، ان معرکوں میں خلیفہ کا مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ لیکن اصل کمان اور نگرانی گورنروں کی تھی جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت عثمان رضؓ نے افریقیا کی فتح پر غیر معمولی توجہ کی اور ابن ابی سرح کی نصرت اور قوت کے لیے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ساتھ کر دی جس میں چند صحابہ رضؓ اور کچھ قریش کے نوجوان اور بہت سے انصاری شریک تھے اور تاکید کر دی کہ افریقیا کی فتح سے فارغ ہو کر فوج کا ایک دستہ بحری راستے سے اندلس سے مقابلہ کے لیے بھیج دینا۔ ابن ابی سرح نے افریقیا فتح کر لیا۔

اور بہت سا مالِ غنیمت لوگوں میں تقسیم کیا، اور خمس کا پانچواں حصہ لے کر باقی حضرت عثمان رضؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس پانچویں حصے کو مروان بن الحکم نے ایک لاکھ یا دو لاکھ دینار میں خرید لیا۔ اور قیمت کا کچھ حصہ ادا کیا باقی حضرت عثمان رضؓ نے اس کو ہبہ کر دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ ابن ابی سرح کے ساتھ حضرت عثمان رضؓ کے اس امتیاز سے فوجی سخت ناراض ہوئے۔ اور اس سلسلے میں گفت وشنید کے لیے ایک وفد حضرت عثمان رضؓ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت عثمان رضؓ نے جواب دیا کہ میں نے عبداللہ کو اس کے حصے سے کچھ زیادہ دیا ہے۔ اگر تمھیں بھی منظور ہو تو رہنے دو۔ اور اگر تم ناراض ہوتے ہو تو عبداللہ کو وہ واپس کرنا ہوگا۔ وفد نے جواباً کہا کہ ہم سب سخت ناراض ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ نے کہا تو پھر وہ واپس ہے، اس کے بعد وفد نے مطالبہ کیا کہ عبداللہ کو برطرف کر دیا جائے۔ اس لیے کہ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کے بعد ہمارے ان کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں رہ سکتے۔ یہ بات حضرت عثمان رضؓ نے مان لی اور عبداللہ کو لکھا کہ جو کچھ اس نے لیا ہے، وہ واپس کر دے اور برطرف ہو جائے۔ عبداللہ اس کے بعد مصر آئے، اور ان کا دل ناکامی اور حسرت کے جذبات سے ملول تھا۔ کہ اللہ نے ان کے ہاتھ پر ایک اہم سرزمین کی فتح لکھی تھی اور پھر ان کو اپنی مفتوحہ سرزمین سے واپس آنا پڑا۔ اور اس مال سے بھی محروم ہونا پڑا، جو حضرت عثمان رضؓ کا عطیہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان رضؓ کے رشتہ دار عبداللہ بن سعد کے اس واقعے سے برہم ہوئے اور چاہا کہ ان کو اس سے بہتر سے بہتر معاوضہ بہرحال ملے چنانچہ وہ حضرت عثمان رضؓ کے ساتھ لگے رہے۔ تاآنکہ انھوں نے عبداللہ کو مصر میں خراج کی وصولی کا افسر مقرر کیا اور عمرو بن العاص رضؓ کے ذمے جنگ اور انتظام کے معاملات کیے۔ اس کا لازمی نتیجہ دونوں میں اختلاف کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عمرو بن العاص رضؓ نے عبداللہ کو بعض ایسی کارروائیوں پر آمادہ کیا ہو، جس کے نتیجہ میں افریقیا کی حکومت بھی گئی اور جو کچھ ملا تھا وہ بھی چھن گیا۔ واقعہ کچھ بھی ہوا ہو، بہرحال دونوں میں بدمزگی اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد عبداللہ نے حضرت عثمان رضؓ کو لکھا کہ خراج کی وصولی کی راہ میں عمرو بن العاص رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں اور عمرو بن العاص رضؓ نے یہ شکایت کی کہ عبداللہ جنگی تدابیر میں رخنہ اندازی کرتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت عثمان رضؓ کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ عبداللہ کو مدینہ بلا لیتے اور مصر کی حکومت عمرو بن العاص رضؓ کے ماتحت رہنے دیتے۔ فاروق اعظم رضؓ دنیا سے ان کی حکومت سے خوش گئے تھے، اور اگر تبدیلی کے بغیر چارہ نہ تھا تو دونوں کو برطرف کر دیتے اور مصر کے معاملات کسی

دوسرے قریشی یا غیر قریشی کے حوالے کرتے۔ اس طرح عمرو بن العاص رض کے غصے کا زور توڑ دینا اور کچھ دنوں کے لیے قریش کی باری موقوف کر دینا ایک معقول بات ہوتی۔ لیکن انھوں نے عمرو بن العاص رض کو معزول کر دیا اور مالیات اور انتظام دونوں شعبے عبداللہ کے سپرد کر دیئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے عمرو بن العاص رض کو اپنا ایک مستقل مخالف بنا لیا۔

حضرت عثمان رض اور عمرو بن العاص رض میں بدمزگی یہیں تک آ کر نہیں رُکی بلکہ بات کچھ اور آگے بڑھی۔ حضرت عثمان رض نے ایک مرتبہ اشارتاً اور دوسری مرتبہ صراحتاً عمرو بن العاص رض کی دیانت پر شک بھی کیا۔ چنانچہ عمرو بن العاص رض ایک دن حضرت عثمان رض کے پاس بھر تو جبہ پہن کر آئے۔ خلیفہ نے سوال کیا کہ جبے میں کیا ہے؟ جواب ملا عمرو بن العاص رض، حضرت عثمان رض نے کہا میرا مطلب یہ نہیں ہے، یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ جبے میں تم ہو۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جبے میں روئی بھری ہے یا کوئی اور شے۔

ابن ابی سرح نے مصر سے حضرت عثمان رض کی خدمت میں بہت سا مال بھیجا، یہ مال جب حضرت عثمان رض کے پاس پہنچ رہا تھا تو عمرو بن العاص رض وہاں موجود تھے، حضرت عثمان رض نے کہا۔ عمرو! تمھیں کچھ پتہ ہے۔ اس اونٹنی نے تمھارے بعد بہت زیادہ دودھ دیا، عمرو بن العاص رض نے جواب دیا کہ ہاں لیکن اس کے بچے سب مر گئے، امیرالمؤمنین حضرت عثمان رض یہ بتانا چاہتے تھے کہ عمرو بن العاص رض مال کا کچھ حصہ خود رکھ لیا کرتے تھے۔ عمرو بن العاص رض نے اپنے جواب میں بتایا کہ حضرت عثمان رض کا عامل مصریوں سے ناقابل برداشت خراج وصول کرتا ہے[1]

عبداللہ بن سعد راستباز آدمی نہ تھا، مسلمان بھی اس سے خوش نہ تھے۔ پھر یہ وہ شخص ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادتی کی اور حد سے بڑھا ہوا مذاق کیا۔ قرآن مجید نے اس کی تکفیر اور برائی کی ہے۔ یہ عبداللہ قرآن مجید کا مذاق کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ اللہ کی طرح میں بھی قرآن نازل کر دوں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن جن لوگوں کے خون کا اعلان کیا تھا ان میں یہ عبداللہ بھی تھا۔ لیکن حضرت عثمان رض اس کو مسلمان بنا کر حضرت ﷺ کی خدمت میں لائے۔ تب آپ مجبور ہو گئے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مصری عبداللہ کے طرز عمل سے خوش نہ تھے، وہ ان کی طاقت سے باہر ان سے وصول کرتا تھا جس کی طرف عمرو بن العاص رض

---

[1] انساب الاشراف بلاذری مطبوعہ قدس ص ۲۶

نے اشارہ کیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ عبداللہ مصر کے غیر قریشی عربوں پر فوقیت اور برتری کا ایسا مظاہرہ کرتا تھا، جس نے ان کو سخت مخالف اور برداشتہ خاطر بنا دیا اور انھوں نے حضرت عثمان رضؓ سے اس کی شکایت کی، حضرت عثمان رضؓ نے عتاب نامہ بھیجا جس میں عبداللہ کو سخت تنبیہ کی اور حکم دیا کہ رعایا جس بات سے ناخوش ہو اس سے باز رہے لیکن عبداللہ نے اس کی کچھ پروا نہ کی، الٹے شکایت کرنے والوں کو سزا دی اور ایک کو تو اتنا مارا کہ وہ مر ہی گیا[1] اس کے بعد تو نہ صرف مصری ہی ناراض ہوئے بلکہ صحابہ کرام رضؓ کو بھی غصہ آگیا اور انھوں نے حضرت عثمان رضؓ پر زور ڈالا، تب آپ نے اس کو معزول کر دیا اور محمد بن ابوبکر رضؓ کو فرمانِ ولایت لکھ کر دیا اور ان کے ساتھ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت کر دی کہ عبداللہ اور مصریوں کے درمیان جو جھگڑا ہے اس کی تحقیقات کریں اس لیے کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت عثمان رضؓ سے مطالبہ کیا تھا کہ پہلے تو وہ عبداللہ کو معزول کر دیں اور پھر اس پر قتل کا جو الزام ہے اس کی تحقیقات کرائیں، اگر الزام ثابت ہو جائے تو قصاص لیں حضرت عثمان رضؓ کا محمد بن ابوبکر رحؒ کو مصر کا والی بنانا مسلمانوں کے لیے بڑی نحوست کا سبب بنا۔ اس لیے کہ حضرت عثمان رضؓ کے خلاف بغاوت کرنے والی پہلی ٹولی یہیں سے نکلی۔ پھر عراق کے دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کے لوگ بھی اس ٹولی میں شریک ہوگئے۔

ہاں عبداللہ ایک بہادر، جری اور بے باک اور فتوحات میں کامیاب تھا، افریقیا سے رومیوں کو بار بھگایا، قبرص کی جنگ میں حصہ لیا۔ مقام ذات الصواری میں رومی بیڑے کو شکست دی لیکن بہر حال وہ ایک دنیا دار آدمی تھا۔ دین سے اس کو کچھ نسبت نہ تھی۔

---

[1] انساب الاشراف بلاذری مطبوعہ قدس ص ۲۶۔

محمد بن ابو حذیفہ اور محمد بن ابو بکر رض

مصر میں حضرت عثمانؓ اور ان کے حاکم کی پالیسی سے بحث نا مکمل رہے گی اگر ہم ان دو قریشی جوانوں کا تذکرہ نہ کریں جن کا اس پالیسی کے انجام یعنی بغاوت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں جوان محمد ابن ابوحذیفہ رض اور محمد ابن ابوبکر رض ہیں۔ اول الذکر ایک معزز خاندان والے شریف باپ کے شریف بیٹے ہیں، ان کے باپ کا قریشی سرداروں میں ایک ممتاز درجہ ہے۔ ان کا نام عتبہ بن ربیعہ ہے ان کی لڑکی کا نام ہند ہے جو ابوسفیان کی بیوی اور امیر معاویہؓ کی ماں ہیں۔ ابوحذیفہ رض اسلام کے سابقین میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دارالارقم میں داخل ہونے اور اسلام کی دعوت دینے سے پہلے اسلام لائے۔ پھر اپنی بیوی سہلہ بنت سہیل بن عمرو کے ساتھ ہجرت کرکے حبشہ گئے اس کے بعد دوسرے مہاجرین کے ساتھ مدینہ منورہ آئے۔ ان تمام اوصاف پر مزید یہ کہ دین کے سلسلے میں کڑی مصیبتیں اٹھائیں، ایمان، یقین اور پورے جوش وخروش کے ساتھ بدر کے معرکے میں شریک رہے، ان کے ایمان کا کیا کہنا، خود اپنے باپ کو مقابلے کی دعوت دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام معرکوں میں شریک رہے، پھر آخر میں صدیق اکبر رض کے دور میں یمامہ کے معرکے میں شہید ہوئے، یہ محمد ان کے لڑکے حبشہ میں پیدا ہوئے تھے، باپ کی شہادت کے وقت بالکل نوجوان تھے، چودہ یا پندرہ سال کی عمر تھی۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد حضرت عثمان رض نے کفالت کی اور اپنی زیر نگرانی رکھا پھر جب حضرت عثمان رض خلیفہ ہوئے تو اس نوجوان نے خیال کیا کہ دوسرے قریشی نوجوان خصوصاً حضرت عثمان رض کے عزیزوں کی طرح اس کو بھی حکومت میں کوئی حصہ ملے گا لیکن راویوں کے بیان کے مطابق یہ نوجوان دین کا زیادہ پابند نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس نے شراب پی، اور حضرت عثمان رض نے اس پر حد جاری کی، معلوم نہیں یہ بات مستند ہے یا نہیں؟ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک دن اس نوجوان نے حضرت عثمان رض سے درخواست کی کہ کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے۔ حضرت عثمان رض نے انکار کرتے ہوئے اس سے کہا، اگر میں تم میں کوئی اہلیت پاتا تو ضرور کسی خدمت پر مامور کردیتا۔ لیکن تم اہل نہیں ہو نوجوان نے کہا پھر مجھے کہیں جانے کی اجازت دیجئے اور میری مدد کیجئے، حضرت عثمان رض نے اس کو کچھ دیا اور اجازت دیدی کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ پس وہ مصر چلا آیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ حضرت

عثمان رضؓ کے پاس سے ناراض ہو کر نکلا۔ اس کی ناراضی کا سبب خواہ شراب کی سزا ہی ہو، اگر پینے کی بات صحیح ہے یا گورنری کا نہ ملنا۔ جو ولید، سعید اور عبداللہ بن عامر جیسوں کو مل چکی تھی، اس نے مصر پہنچتے ہی حضرت عثمان رضؓ کی پالیسی کی مخالفت اور ان کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح کے خلاف شور و غوغا شروع کر دیا۔

دوسرا نوجوان محمد بن ابوبکر رضؓ، تو ان کی بزرگی اور شرافت کے لیے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ صدیق اکبر رضؓ کے بیٹے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے بھائی ہیں، پھر وہ بھی ایک قریشی نوجوان ہیں۔ ان کو بھی تمام قریشیوں کی طرح اپنی برتری کا احساس تھا، ان کو اپنے باپ اور بہن پر ناز تھا، جو مردوں اور عورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں عزیز ترین تھے، یقیناً وہ حضرت عثمان رضؓ سے متوقع تھے کہ ان کے درجے کا خیال رکھیں گے اور ان کے باپ اور بہن کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں کہیں کا والی بنا دیں گے جس طرح وہ اپنے متعلقین کو نواز رہے ہیں جن کی حیثیت نہ ان سے بلند ہے اور نہ اول، لیکن حضرت عثمان رضؓ نے کچھ خیال نہیں کیا اور ان کو کوئی وزن نہیں دیا۔ اور وہ تمام قریشی نوجوانوں کو یا ان کی اکثریت کو والی بنا بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کہ نوجوان تو بہت تھے اور عہدے بہر حال کم، لیکن حضرت عثمان رضؓ نے قریشی نوجوانوں کی ایک جماعت کو منظور اور دوسروں کو نظر انداز کر کے ناکام نوجوانوں میں ایک قسم کی دشمنی اور حسد پیدا کیا تھا، چنانچہ محمد بن ابوبکر رضؓ مدینہ سے مصر کے ارادے سے نکلے۔ محمد بن ابوحذیفہ بھی نکل چکے تھے۔ ان دونوں کی ملاقات راستے میں یا مصر پہنچ کر ہوئی، ان دونوں کے مصر پہنچتے ہی عبداللہ بن سعد رضؓ نے سمجھ لیا کہ یہ کسی نیک ارادے سے نہیں آئے۔ چنانچہ اس نے ان کو ڈرایا دھمکایا۔ لیکن انھوں نے اس کا کچھ بھی اثر نہیں لیا۔ محمد بن ابوحذیفہ اپنی تنقید میں زیادہ صاف گو اور خلیفہ اور اس کی مخالفت میں سخت تھے، اتنے سخت کہ حاکم کو اس کے منہ پر اور لوگوں کے سامنے برا بھلا بولنے میں ان کو ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ راویوں کا بیان ہے کہ وہ عام لوگوں کو متوجہ کرنے اور حاکم کو چیلنج دینے کے خیال سے مسجد میں جب حاکم نماز سے فراغت پاتا تو بلند آواز سے اللہ اکبر کہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن سعد نے ان کو بلا کر منع کیا کہ وہ ایسا نہ کریں، لیکن وہ باز نہ آئے۔ عبداللہ نے انھیں احمق کہا اور دھمکی دی کہ وہ اپنی تیزی کم کریں لیکن نوجوان نے ذرا بھی توجہ نہ کی اور کچھ بھی اثر نہیں لیا۔ پھر عبداللہ رومیوں سے جنگ کے لیے نکلا تو یہ دونوں محمد بھی نکلے، عبداللہ نے اس ڈر سے کہ کہیں ان لوگوں کی وجہ سے فوج متاثر نہ ہو، ان کو ایسے جہاز میں سوار ہونے پر مجبور کیا جس میں ان کے سوا کوئی مسلمان نہ تھا۔ سب کے سب قبطی تھے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ

محمد بن ابوبکرؓ بیمار ہوگئے اس لیے وہ مصر ہی میں مقیم رہے، اور محمد بن ابوحذیفہ رضؓ نکلے۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان میں سے ایک مصر میں رہ گیا تاکہ عبداللہ کی غیر حاضری میں فضا خراب کرے۔ اور دوسرا فوج میں اپنی تحریک کی اشاعت کرے۔

اس معرکے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ عبداللہ، رومی بیڑے کو شکست دے کر کامیاب واپس آیا۔ لیکن ابن ابوحذیفہ رضؓ لشکر میں اپنا کام کر چکے تھے، عبداللہ اور خلیفہ دونوں کے خلاف فوج میں بُرے خیالات کی اشاعت کردی تھی، وہ مجاہدین کو مخاطب کرکے کہا کرتے تھے کہ تم جہاد جہاد چلاتے ہو حالانکہ جہاد کا میدان مدینہ منورہ ہے۔ جہاں عثمان رضؓ مقیم ہیں اور امت پر کتاب وسنت اور شیخین رضؓ کے طرز عمل کے خلاف حکومت کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضؓ کو معزول کرتے ہیں اور مسلمانوں پر مسخروں اور فاسقوں کی ایک ٹولی مسلط کر رہے ہیں، تم اپنے حاکم اور جہاد کے افسران کو دیکھ لو۔ یہی تو وہ آدمی ہے جس کے کفر کا خود قرآن شاہد ہے۔ جس کے خون کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا تھا لیکن اسکے باوجود عثمان رضؓ نے اس کو تمہارا والی بنا دیا۔ اس لیے کہ وہ ان کا رضاعی بھائی ہے۔ ذرا اس پر تو نظر ڈالو کہ تمہارے ساتھ اس کا طرز عمل کیا ہے، کیا تم اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضؓ کی راہ پر پاتے ہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ تمہارے کاموں اور مالوں میں کم وبیش کرتا ہے اور تم کو ایسے کام اور مال کا مکلف کرتا ہے جس کی تم میں طاقت نہیں۔ یہ وہ خیالات اور افکار ہیں جو محمد بن ابی حذیفہ رضؓ فوجیوں میں اور محمد بن ابوبکر رضؓ مصریوں میں پھیلاتے تھے۔ جنگ سے واپسی پر مصری ان دونوں کے پاس جمع ہونے لگے اور انکی باتیں سننے لگے۔ اب عبداللہ بن سعد کو ان سے خطرہ پیدا ہوگیا اور انھوں نے حضرت عثمان رضؓ کو اس کی اطلاع کردی اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت چاہی، کہا جاتا ہے کہ عمار بن یاسر رضؓ کو حضرت عثمان رضؓ نے مصر بھیجا کہ وہ ان دونوں کی رپورٹ دیں اور نصیحت کرکے ان کو ٹھنڈا کریں اور خود عبداللہ کے بارے میں بھی اطلاع دیں، لیکن بقول راویوں کے عمار بن یاسر رضؓ مصر پہنچتے ہی ان دونوں نوجوانوں کے ساتھی بن گئے اور ان کے ہم نوا ہوکر عوام کو حضرت عثمان رضؓ کے خلاف بھڑکانے لگے، عبداللہ یہ دیکھ کر چلا اٹھا اور حضرت عثمان رضؓ کو خط لکھا جس میں پوری قوت کے ساتھ ان تینوں سے مواخذہ کی اجازت پر سخت اصرار کیا۔ لیکن حضرت عثمان رضؓ نے اس کو جواب میں سخت سُست کہا اور حکم دیا کہ عمار رضؓ کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے اور عزت واحترام کے ساتھ مدینہ واپس کردے۔ اور صدیق اکبر رضؓ اور عائشہ صدیقہ رضؓ کے احترام کے پیش نظر محمد بن ابوبکر رضؓ سے درگذر کرے اور محمد بن ابوحذیفہ رضؓ کو بھی چھوڑ دے وہ میرا لڑکا ہے میرا پروردہ اور قریش کی چڑیا۔

میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ عمار رض کو مصر نہیں بھیجا گیا اور نہ انھوں نے ان دونوں نوجوانوں کے ساتھ مل کر بغاوت پر آمادہ کرنے کے کام میں حصہ لیا۔ بلکہ یہ ایک افسانہ ہے جو حضرت عثمان رض کی طرف سے معذرت کرنے والوں نے اس قضیہ سے متاثر ہو کر گھڑا۔ جو عمار بن یاسر رض اور حضرت عثمان رض کے درمیان تھا اور جس کا ذکر آگے آئے گا لیکن جو بات ناقابل انکار ہے وہ یہ کہ یہ دونوں محمد مصر آئے اور عوام کو حضرت عثمان رض اور ان کے حاکم کے خلاف بھڑکایا۔ اور حضرت عثمان رض نے نرمی اور نیک سلوک کر کے ان کو راضی کرنا چاہا، کہا جاتا ہے کہ آپ نے محمد بن ابو حذیفہ رض کو کچھ مال اور کپڑا بھیجا۔ جسے مسجد میں مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے محمد نے کہا دیکھو۔ عثمان رض مجھے یہ رشوت دے کر میرے مسلک سے پھرانا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں محمد اسی طرح مصریوں میں مخالفت اور مقابلے کی تحریک پھیلاتے رہے تا آنکہ ایک بڑی تعداد ان کی ہم نوا بن گئی، ایسی ہم نوا کہ مصریوں سے زیادہ حضرت عثمان رض کا مخالف اور باغی کوئی نہ تھا ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں جوانوں کے غیظ و غضب کا باعث حضرت عثمان رض کا یہ طرز عمل ہے کہ آپ نے قریشی نوجوانوں کی ایک جماعت کو موقع دیا اور دوسروں سے بے توجہی برتی اور یہ کہ ان قابل اور اہلیت کے مالک افراد کو نظر انداز کیا، جنھوں نے اسلام کی راہ میں مصائب اور مشقتیں برداشت کی تھیں اور ان لوگوں کو خدمتوں پر مامور کیا جن کی قابلیت اور درجہ خواہ کتنا ہی اونچا رہا ہو، لیکن وہ سابقین میں نہ تھے اور نہ سیرت اور کیرکٹر کی عمدگی کے اعتبار سے ان میں کوئی امتیاز تھا۔ حضرت عثمان رض سے لوگوں اور خصوصاً نوجوانوں کی ناراضی اور غصے کا اندازہ کرنا ہو تو وہ خط پڑھنا کافی ہوگا جو اُشتر نے حضرت عثمان رض کو اس وقت لکھا تھا جب کوفہ والوں نے سعید بن العاص کو اپنی ناراضی کی بنا پر واپس کر دیا تھا اور حضرت عثمان رض نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے دانائی سے کام لینے کی تاکید کی تھی، اور پوچھا تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؛

اُشتر کا خط حضرت عثمانؓ کے نام

اُشتر نے حضرت عثمان رض کو لکھا۔

مالک ابن حارث کی طرف سے اس خلیفہ کے نام جو آلودہ اور خطاکار ہے جو اپنے نبیؐ کی راہ سے ہٹا ہوا ہے جس نے قرآن کے حکم کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

اما بعد؛ ہم نے آپ کا خط پڑھا، آپ کو آپ کے عمال کو ظلم و زیادتی سے باز آجانا چاہیئے بندگوں

اور نیکوں کو شہر بدر نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں آپ کی اطاعت منظور ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ہم نے خود زیادتی کی ہے۔ یہی آپ کی وہ بدگمانی ہے جس نے آپ کو گڑھے میں ڈال رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آپ کو ظلم انصاف، اور باطل حق نظر آتا ہے۔ اب رہی ہماری محبت تو آپ ہمارے بزرگوں پر زیادتی کرنے سے، ہم کو اور ہمارے صالحین کو جلاوطن کرنے سے اور ہم پر نوجوانوں کو حاکم بنانے سے باز آجائیے توبہ کیجیے اور خدا سے مغفرت کی طلب کیجیے اور ہمارے شہر کا حاکم عبداللہ ابن قیس رضہ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور حذیفہ رضہ کو بنائیے کہ ہم ان سے راضی اور خوش ہیں اور اپنے ولید، سعید، اور اپنے گھرانے کے اپنی پسند کے حاکموں سے ہم کو معاف رکھیئے۔ والسلام۔[1]

تم نے دیکھا، اشتر نہ حضرت عثمان رضہ کی اطاعت سے گریز کرتا ہے اور نہ ان کی امامت کا انکار ہاں ان پر ظلم کرنے کا، سنت ترک کرنے کا اور قرآن مجید پس پشت ڈال رکھنے کا الزام لگاتا ہے۔ نوجوانوں کو حاکم بنانے کا اور مسلمانوں کو جلاوطن کرنے کا الزام بھی لگاتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس سے رک جائیں اور یہ کہ کوفہ کے انتظامی اور جنگی معاملات کا والی ابوموسیٰ کو، خراج کی وصولی کا حاکم حذیفہ الیمان رضہ کو مقرر کریں، اگر ایسا کر دیں تو کوفہ والوں کی اطاعت ان کے سامنے ہے۔

اشتر کے اس جملے پر غور کیجیے:۔

"ہم کو اپنے سعید، اپنے ولید اور اپنے گھر کے اپنی پسند کے حاکموں سے باز رکھیئے"

اس لیے کہ اس میں اس غیظ وغضب کی تصویر کھینچی گئی ہے جو کوفہ والوں کو حضرت عثمان رضہ سے اس لیے تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو موقع دیتے تھے، اور ابوموسیٰؓ اور حذیفہ رضہ جیسی شخصیتوں کو نظر انداز کرتے تھے۔ راویوں کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمان رضہ نے یہ خط پڑھا تو فرمایا "اے خدا! میں توبہ کرتا ہوں" اور ابوموسیٰ رضہ اور حذیفہ رضہ کو لکھا کہ کوفہ والے تم سے راضی ہیں اور ہم کو بھی تمھارا اعتماد حاصل ہے۔ پس ان کے معاملات اپنے ہاتھ میں لو اور حق کے ساتھ حکمرانی کرو، خدا ہماری اور تمھاری مغفرت کرے۔

حضرت عثمان رضہ تک عتبہ بن دغل کا یہ شعر پہنچا:۔

تصدق علینا یا بن عفان واحتسب
وامر علینا الاشعری لیا لیا

"اے عفان کے بیٹے! چند راتوں ہی کے لیے ہم پر ابوموسیٰ اشعری رضہ کو امیر بنا دے"

[1] انساب الاشراف بلاذری ص۴۶ مطبوعہ القدس۔

حضرت عثمان رض نے فرمایا اگر میں باقی رہا تو چند راتیں نہیں مہینوں تک کے لیے[1]۔

عبداللہ بن سبا

ایک قصہ اور ہے جسے پچھلے راویوں نے بڑی اہمیت دی ہے اور بہت سے نئے اور پرانے لوگ اس کو حضرت عثمان رض کی مخالفت کا سبب خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی اب تک نہ مٹنے والی فرقہ بندی کا باعث یہی ہے۔ یہ قصہ عبداللہ بن سبا کا ہے جسے ابن السودا بھی کہتے ہیں۔ راویوں کا بیان ہے کہ عبداللہ بن سبا صنعار کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ اس کی ماں حبشن تھی۔ وہ حضرت عثمان رض کے زمانے میں مسلمان ہوا۔ اس کے بعد شہروں کا گشت کرنے لگا، جہاں جاتا خلیفہ کی مخالفت کرتا لوگوں کو بھڑکاتا اور ان میں ایسی نئی باتیں پھیلاتا، جن سے مذہب اور سیاست دونوں کے بارے میں عوام کے خیالات خراب ہوں، کہتے ہیں کہ وہ بصرہ آیا اور ابھی قیام بھی نہیں کر سکا تھا، کہ لوگوں نے عبداللہ بن عامر کو اس کی اطلاع دی جس نے اس کو بصرہ سے نکال دیا، پھر وہ شام چلا گیا اور وہاں ابوذر رض سے ملا، امیر معاویہ رض کو برا بھلا کہا کہ وہ مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال بتلاتے ہیں، ابوذر رض پر اس کی باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ اور انھوں نے امیر معاویہ سے اس کے متعلق گفتگو کی۔ اس کے بعد عبداللہ بن سبا نے عبادہ بن صامت رض سے ملاقات کی اور چاہا کہ ابوذر رض کی طرح ان سے بھی کچھ کہے لیکن عبادہ رض اس کو پکڑ کر امیر معاویہ رض کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ اس سے ملک کے لیے خطرہ ہے تب امیر معاویہ رض نے اس کو شام سے نکال دیا، اس کے بعد وہ مصر چلا گیا، جہاں اس کو اپنے مکر و فریب اور اپنی نئی باتوں کے لیے زرخیز زمین ملی، چنانچہ لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ حق دار تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ پھر لوٹ کر آئیں۔ قرآن مجید میں ہے:۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ۔ اسی طرح اس نے کہا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی علی رض ہیں اور حضرت علی رض خاتم الاوصیاء ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں۔

حضرت عثمان رض کے زمانے میں اسلامی شہروں میں جو فتنے اور فسادات رونما ہوئے، بہت سے

---

[1] انساب الاشراف بلاذری ص۳۴ مطبوعہ القدس۔

لوگ اس کو اسی عبداللہ بن سبا کی طرف منسوب کرتے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنا مکر بہت مضبوط کر چکا تھا۔ چنانچہ شہروں میں خفیہ انجمنیں بنائی تھیں جن میں پوشیدہ طور پر شر و فساد کی دعوت دی جاتی تھی۔ پھر جب تدبیریں مکمل ہو گئیں تو خلیفہ پر ٹوٹ پڑے۔ اور بغاوت، محاصرہ اور شہادت کے واقعات ہوئے۔

میرا خیال ہے کہ ابن سبا کی بات کو اتنا بڑھانے چڑھانے والے اپنی ذات پر اور تاریخ پر بڑی زیادتی کرنے والے ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اہم مصادر جن میں حضرت عثمان رضؓ کی مخالفت کی تفصیل ہے، ابن سبا کے ذکر سے خالی ہیں۔ چنانچہ ابن سعد، حضرت عثمان رضؓ کی خلافت اور لوگوں کی ان سے مخالفت کے حالات بیان کرنے میں ابن سبا کا کوئی تذکرہ تک نہیں کرتے۔ اسی طرح انساب الاشراف میں بلاذری اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے اور میرا خیال ہے کہ انساب الاشراف سب سے زیادہ اہم ماخذ ہے جس میں حضرت عثمان رضؓ کے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں، ہاں طبری نے سیف ابن عمر کی روایت سے ابن سبا کا ذکر کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے آنے والے مورخین نے طبری ہی سے لیا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت عثمان رضؓ کے زمانے میں ابن سبا کی کچھ بات تھی بھی یا نہیں لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی کوئی بات تھی تو وہ ناقابل ذکر، مسلمان حضرت عثمان رضؓ کے دور میں اتنے گئے گذرے نہ تھے کہ ان کے افکار اور اقتدار سے ایک اجنبی اہل کتاب شوخی کرتا، جو ابھی عثمانی عہد میں مسلمان ہوتا ہے اور مسلمان ہوتے ہی تمام اسلامی بلاد میں فتنہ و فساد پھیلانے کی ذمہ داری بھی اپنے ذمے لے لیتا ہے، اگر عبداللہ بن عامر یا امیر معاویہ رضؓ اس اجنبی کو جو یہودی تھا پکڑتے اور باز پرس کرتے تو اس کے سوا مفر نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو دھوکا دینے والا ایک مکار ثابت ہوتا، پھر تو وہ حضرت عثمان رضؓ کو مطلع کرتے اور یہ اپنی سزا کو پہنچ جاتا، اور اگر کہیں عبداللہ ابن ابی سرح اس کو پا لیتے تو کسی حالت میں بھی معاف نہیں کرتے اور وہ سزا دیتے جو حضرت عثمان رضؓ کے خوف سے دونوں محمدوں کو نہیں دے سکے تھے۔

اور جو شخص ابن ابوبکر رضؓ کو، ابن ابوحذیفہ رضؓ کو اور بعض روایات کے مطابق عمار بن یاسر رضؓ کو سزا دینے کی حضرت عثمان رضؓ سے اجازت چاہتا ہو، وہ ایک کتابی کو کس طرح معاف کر سکتا تھا۔ جس نے اسلام کو مسلمانوں میں نفاق اور تفرقے کا ذریعہ بنایا تھا اور مسلمانوں کو ان کے خلیفہ بلکہ پورے دین کی طرف سے مشکوک کرتا تھا اور پھر گورنروں کے لیے یہ بالکل آسان تھا کہ وہ اس اجنبی پر نظر رکھتے

اور گرفتار کرکے سزا دے دیتے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ اپنے مخالفین اور مقابلہ کرنے والوں کا پتہ چلانے، ان کو شہر بدر کرنے، امیر معاویہ رض یا عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رض تک پہنچانے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

اس عبداللہ بن سبا کے متعلق جو بات سب سے عجیب کہی جاتی ہے وہ یہ کہ اس نے ابوذر رض کو امیر معاویہ رض کے اس خیال پر کہ مال سب اللہ کا ہے تنقید بتائی اور بتایا کہ صحیح یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا مال ہے۔ اب تو یہ کوئی دور کی بات نہیں ہے کہ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ابن سبا ہی نے ابوذر رض کو امراء اور دولت مندوں پر تنقید کرنا سکھایا، میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی زیادتی نہیں ہوسکتی، ابوذر رض قطعاً بے نیاز تھے کہ ایک نومسلم اجنبی ان کو بتلائے کہ محتاجوں کا مال داروں پر کچھ حق ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ چاندی سونا جمع کرنے والوں اور اس کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کو عذاب الیم کی بشارت دیتا ہے اور یہ کہ جو مال دشمن پر غلبہ پانے کے وقت مسلمان پاتے ہیں، یا وہ مال جو زکوٰۃ یا خراج کے طور پر بیت المال میں ادا کرتے ہیں یا وہ مال جو ذمی سے جزیہ یا خراج میں وصول ہوتا ہے یہ سب مال مسلمانوں کا ہے جو ان کو فوراً مل جانا چاہیئے۔ یا ملنے کا حکم ہو جانا چاہیئے، ابوذر رض کو اسلامی حقائق کی ان ابتدائی باتوں کو سیکھنے کے لیے اس اجنبی کی ضرورت بالکل نہیں، وہ تو انصار میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہیں اور بہت سے مہاجرین سے بھی پہلے وہ مسلمان ہوئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور عرصہ تک رہے، قرآن مجید حفظ کیا اور خوب کیا، حدیث کی روایت کی اور اتقان کے ساتھ کی۔ حقوق اور مالیات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رض کی روش اور طریقے کا اچھی طرح مشاہدہ کیا، دوسرے صحابہ رض کی طرح حلال وحرام سمجھا۔

پس جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ ابن سبا نے اپنی ملاقات میں ابوذر رض کو بعض باتیں سکھائیں، وہ اپنے اوپر اور حضرت ابوذر رض پر ظلم کرتے ہیں اور ابن سبا کا درجہ اتنا اونچا کرتے ہیں جہاں تک پہنچنے کی خود ابن سبا کو بھی ہمت نہ تھی۔

راویوں کا بیان ہے کہ شام سے مدینہ واپس آنے کے بعد ایک دن حضرت ابوذر رض نے حضرت عثمان رض سے کہا کہ زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں، سائل کی ضرورت پوری کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس موقع پر کعب احبار رض بھی حاضر تھے، انھوں نے سن کر کہا جس نے زکوٰۃ ادا کردی بس اس کے لیے کافی ہوگیا۔ حضرت ابوذر رض غصہ ہوئے اور کعب سے کہا، یہودی کے بچے! یہ کہنے والا تو کون؟ کیا تو ہم کو ہمارا دین سکھاتا ہے؟ اور پھر اپنی لکڑی سے ان کو مارا بھی

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوذر رضہ کعب احبار رضہ سے بھی دین سیکھنے کے روادار نہیں اور مسلمانوں کے معاملے میں کعب رضہ کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق دار بھی خیال نہیں کرتے۔ حالانکہ کعب رضہ ابن سبا سے بہت پہلے کے مسلمان ہیں وہ دن رات مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضہ کے ساتھ رہتے تھے۔ حضرت عمر رضہ اور حضرت عثمان رضہ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، پھر بھی ابوذر رضہ عبداللہ بن سبا جیسے آدمی سے اسلام کا ایک اصول، قرآن کا ایک حکم سیکھنے میں ذرا بھی جھجک کا اظہار نہیں کرتے، نبیؐ کے یہ صحابی رضہ حیرت انگیز ہیں کہ کعبؓ سے دین کے متعلق گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور عبداللہ ابن سبا جیسے آدمی سے دین سیکھتے ہیں۔

ابن سبا کے متعلق روایات میں جو کچھ ہے اس کے صحیح مان لینے پر غالب گمان یہ ہے کہ اس نے جو کچھ کیا اور کہا، وہ فتنہ اور اختلافات بڑھ جانے کے بعد اس نے فتنہ جگایا نہیں، فتنوں سے فائدہ اٹھایا اسی طرح غالب گمان یہ ہے کہ اموی اور عباسی دور میں شیعوں کے مخالفین نے عبداللہ بن سبا کے معاملے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا تاکہ ایک طرف بعض ان واقعات کو مشکوک کر دیا جائے جو حضرت عثمانؓ اور ان کے حاکموں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور دوسرے طرف حضرت علی رضہ اور شیعوں کی برائی کی جائے اور ان کے بعض خیالات کی بنیاد ایک ایسے نومسلم یہودی کو قرار دیا جائے جو مسلمانوں کو فریب دینے کے لیے مسلمان بنا تھا اور اس سے تو آپ واقف ہی ہیں کہ شیعوں اور ان کے مخالفین نے باہم ایک دوسرے کے ساتھ بدکلامیوں کی اور برائیوں کی حد کر دی ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم کو سخت احتیاط اور پرہیز کی ضرورت ہے۔ صدر اسلام کے مسلمانوں کا درجہ ہماری نگاہوں میں اس سے اونچا ہونا چاہیئے کہ صنعا رسے آنے والے ایک آدمی جس کا باپ یہودی اور ماں حبشن تھی، جو خود بھی یہودی تھا، پھر خوف یا اخلاص کی بنا پر نہیں بلکہ دھوکا دینے اور مکر پھیلانے کی غرض سے اسلام لایا، اس کی یہ مجال ہو کہ وہ ان کے دین، ان کی سیاست، ان کی عقل اور ان کی حکومت کے ساتھ مذاق کرے۔ اور اس کو کامیابی کا موقع بھی ملے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو اتنا بھڑکایا کہ انھوں نے اپنے خلیفہ کا خون کر دیا اور پھر ان کو فرقوں اور جماعتوں میں منتشر کر دیا۔

اس قسم کی باتیں نہ معقول ہیں نہ تنقید کے معیار پر پوری اتر سکتی ہیں اور نہ ایسی باتوں پر تاریخ کی بنیاد ہونی چاہیئے۔ بالکل کھلی ہوئی بات جس میں شک کی گنجائش نہیں، یہ ہے کہ اس وقت کی اسلامی زندگی کا ماحول قدرتی طور پر چاہتا تھا کہ رایوں میں اختلاف اور خواہشوں میں فرق ہو۔ باہم مختلف اور متضاد سیاسی مسلک قائم ہوں، ایک طرف وہ لوگ جو قرآن کی آیات، نبیؐ کی سنت،

اور شیخین رضہ کی سیرت کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے، دیکھ رہے تھے کہ ایسے نئے نئے معاملات پیش آ رہے ہیں جن سے ان کی واقفیت نہیں، وہ چاہتے تھے کہ ان معاملات کا مقابلہ حضرت عمر رضہ کی طرح دوراندیشی، شدت اور استقلال اور رعایا کو سنبھال کر کریں، دوسری طرف قریشی اور غیر قریشی عربی نوجوان ان پیش آنے والے معاملات کا اپنی نئی زندگیوں سے استقبال کر رہے تھے۔ جس میں حرص تھی اور حوصلہ بھی، غرض بھی اور بڑی بڑی امیدیں بھی، اور ایسا ارادہ بھی جو کہیں رکنا جانتا نہ تھا اور ان تمام باتوں کے ساتھ عہدوں اور منصب سے متعلق سب چیزوں میں مقابلہ کی نہایت تیز اسپرٹ تھی، پھر یہ نئے معاملات بجائے خود ایسے تھے جو بوڑھوں اور نوجوانوں کو اسی منزل پہلے جائیں جہاں وہ پہنچے۔ زمین کے بڑے بڑے خطے فتح ہو رہے تھے۔ ان خطوں سے بے شمار دولت پہنچ رہی تھی، ایسی حالت میں حیرت اور تعجب کی بات نہیں اگر وہ ان منتوحہ علاقوں کی حکمرانی اور انتظام چلاتے میں اور دولت سے نفع اٹھانے میں باہم مقابلہ کریں۔ اور ابھی بہت سے ممالک فتح بھی نہیں ہوئے تھے اور حالت یہ تھی، کہ ہر چیز ان کو فتح کی دعوت دے رہی تھی، تو کیوں نہ ان میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ ان ممالک کو فتح کرنے میں سبقت کریں، اور کیوں نہ فاتحوں کی طرح، اگر دنیا کے طالب ہیں تو مال غنیمت اور درجات کی بلندی میں، اور اگر عقبیٰ کے خواہاں ہیں تو اجر و ثواب کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کی کوشش کریں۔ اور پھر اتنی طویل وعریض حکومت کے چلانے میں اور اتنی زبردست دولت و ثروت کے استعمال میں کیوں نہ آپس میں رایوں کا اختلاف ہو، ہرگز ہرگز حیرت کا مقام نہیں اگر قریش کے حریص اور حوصلہ مند جوان ان دروازوں کی طرف چل پڑیں جو ان کے سامنے کھولا گیا، تاکہ وہ عزت، حکومت اور دولت تک پہنچ سکیں اور نہ اس پر تعجب کرنا چاہیئے کہ ان قریشی نوجوانوں کے مقابلے کے لیے انصار، اور دوسرے عرب قبیلے کے نوجوان ہمت کریں اور یہ دیکھ کر کہ خلیفہ ان کی راہ میں حائل ہے اور تمام بڑے اور اہم عہدوں پر صرف قریش اور بنی امیہ کے متعلقین کا تقرر کرتا ہے، ان کے دل غیظ و غضب اور کینے سے بھر جائیں۔

اس میں شک کی مطلق گنجائش نہیں کہ حضرت عثمان رضہ نے سعد رضہ کو معزول کر کے ولید اور پھر سعید کو کوفہ کا گورنر بنایا، ابوموسیٰ کو معزول کر کے بصرے کا حاکم عبداللہ بن عامر کو بنایا، امیر معاویہ رضہ کو سارے ملک شام کی حکمرانی دے کر ممکنہ حد تک ان کی حکومت وسیع کر دی حالانکہ شام متعدد صوبوں کا مجموعہ تھا اور وہاں کے حکمرانوں میں قریش اور دوسرے عرب شریک رہا کرتے تھے۔ مصر سے عمرو بن العاص رضہ کو معزول کر کے عبداللہ بن ابی سرح کو مقرر کیا اور یہ سب حکمران حضرت عثمان رضہ کے رشتہ دار ہیں، کوئی

رضاعی بھائی ہے کوئی ماں کی طرف سے ان کا بھائی ہے، کوئی ماموں ہے کوئی امیہ بن عبد شمس سے قریبی نسبت رکھنے کی وجہ سے آپ کا عزیز ہے۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور ہم نہیں جانتے کہ ان تقررات اور معزولیوں کے لیے حضرت عثمان رض کو ابن سبا نے آمادہ کیا تھا اور پھر تمام زمانے میں لوگوں نے یہ بات معیوب سمجھی ہے کہ بادشاہ اور امراء حکومت کے معاملات میں اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دیں، تو یہ لوگ جو حضرت عثمان رض کی رعایا تھے، وہ کوئی نئے قسم کے انسان نہ تھے، وہ بھی لوگوں کی طرح جو چیز بری تھی اس کو معیوب سمجھنے لگے۔

مخالفت کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی؟

بلاشبہ حضرت عثمان رض کے زمانے میں مخالفت کی جو فضا تھی، حضرت عمر رض کا زمانہ اس سے بڑی حد تک پاک تھا، دور دراز شہروں کی کیفیت ہم اس سے قبل بتا چکے ہیں لیکن خود مدینہ میں حضرت عثمان رض کے قریب مخالفت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اب تک ہم نے اس کا نقشہ پیش نہیں کیا، آنے والی فصل میں ہم اس سے بحث کریں گے، اب تک ہم ناظرین کے ساتھ اہم اہم شہروں میں چکر لگا رہے تھے۔ جس سے وہاں کے باشندوں کا وہاں کے ہونے والے واقعات کا ہم کو پتہ چلا، لیکن اب جو سوال قابل بحث ہے اور جس کا جواب دینے کی ہم کوشش کریں گے وہ یہ کہ حضرت عثمان رض کے طرز عمل کی مخالفت کہاں سے شروع ہوئی۔ مدینہ منورہ سے جو دارالخلافہ تھا یا دوسرے شہروں سے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ مخالفت کی ابتدا نبی ؐ کے صحابہ مہاجرا ور انصار سے ہو کر شہروں تک اور شہروں میں مقیم فوجوں تک پہنچی یا پہلے فوج میں ہوئی اور پھر صحابہ تک مدینہ میں پہنچی۔

کھلی بات ہے کہ اس سوال کا جواب بڑا نازک اور اہم ہے، مدینے میں مخالفت کی ابتدا کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رض کی بعض باتوں کو سب سے پہلے نبی ؐ کے صحابہ رض نے ناپسند کیا، پھر لوگوں نے اس کی اتباع کی، اتباع میں بعض لوگ اعتدال کی راہ پر رہے، کچھ لوگ حد سے آگے بڑھ گئے۔ اور شہروں میں مخالفت کی ابتدا کا مطلب یہ ہے کہ فوجیوں نے قدم اٹھایا اور مخالفت میں اس طرح سرپٹ دوڑے کہ نتائج سے بے پرواہ ہو گئے اور صحابہ رض کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بعض

صحابی رض اس پر ناراض رہے اور بعض رضامند آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس سوال کا جواب دینے میں ہم درمیانی راہ اختیار کریں گے، ہمارا خیال ہے کہ مخالفت صرف مدینہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں اور دوسرے صوبوں میں پیدا ہوئی اور غالباً مدینے میں اور پھر صوبوں کے اطراف میں، جہاں سرحدوں پر مسلمان دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے، اگر ہماری یہ رائے صحیح ہے اور ہم اس کو صحیح سمجھتے ہیں، تو مخالفت خواہ مدینہ سے شروع ہوئی ہو خواہ شہروں سے، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک فطری اور یقینی پیش آنے والی بات تھی، وہ اجتماعی اور سیاسی زندگی کا تقاضا تھی، وہ تمدن کی فطرت جس سے مسلمان دوچار ہونے پر بہرحال مجبور تھے اور جو دین کے حقائق میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے حالات کا نتیجہ تھی اور حضرت عثمان رض کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زندگی کے طبعی تقاضوں اور حالات کا مقابلہ کریں اور ان پر غالب آجائیں، اس قدر عظیم الشان اقتدار جیسا کہ مسلمانوں کو ملا اگر کہیں بھی ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں حکومت اور اس کی حزب مخالف نہ ہو، پھر حکومت اور حزب مخالف میں آویزش اور مقابلہ نہ ہو، اور بالآخر وہ تصادم اور معرکہ نہ ہو جس نے مسلمانوں کو اس راستے پر پہنچایا جس پر ان کے پہلے کی اور بعد کی قومیں پہنچ چکی ہیں، اس لیے کہ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی ترقی، نیز عقل کی ترقی اپنی آخری منزل تک نہیں پہنچی تھی، جو لوگ آج بھی سیاسی اور اجتماعی نظاموں میں معرکے دیکھ رہے ہیں انھیں حضرت عثمان رض کے عہد کے نظاموں کی آویزش سے انکار نہیں کرنا چاہیئے، جو ساتویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔

اب ہمیں صوبوں کی اس طویل سیاحت کے بعد مدینہ منورہ چلنا چاہیئے اور کچھ وقت حضرت عثمان رض اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ گذارنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ ان کے ساتھ حضرت عثمان رض کا طرز عمل کیسا تھا اور حضرت عثمان رض کے بارے میں ان کی رائے کیا تھی؟

عبدالرحمٰن ؓ بن عوف

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کا تعلق ان پانچ افراد سے کیسا ہے جنھوں نے آپ کو خلافت کے لیے چنا، اور سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عمرؓ کے عہد میں مجلس شوریٰ میں آپ کے شریک تھے۔ یہ سب کے سب اسلام کے سابقین میں ہیں، خدا کی راہ میں سب نے سخت مصیبتیں اٹھائیں اور شدید آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر ان سے راضی رہے اور وفات پائی تو ان سے خوش رہ کر، سب کے سب ان دس آدمیوں میں تھے جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔ پھر قریش میں اپنی حیثیت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت، عوام کی نگاہوں میں قدر و منزلت، دنیاوی کامیابی اور دنیا کے متعلق نقطۂ نظر کے اعتبار سے ان کے درجات مختلف تھے۔ حضرت عمرؓ کی رائے میں، نیز عوام کی اور خود ان لوگوں کی رائے میں پہلا نمبر عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب کی طرف سے بہت قریب تھے۔ آمنہ کی طرح ان کا بھی تعلق قبیلہ بنی زہرہ سے تھا۔ جاہلیت میں ان کا نام عمرو تھا یا عبدالکعب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن نام رکھا۔ عہد جاہلیت میں یہ ایک کامیاب تاجر تھے، اسلام لانے کے بعد بھی بڑی کامیابی کے ساتھ تجارت کرتے رہے، آپ کاروبار میں بڑے منتظم، دولت پیدا کرنے میں بڑے ماہر تھے، دولت سے نفع اٹھانا اور اچھے کاموں میں خرچ کرنا خوب جانتے تھے۔ جب ہجرت کرکے مدینہ گئے تو سعد بن ربیع انصاری رضؓ کے مہمان ہوئے۔ سعدؓ نے ان سے کہا میں مدینہ کا سب سے بڑا مال دار ہوں۔ میری دولت کا ایک حصہ لے لو، میری دو بیویاں ہیں انھیں دیکھ لو، جو پسند ہو اس کو تمھارے لیے طلاق دیدوں، عبدالرحمٰنؓ نے کہا خدا تم کو برکت دے مجھے تو کل جب صبح ہو تو اپنے یہاں کا بازار بتا دینا۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو سویرے ہی بازار چلے گئے لین دین کیا، نفع کمایا اور شام کو گھی اور پنیر لے کر گھر واپس ہوئے۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک مدینے میں قیام کیا، ایک دن زعفرانی لباس پہنے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی۔ آپؐ نے پوچھا یہ کیا؟ جواب دیا میں نے شادی کر لی ہے۔ حضرتؐ نے سوال کیا مہر کیا دیا؟ کہنے لگے کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا، آپ نے فرمایا ولیمہ کرو چاہے ایک ہی بکری کا، عبدالرحمٰن رضؓ اس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ میں مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا تھا تو جیسے چاندی یا سونا بن جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

وہ دولت پیدا کرنے اور اس کی تلاش میں بڑے کامیاب تھے۔ تھوڑے ہی دنوں کے قیام میں وہ مدینہ کے دولتمندوں میں شمار ہونے لگے۔ اس سے پہلے تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھ چکے ہو آپؐ فرماتے ہیں عبدالرحمٰن رض! تم دولت مند ہو لیکن جنت میں رینگتے ہوئے جاؤ گے، اللہ کو قرض دو کہ تمہارے پاؤں کھول دے۔ اسی طرح اس سے پہلے تم نے حضرت عائشہ صدیقہ رض کی وہ حدیث بھی پڑھ لی ہے جس میں مدینہ میں عبدالرحمٰن رض کے اونٹوں کے آنے اور تمام مال تجارت کے صدقہ کر دینے کا ذکر ہے اور یہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ عبدالرحمٰن رض نے میراث میں بہت بڑی دولت چھوڑی تھی، ایک ہزار اونٹ، تین ہزار بکریاں، ایک سو گھوڑے، بیس اونٹوں سے آبپاشی کرنے والا کھیت اور یہ کہ ان کی چار بیویاں تھیں، میراث میں ہر ایک کے حصہ کا اندازہ اسّی ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک کیا ہے، ان تمام باتوں سے اگر کچھ ذہن میں آتا ہے تو وہ یہ کہ ان کی دولت اتنی زبردست اور ایسی روز افزوں تھی کہ مسلسل خیرات، ازواج مطہرات رض کی متواتر خبر گیری، بنی زہرہ کے رشتہ داروں کی اعانت اور عام مسلمانوں کی امداد بھی اس کو کم نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اس پر بھی عبدالرحمٰن رض بے حد دولت مند نہ تھے۔ وہ سرمایہ لگانا اس کو نفع بخش بنانا اور اسکی نگرانی کرنا خوب جانتے تھے۔ ابن سعد رض نے اپنی اسناد سے حضرت عمر رض کے حالات میں لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رض کو کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو انھوں نے عبدالرحمٰن رض سے قرض مانگنے کے لیے اپنا آدمی بھیجا۔ عبدالرحمٰن رض نے آدمی سے کہلا بھیجا کہ ان سے کہو بیت المال سے قرض لے لیں، پھر جب حضرت عمر رض بعد میں ان سے ملے تو اس تلخ مذاق پر ملامت کی اور کہا تم چاہتے ہو کہ میں بیت المال سے قرض لوں، پھر اگر موت آجائے اور ادا نہ کر سکوں تو تم لوگ یہ کہو کہ عمر رض اور اس کی اولاد سے درگذر کرو۔

عبدالرحمٰن رض کو اپنے آرام کا بھی بہت خیال تھا۔ زندگی کی لذتوں میں اللہ نے مسلمانوں کے لیے جو کچھ مباح کیا تھا وہ اس میں اپنا پورا حصہ لیتے تھے اور دین کا حق بھی پوری طرح ادا کرتے تھے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ قبیلہ قریش کے ایک فرد تھے اور قریش ہی کی طرح زندگی گذارنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے نفس پر زہد کی سختی اور موٹی زندگی لادنا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خارش کی شکایت کی بنا پر ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت حاصل کی تھی، پھر انھوں نے چاہا کہ ریشمی کپڑا ان کے لیے اور ان کے لڑکوں کے لیے مباح ہو جائے لیکن حضرت عمر رض نے ان کو روکا اور وہ ریشمی کپڑا چاک کر دیا جو عبدالرحمٰن رض نے اپنے لڑکے کو پہنایا تھا، جیسا کہ اس سے پہلے تم پڑھ چکے ہو۔ علاوہ ازیں عبدالرحمٰن رض نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح بہت سی شادیاں کیں اور بڑے کثیر العیال تھے، ابن سعد نے تفصیل کی ہے

اور بتایا ہے کہ لونڈیاں چھوڑکر دس سے زیادہ ان کی بیویاں تھیں اور سب سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوئیں انتقال کے وقت باختلاف رواۃ تین یا چار عورتیں تھیں، انھوں نے کسی ایک یا دو تین قبیلے میں شادی نہیں کی بلکہ بہت سے قبیلوں میں اپنا رشتہ کیا۔ چنانچہ قریش کے، یمن کے اور ربیعہ کے متعدد خاندانوں میں انھوں نے شادیاں کیں اور ایک بڑی تعداد ان کے نسبتی بھائیوں کی پیدا ہوگئی، کچھ قریش میں، کچھ انصار میں، کچھ یمن میں، کچھ شام و عراق کے درمیان آباد یمنیوں میں، کچھ مصر کے خاندان بنی تمیم میں اور کچھ ربیعہ کے خاندان بنی بکر اور بنی تغلب میں۔

جن عورتوں سے عبدالرحمٰن رض نے شادی کی، ابن سعد کی روایت کے مطابق ان کے نسب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی شان و شوکت اور اثر و اقتدار والے گھرانوں کی تھیں پس اگر عبدالرحمٰن رض حضرت عمر رض کے بعد خلافت کی ذمہ داری لے لیتے تو بلا شبہ بہت سی نسبتیں اور بہت سے تعلقات اپنے ساتھ وابستہ کر سکتے، اور ان نسبتوں اور تعلقات کو بہت اچھی طرح ہم آہنگ بھی بنا لیتے، جس کی وجہ سے بہت سے ٹوٹے ہوئے رشتے جڑ جاتے، پھر وہ عوام کی دولت کا انتظام بھی اپنی دولت کی طرح کرتے، اس کو برمحل صرف کرتے، ٹھکانے سے لگاتے، نفع بخش بناتے اور انصاف کے ساتھ خرچ کرتے، حضرت عمر رض نے ان کو مجلس شوریٰ میں رکھا اور یہ کہہ کر ان کو تمام صحابہ رض میں ممتاز کر دیا کہ اگر تین ایک طرف ہوں اور تین دوسری طرف تو مدھر عبدالرحمٰن ہوں اس کو پسند کرو، اور کہنا چاہیئے کہ دونوں کی برابری کی صورت میں حق ترجیح دے کر حضرت عمر رض نے ان کو مجلس شوریٰ کا قریب قریب صدر بنا دیا تھا، صحابہ رض میں بعض کا خیال تھا کہ ان کو خلافت کا امیدوار بنایا جائے۔ ان کی نظر میں ان کو خلیفہ بنا دینا بہت سی خرابیوں سے بچ جانا تھا، حضرت علی رض اور حضرت عثمان رض کے خلیفہ بن جانے سے جس تفریق اور خلفشار کا خدشہ تھا اس کا بھی سدباب ہو جاتا، اندازہ لگتا ہے کہ مجلس شوریٰ میں بھی کسی کو ان کے خلیفہ ہونے میں کلام نہ تھا۔ اگر حضرت علی رض کو مختار بنایا جاتا تو بنی امیہ سے حضرت عثمان رض کے تعلق کے پیش نظر عبدالرحمٰن رض ہی کو منظور فرماتے اور اگر حضرت عثمان رض مختار بنائے جاتے تو حضرت علی رض کے بنو ہاشم سے تعلق کی بنا پر وہ بھی انھیں کو حضرت علی رض پر ترجیح دیتے۔ عبدالرحمٰن رض اور حضرت عثمان رض میں دامادی کا رشتہ تھا۔ عبدالرحمٰن رض نے عقبہ بن ابی معیط کی لڑکی ام کلثوم سے نکاح کیا تھا جو ولید بن عقبہ کی بہن ہیں، پھر عبدالرحمٰن رض اور عبشمیوں میں بھی دامادی کا رشتہ تھا، اس لیے کہ انھوں نے عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس کے ہاں بھی نسبت کی تھی اور امیر معاویہ رض کے ماموں کی بیوی سے نکاح کیا تھا، اسی طرح شیبہ ابن ربیعہ بن عبد شمس کے ہاں بھی نسبت کی تھی اور انصار سے بھی رشتہ جوڑا تھا، آپ کی ماں کا تعلق

بنی امیہ سے تھا اور خود بنی زہرہ سے تعلق رکھتے تھے، اس طرح وہ قریش اور انصار کے خاندانی اثرات اور خیالات کو ان تمام عربی قبائل کے خاندانی اثرات اور خیالات سے جوڑ سکتے تھے۔ جن سے ان کی رشتہ داری تھی، لیکن ان تمام امکانات کے باوجود انھوں نے خلافت کی امیدواری نہیں کی اور امیدوار بنانے والوں کی ایک نہ سنی بلکہ فوراً امیدان سے ہٹ گئے اور دو امیدواروں میں حکم بننا منظور کر لیا۔ دونوں امیدواروں نے آپ کے فیصلے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ حضرت علی رض نے آپ سے اقرار لیا کہ وہ فیصلہ کرنے میں صرف حق ملحوظ رکھیں گے اور کسی قرابت اور رشتہ داری کا خیال نہیں کریں گے آپ نے بڑی خوشی سے اس کا اقرار کیا اور بات انجام تک پہنچی۔ جس کا بیان ہم کر چکے ہیں، عبدالرحمٰن رض کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داری لینے سے زیادہ محبوب مجھے یہ بات ہے کہ کوئی میری گردن پر اس طرح خنجر رکھ دے کہ گلے سے پار ہو جائے۔

پس انھوں نے اپنی ذات کو حکومت اور اس سے لپٹے ہوئے شکوک و شبہات سے اونچا رکھا اپنے نفس کو ذمہ داریوں سے بچایا اور یہ گوارا کیا کہ ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی دنیا اور اپنے دین تک اپنے کو محدود کریں۔ پھر جب آپ نے حضرت عثمان رض کو امیدوار بنایا اور شوریٰ کے ممبروں سے ان کی بیعت لی اور لوگوں کو ان کی بیعت کے لیے آمادہ کیا تو طبعی امر تھا کہ آپ حضرت عثمان رض کی بہت قریب سے نگرانی فرماتے۔

شروع شروع میں عبدالرحمٰن رض حضرت عثمان رض کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کے مؤید اور نگراں تھے پھر جب لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ تو متوجہ ہوئے اور نگرانی میں شدت کر دی، پھر وہ بھی ون آئے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن رض دینی اور سیاسی معاملات میں حضرت عثمان رض کے مخالف ہو گئے۔ پھر نوبت مخالفت کی حد سے آگے بڑھی اور انھوں نے حضرت عثمان رض کا بائیکاٹ کر دیا، نہ ان سے ملتے تھے نہ گفتگو کرتے تھے۔ بعض راویوں نے غلو سے کام لیتے ہوئے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن رض حضرت عثمان رض کو خلیفہ بنا دینے پر نادم تھے اور ایک دن حضرت علی رض سے انھوں نے کہا اگر رائے ہو تو تم اپنی تلوار لو اور میں اپنی، پھر چل کر نپٹ لیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے عبدالرحمٰن رض نے حاضرین سے کہا اس سے پہلے کہ عثمان رض تم پر اور اپنی جان پر ظلم کریں۔ تم ان کو مہلت نہ دو۔ لیکن اس قسم کی تمام باتوں میں تصنع ہے۔ اور تکلف، ہاں اس قدر یقینی ہے کہ عبدالرحمٰن رض نے دین کی دو باتوں میں حضرت عثمان رض کی مخالفت کی، ایک تو اس وقت جب حضرت عثمان رض نے نماز پوری ادا کی حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رض قصر کرتے تھے، دوسری اس وقت جب انھوں نے اپنے

رشتہ داروں کو مال میں سے عطیات دیئے۔

سعد بن ابی وقاص رض

عبدالرحمٰن رض بن عوف کی طرح سعد بن ابی وقاص رض کا خاندانی تعلق بھی بنی زہرہ سے تھا، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آتے دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرے ماموں ہیں، ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سعد رض اسلام کے سابقین میں ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ "میں اسلام کا تہائی ہوں، میں مسلمان ہوا جب نماز بھی فرض نہیں ہوئی تھی" دوسرے صحابہ رض کی طرح سعد رض بھی سخت مصائب میں مبتلا کیے گئے اور نہایت استقلال کے ساتھ آزمائشوں میں ثابت قدم رہے، اللہ کی راہ میں سب سے پہلے تیر انداز سعد رض تھے اُحد کے معرکے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی پر اپنے ماں باپ دونوں کو فدا کیا۔ سعد رض اپنے بھائی عمیر بن ابی وقاص کا واقعہ بیان کیا کرتے تھے۔ جو چھوٹی ہی عمر میں ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے لشکر کا معائنہ کر رہے تھے تو سعد رض نے اپنے بھائی عمیر کو دیکھا کہ وہ نگاہوں سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب سعد رض نے سبب پوچھا تو کہنے لگے ڈرتا ہوں کہ مجھے چھوٹا دیکھ کر کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جانے سے روک نہ دیں اور میرا شوق شہادت مجھے نکلنے کی دعوت دے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت نے جب ان کو دیکھ لیا تو چھوٹا سمجھ کر ان کو روک لیا لیکن عمیر رض اس پر رونے لگے، تب حضرت ؐ نے ساتھ چلنے کی اجازت دے دی، وہ اتنے چھوٹے تھے کہ حضرت سعد رض ان کی تلوار کا پٹکا خود باندھتے تھے۔ بالآخر عمیر رض کی آرزو پوری ہوئی اور بدر کے شہیدوں میں ان کا نام لکھا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں سعد رض کا بڑا درجہ تھا۔ جب وہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عیادت فرمائی اور دعا کی کہ اللہ سعد رض کو صحت دے تاکہ وہ اس سرزمین میں نہ مریں جہاں سے ہجرت کی تھی، بیمار پرسی کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رض سے وہ حدیث بیان فرمائی جس میں حکم دیا گیا ہے کہ آدمی اپنے مال میں سے صرف تہائی حصے کی وصیت کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رض کو مکہ میں چھوڑ دیا اور اپنے ایک صحابی کو ان پر مقرر کر کے فرمایا کہ اگر سعد رض کا انتقال ہو جائے تو انھیں (مدینے کے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فلاں مقام پر

دفن کر دینا۔ اور سعد رض سے مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تمھارا درجہ بلند کرے گا۔ تم سے ایک قوم کو نفع اور دوسری کو نقصان پہنچے گا، کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے اپنی اس آرزو کا اظہار کیا کہ سعد رض جب کبھی دعا کرے اسے قبول کرنا، خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی اور سعد رض بیماری سے اچھے ہو گئے اور اس وقت تک زندہ رہے کہ اللہ نے ان کے ذریعہ ایک قوم کو پست اور دوسری کو بازاو کر دیا۔ کسریٰ کی فوج کو شکست دینے والے اور معرکہ قادسیہ کے فاتح یہی سعد بن ابی وقاص ہیں، رضی اللہ عنہ۔

حضرت عمر رض نے ان کو اس شوریٰ کے چھ افراد میں رکھا تھا جس کے سپرد خلافت کا مسئلہ تھا، پس وہ خلافت کے امیدوار بھی تھے لیکن عبدالرحمٰن بن عوف رض نے اپنی طرح ان کو بھی دور رکھا۔

سعد رض کی بہت سی بیویاں تھیں لیکن وہ مختلف عربی قبائل کی تھیں، قریش میں انھوں نے صرف ایک عورت اپنے زہری خاندان میں کی تھی۔ شاید بعض لوگوں کو ان کے نسب پر شبہ تھا اور کچھ لوگ اس کا طعن کر کے ان کو اذیت پہنچاتے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے۔ اے اللہ کے رسول! میں کون ہوں، آپ نے فرمایا انت سعدؓ بن مالک بن وہیب بن عبد مناف بن زہرہ، جو کوئی اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے۔ اس پر خدا کی پھٹکار، میرے خیال میں یہی بات ہے جس سے سعد رض کی رشتہ داریاں قریش میں زیادہ نہ ہو سکیں، بعض راویوں کا خیال ہے کہ شوریٰ کے موقع پر سعد رض حضرت علی رض کے ہوا خواہوں میں تھے اور انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر دیا تھا ہو سکتا ہے کہ یہ بات سچ ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط، حضرت عمر رض نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت فرمائی کہ اگر سعدؓ کو خلافت نہ مل سکے تو انھیں والی ضرور بنانا۔ میں نے ان کو کسی خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا تھا۔ حضرت عثمان رض نے اس وصیت پر پوری طرح عمل کیا اور سعد رض کو ایک سال سے زیادہ عرصے تک کوفے کا گورنر باقی رکھا، پھر ان کو معزول کر کے ولید کو ان کی جگہ مقرر کیا سعد رض کی معزولی کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے ہم نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ سعد رض اور ابن مسعودؓ میں بیت المال سے قرض لینے پر جو اختلاف بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ولید ابن عقبہ اور عبداللہ بن مسعود کے درمیان تھا، غالب گمان یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس واقعے کی نسبت سعد رض کی طرف کر دی ہے انھوں نے قصداً یا سہواً دو آدمیوں میں خلط ملط کر دیا ہے۔ بات جو کچھ بھی رہی ہو، سعد رض بہر حال حضرت عثمان رض کی بیعت کے وفادار تھے اور معزول کر دینے کی وجہ سے ان کو حضرت عثمان رض پر غصہ تھا یا نہیں تھا لیکن وہ ان کی مخالفت میں شدید اور کٹر نہیں تھے

ان کی شرکت اسی مخالفت میں ہوتی جو نرم ہوتی اور جس کی صدا امر بالمعروف سے ملی ہوتی۔ لیکن جب حضرت عثمان رض کی مخالفت آگے بڑھی اور بغاوت کی حد میں قدم رکھنے لگی تو سعد رض رک گئے اور غیر جانبداری اختیار کر لی۔ پھر نہ فساد میں حصہ لیا اور نہ اس کے نتائج میں، اور جب کبھی اس سلسلے میں ان سے کوئی گفتگو کرتا اور پوچھتا کہ تم مقابلہ کیوں نہیں کرتے تو جواب دیتے کہ میں مقابلہ اسی وقت کروں گا، جب مجھے ایسی تلوار لا دو جو خود بولتی ہو کہ یہ مؤمن ہے اور یہ کافر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعد رض نے اس بات سے بچنے کی کوشش کی کہ حضرت عثمان رض کے خلاف اگر کچھ مظاہرہ کریں گے تو یہی کہا جائے گا کہ کوفہ کی گورنری سے برطرفی کا یہ انتقام ہے۔ واقعہ کچھ ہی ہو، سعد رض بہر حال اپنی اس روش پر قائم رہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھی، جب تک جہاد کو جہاد سمجھتے رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر حضرت عمر رض کے زمانے تک کرتے رہے لیکن جب معاملہ ان پر پیچیدہ ہوا تو علیحدہ ہو گئے۔ اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور جب ۵۰ھ یا ۵۵ھ میں انتقال کیا تو ازواج مطہرات رض نے چاہا کہ ان کا جنازہ ان کی راہ سے گذرے۔ چنانچہ ان کو مسجد میں لے جایا گیا اور ازواج مطہرات رض نے نماز جنازہ پڑھی، اپنے ساتھیوں کی بہ نسبت سعد رض نے ترکے میں کوئی بڑی دولت نہیں چھوڑی۔ کل دو لاکھ اور تین لاکھ کے درمیان تھا، اور یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی جیسا کہ تم نے دیکھا اور آئندہ دیکھو گے۔

زبیر رض بن العوام

زبیر رض بن العوام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت قریب کا رشتہ تھا، چنانچہ وہ آپ کی پھوپھی صفیہ رض کے لڑکے ہیں جو عبدالمطلب کی لڑکی تھیں، ام المؤمنین حضرت خدیجہ رض بھی ان کی بہت قریبی رشتہ دار تھیں یعنی ان کی پھوپھی تھیں۔ نسب اس طرح ہے، زبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی، اس کے معنی یہ ہیں کہ زبیر رض بن العوام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی کے لڑکے ہیں اور فاطمہ رض ان کی پھوپھی کی صاحبزادی، حضرت ابوبکر رض سے بھی زبیر رض کی رشتہ داری بہت قریب کی تھی اس لیے کہ انھوں نے اسماء رض ذات النطاقین سے شادی کی تھی جو حضرت عائشہ رض کی بہن ہیں، اس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساڑھو ہو کر اور قریب ہو جاتے ہیں۔ ان رشتہ داریوں کی وجہ سے زبیر رض

تقریباً اہل بیت میں سے ہو گئے تھے، تعجب ہے کہ حضرت عثمان رض نے ایک مرتبہ زبیر رض کو جبکہ وہ ان سے جھگڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میں صفیہ رض کا بیٹا ہوں، یہ کہہ دیا کہ وہی تو تمھارے لیے سایہ ہیں وہ نہ ہوتیں تو بے سایہ رہتے، یہ تو بالکل صحیح ہے کہ صفیہ رض زبیر رض کے لیے سایہ تھیں لیکن اگر وہ نہ ہوتیں تو یہ بے سایہ نہ رہتے۔

زبیر رض بچپن ہی سے قوی، شان دار اور بہادر تھے۔ انھوں نے اسلام کی طرف سبقت کی، وہ معرکہ بدر کے دو شہسواروں میں سے ایک ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا حواری کہہ کر پکارتے تھے، اسی وقت سے مسلمانوں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری کہنا شروع کر دیا۔

ہمیں نہیں معلوم کہ زبیر رض کے پاس کس طرح دولت آئی، لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ نئے دولت مند نہیں تھے۔ یہ تو تم کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے دو سواروں میں سے ایک تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ مدینہ ہی میں قیام پذیر رہے۔ حضرت عمر رض اور حضرت ابوبکر رض کے زمانے میں بھی مدینہ سے باہر نہیں گئے، ہاں حج کے لیے یا حضرت عمر رض کی اجازت سے باہر نکلے، حضرت عمر رض نے ان کو شوریٰ کے ممبروں میں رکھا تھا اور اس طرح خلافت کے ایک امیدوار وہ بھی تھے انھوں نے حضرت علی رض اور حضرت عثمان رض دونوں میں سے کسی کے بارے میں اپنا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا اور بے تکلف اپنی رائے عبدالرحمٰن بن عوف رض کے ماتحت کر دی۔ حضرت عثمان رض خلیفہ ہونے کے بعد ان کو مقدم سمجھتے تھے۔ ابن سعد رض کی روایت ہے کہ ان کو حضرت عثمان رض نے چھ لاکھ کا عطیہ دیا جس کے بعد وہ کسی اچھے کاروبار کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ زمین خرید لیجیے، چنانچہ انھوں نے عراق کے دونوں شہروں اور مصر میں زمینیں خریدیں۔ ابن سعد رض کہتے ہیں کہ زبیر رض اپنے پاس لوگوں کی امانت رکھنا پسند نہیں کرتے تھے جب کوئی ان کے پاس امانت رکھنے آتا تو وہ فرماتے یہ قرض ہے، امانت نہیں، یہ اس لیے کہ ایک تو اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا، دوسرے اس قسم کے قرض کے مالوں کو کسی کام میں لگا کر نفع اٹھانے کی صورت کی جائے، یہی وجہ ہے کہ ان کی دولت بہت زیادہ بڑھ گئی، اتنی کہ لوگ اس کو مثالاً پیش کیا کرتے تھے، اسی طرح ان کا قرض بھی بڑھ گیا۔ جمل کے دن آپ نے اپنے لڑکے عبداللہ رض کو وصیت کی کہ ان کے مال میں سے سب قرض ادا کر دے اس سے فراغت کے بعد میراث کا تہائی اپنے لڑکے کے لیے رکھ لے اور اس کے بعد جو کچھ بچے وارثوں میں تقسیم کر دے۔ اور یہ کہا اگر قرض کی ادائیگی میں کچھ دشواری پیش آئے تو اللہ سے استعانت کرے

چنانچہ عبداللہ رض جب کبھی قرض کی ادائیگی میں کچھ محسوس کرتے تو اللہ سے مدد چاہتے۔

بہت سے قرضخواہوں نے چاہا کہ اپنا قرض وارثوں کے حق میں چھوڑ دیں، لیکن عبداللہ رض نے یہ منظور نہیں کیا اور تمام قرض خواہوں کو پوری رقم ادا کر دی جس کی مقدار ۲۵ لاکھ درہم بتائی جاتی ہے۔ عبداللہ ابن زبیر رض مسلسل چار سال تک حج کے موقع پر اعلان عام کرتے رہے کہ جس کسی کا زبیر رض پر کچھ قرض ہے وہ میرے پاس آئے، اس بات میں لوگوں کو اختلاف ہے کہ زبیر رض کے وارثوں میں تقسیم ہونیوالی رقم کی مقدار کیا تھی، کم سے کم اندازہ لگانے والے ۴ کروڑ ۵ لاکھ درہم بتاتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اندازہ کرنے والوں کے خیال میں یہ رقم ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ درہم تھی، درمیانی اندازہ کرنےوالوں نے ۴ کروڑ بتایا ہے اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، اس لیے کہ فسطاط میں، اسکندریہ میں، بصرہ میں اور کوفہ میں زبیر رض کی زمین کے خطے تھے۔ خود مدینہ میں گیارہ مکانات اور بہت کچھ ساز و سامان اور کرائے کی آمدنی تھی۔

زبیر رض حضرت عثمان رض کے شدید مخالف نہ تھے، حضرت عثمان رض ان کو پسند کرتے تھے اور باوجود کسی وقت کی باہمی رنجش کے ان کو عطیات دیتے تھے۔ حضرت عثمان رض عبداللہ بن زبیر رض کو بھی پسند فرماتے تھے۔ ان سے محبت کرتے تھے۔ محاصرے کے زمانے میں ان کو گھر پر مقرر کیا، ان کو اپنی وصیت دی کہ باپ تک پہنچا دیں۔ حضرت عثمان رض نے زبیر رض کو کچھ وصیت کی تھی، زبیر رض ان صحابہ کے ساتھی تھے جو حضرت عثمان رض پر تنقید اور نصیحتیں کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ہمیں زبیر کی شدت اور کسی مخالفت کا علم نہیں۔

طلحہ بن عبیداللہ رض

طلحہ بن عبیداللہ تیمی تھے، ان کا تعلق حضرت ابوبکر رض کی قوم سے ہے۔ یہ عہد جاہلیت میں تاجر تھے اور حضرت عثمان رض کے دوست۔ جس سال یہ اور حضرت عثمان رض اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے دونوں تجارت کے سلسلے میں شام گئے تھے۔ طلحہ رض اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح اسلام کے سابقین اولین میں تھے۔ اسلام ان کی تجارت کی راہ میں حائل نہیں ہوا، یہ اکثر شام کا سفر کیا کرتے تھے، مدینہ کے راستے میں ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی تھی جبکہ آپ ہجرت فرما رہے تھے اور صدیق اکبر رض

ساتھ تھے اور یہ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے، طلحہ رضہ نے دونوں کے لیے کچھ تحفہ پیش کیا، اور یہ خبر دی کہ مسلمان مدینے میں بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں، تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رفتار تیز کردی کہ مدینہ والوں کی انتظار کی شدت میں کچھ کمی ہو، طلحہ رضہ مکہ آئے اور اپنا انتظام ٹھیک کر کے مدینہ منورہ واپس ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بن کر مہاجرین صحابہ رضہ کے ساتھ رہنے لگے۔

بدر، اُحد اور تمام غزوات میں طلحہ رضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے اور سخت آزمائشوں میں ثابت قدم رہے، معرکۂ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی حفاظت کی، آپ کی طرف آنے والے ایک تیر کو روک لیا جو آپ کی ایک انگلی پر لگا، جس سے انگلی شل ہوگئی، اسی معرکے میں آپ کا تمام جسم زخمی ہوگیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے جسے یہ دیکھنا پسند ہو کہ ایک شخص مر کر بھی زمین پر چلتا ہے وہ طلحہ بن عبید اللہ رضہ کو دیکھ لے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ طلحہ رضہ اُحد کے معرکے میں مرنے کے بالکل قریب ہوگئے تو ان کا درجہ شہیدوں کا درجہ ہے اور غالباً آپ کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھایا
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ	جس بات کا عہد کیا تھا۔ پھر کوئی تو ان میں
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	پورا کر چکا اپنا ذمہ، اور کوئی ہے ان میں راہ
يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔	دیکھ رہا ہے اور بدلا نہیں ایک ذرہ۔

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ یوم اُحد کے شہداء میں طلحہ رضہ کو بھی شمار کر لیا جائے، یوم اُحد کے شہیدوں میں حمزہ رضہ اور مصعب رضہ بھی تھے۔

طلحہ رضہ بدستور اپنی تجارت میں معروف رہے، صرف انھیں دنوں میں تجارت نہ کر سکے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک تھے۔ حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت عمر رضہ کے زمانہ میں بڑے بڑے مہاجر صحابہ رضہ کی طرح مدینے ہی میں رہے۔ حضرت عمر رضہ نے ان کو شوریٰ کا ممبر بنایا، لیکن وہ اس میں حاضر نہ ہوسکے۔ فاروق اعظم رضہ کی وفات کے موقع پر اپنی تجارتی مصروفیتوں میں مدینہ سے باہر تھے۔ حضرت عمر رضہ نے اپنے ساتھیوں کو بعجلت بلانے کے لیے بھیجا اور وہ بڑی تیزی سے آئے بھی۔ لیکن جب مدینہ پہنچے تو حضرت عثمان رضہ کے لیے بیعت ہوچکی تھی۔ اس پر غصہ ہو کر گھر بیٹھ رہے کہ شوریٰ نے ان کی غیر حاضری میں فیصلہ کر لیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھ جیسے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ

عبدالرحمنؓ بن عوف ان کے پاس گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اختلاف کے نتائج پر نظر رکھیں اور بیعت کرلیں. کہا جاتا ہے کہ خود عثمان رضؓ بھی ان تک پہنچے اور ان سے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو، تو میں خلافت کا منصب تم کو واپس کردوں، طلحہ رضؓ نے کہا کیا واقعی آپ اس کے لیے تیار ہیں؛ حضرت عثمانؓ نے کہا بے شک. طلحہ رضؓ نے جواب دیا کہ پھر میں سرتابی نہیں کرسکتا۔ اگر آپ چاہیں تو اسی مجلس میں بیعت کرلوں یا فرمائیں تو مسجد میں۔

بنی امیہ ڈر رہے تھے کہ کہیں طلحہ رضؓ بیعت سے ٹال مٹول نہ کردیں. لیکن ، جب انھوں نے وعدہ کرلیا تو وہ مطمئن ہوگئے ، حضرت عثمان رضؓ طلحہ رضؓ پر عنایت کی نظر رکھتے تھے اور ان کو عطیات پیش کیا کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ طلحہ رضؓ نے حضرت عثمان رضؓ سے پچاس ہزار کا قرض لیا تھا، ایک دن حضرت عثمان رضؓ سے کہا کہ مال موجود ہے کسی کو بھیج کر منگوا لیجیے، حضرت عثمان رضؓ نے کہا، تمھاری خودداری پر میری طرف سے ادا سمجھو، کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے ان کو دو لاکھ کا عطیہ دیا۔ پھر ان میں اور حضرت عثمان رضؓ کے درمیان خرید و فروخت رہا کرتی تھی. حجاز میں حضرت عثمان رضؓ خریداری کرتے، اور طلحہ رضؓ فروخت کرتے تھے۔ عراق میں طلحہ رضؓ خرید کرتے اور حضرت عثمان رضؓ فروخت کرتے تھے، طلحہ رضؓ بڑے خیرات کرنے والے آدمی تھے، اپنے گھر میں نقد مال جمع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی گھر میں ایسی دولت زیادہ جمع ہوجاتی تو جب تک اس کو اپنے رشتہ داروں میں (بنی تیم) اور قریشی اور انصاری دوستوں میں تقسیم نہ کرلیتے چین سے نہ بیٹھتے. محتاجوں کی امداد کے لیے بڑی بے تابی سے دوڑ پڑتے، قرض داروں کا بوجھ بھی ہلکا کرتے، ضرورت مندوں کی کپڑے اور پیسے سے امداد کرتے، کھانا بھی کھلاتے ان زبردست مصارف کے بعد بھی آپ کی دولت بہت بڑی تھی، اتنی بڑی کہ اس کا تذکرہ کوفہ میں سعید بن العاص رضؓ کی مخالفت کا سبب بنا جیسا کہ ہم نے پہلے اس کا ذکر کیا ہے۔

روایات میں ہے کہ طلحہ رضؓ وہ پہلے آدمی ہیں، جنھوں نے حجاز میں گیہوں کی کاشت کی جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا ترکہ تین کروڑ درہم تھا جس میں ۲۲ لاکھ درہم اور دو لاکھ دینار نقد تھے، باقی میں زمینیں اور دوسرے اسباب تھے[1]

طلحہ رضؓ جیسا کہ تم نے پڑھا پہلے دن سے حضرت عثمان رضؓ کے مخالف ہیں، اس لیے کہ ان کی بیعت کے موقع پر وہ حاضر نہ تھے، لیکن حضرت عثمان رضؓ نے ان کو راضی کرلیا اور طرفین کے تعلقات ٹھیک ہوگئے، پھر عطیات دے کر حضرت عثمان رضؓ نے معاملات کو اور بھی ٹھیک کرلیا، پھر جب حضرت

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۳، قسم اول ص۱۵۸ مطبوعہ لیدن۔

عثمان رض کی مخالفت میں زور پیدا ہوا تو جیسا کہ روایات میں مذکور ہے، سرگرم ہو گئے۔ اور جیسے ہی مخالفت میں غیر معمولی شدت ہوئی تو وہ ہجوم کرنے والوں کی صف میں تھے، اور جب عثمان رض کا محاصرہ کیا گیا تو وہ حلقہ باندھنے والوں میں نظر آئے اور جب حضرت عثمان رض شہید کر دیئے گئے تو طلحہ رض ان لوگوں میں تھے جن کو حضرت علی رض کے غم عثمان رض پر حیرت تھی۔ پھر جب حضرت علی رض کے لیے بیعت ہو چکی تو طلحہ رض زبیر رض کے ساتھ بیعت کرنے والوں میں تھے۔ اس کے بعد وہ زبیر رض کے ساتھ حضرت عثمان رض کے خون کے بدلے کا مطالبہ کرنے لگے اور حضرت علی رض کی بیعت توڑ دی، اس کے بعد وہ جمل کے دن قتل کر دیئے گئے۔

راویوں کا بیان ہے کہ ان کی موت مروان بن الحکم کے ایک تیر سے ہوئی۔ مروان کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے کبھی حضرت عثمان رض کے خون کے بدلے کا مطالبہ نہیں کیا، مروان کے خیال میں حضرت عثمان رض کے قتل پر آمادہ کرنے والوں میں طلحہ رض پیش پیش تھے۔ جب طلحہ رض کو تیر لگا اور ان کے جسم سے خون نکلنے لگا تو کہنے لگے کہ یہ وہ تیر ہے جسے اللہ نے پھینکا ہے، اے خدا! عثمان رض کا بدلہ مجھ سے لے تاکہ تو راضی ہو جا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ طلحہ رض کی مخالفت کا ایک خاص رنگ تھا، جب تک دولت اور عزت ملتی رہی خوش رہے، جب اس سے بھی زیادہ کی حرص پیدا ہو گئی تو مخالفت پر آمادہ ہو کر خود بھی ہلاک ہوئے، دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

علی رض بن ابی طالب

حضرت علی رض کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ اور آپ کی نگاہوں میں ان کا مرتبہ بلاشبہ ہمارے کسی بیان سے بے نیاز ہے، ابو طالب کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عنایات کون نہیں جانتا۔ قریش کے مقابلے میں ابو طالب کا آپ کی اور آپ کے دین کی حمایت عام بات ہے پھر ابو طالب نے آپ کی کفالت کی اور جب کثرت اولاد سے ان کا ہاتھ کچھ تنگ ہوا تو آپ نے حضرت علی رض کی کفالت فرمائی، نبوت کے وقت علی رض لڑکے تھے۔ گویا گیارہ سال کی عمر میں اسلام لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المؤمنین حضرت خدیجہ رض کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے رہے۔ حضرت علی رض بتوں کے متعلق کچھ جانتے نہ تھے، اسلام لانے سے پہلے وہ بتوں کے تصور سے خالی تھے، پس اسلام کے سابقین اولین میں آپ ہی کو یہ امتیاز ہے کہ آپ کی تربیت خالص اسلامی ماحول میں ہوئی، زیادہ جامع تعبیر میں یوں کہیئے

کہ آپ کی پرورش کاشانۂ وحی میں ہوئی، پھر وہ آپ ہی تھے جن کو مدینہ کی طرف ہجرت کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین بنایا، تاکہ وہ تمام امانتیں جو لوگوں نے آپ کے پاس رکھی تھیں، ان کو واپس کریں، چنانچہ مکہ میں آپ تین دن مقیم رہے اور پھر قبل اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے واپس ہوں، ان سے جا ملے۔

سیرت کے راویوں کا بیان ہے کہ جس رات قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کی سازش کی تھی، حضرت علی رضؓ آپ کے بستر پر سو رہے تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت کی اور مہاجرین میں اور انصار و مہاجرین میں مواخاۃ قائم کی تو علی رضؓ کو اپنا بھائی بنایا، بعد میں سہل بن حنیف سے ان کا بھائی چارہ کیا۔

پس نسبی اعتبار سے حضرت علی رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور پرورش کردہ تھے اور آپ کے ہجرتی بھائی بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ رضؓ سے شادی کردی، جس کی وجہ سے اب تک آپ کی نسل جاری ہے۔ جہاد کے میدانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام غزوات میں اسلام کا جھنڈا حضرت علی رضؓ کے ہاتھ میں رہا، وہ ایک بہادر، دلیر اور خداداد قوت کے مالک تھے۔ جس کی مثال لوگوں میں نہیں دیکھی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک کے لیے نکلے تو اپنے گھر کا جانشین انھیں کو بنایا تھا۔ حضرت علی رضؓ کو یہ بات پسند نہ تھی یا پھر لوگوں میں اس کا کچھ تذکرہ سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضؓ سے فرمایا، کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تم میرے لیے موسیٰؑ کے ہارونؑ بنو؟ لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے اور خلافت کے لیے کوئی صاف اور کھلا حکم نہیں دے گئے۔ البتہ بیماری کے دنوں میں ہدایت کی کہ ابوبکر رضؓ کو نماز پڑھانے کے لیے کہو، اب جن لوگوں نے ابوبکر رضؓ کو خلافت کے لیے پسند کیا انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضؓ کو ہمارے دین کے لیے پسند کیا تو کیوں نہ ہم ان کو اپنی دنیا کے لیے بھی پسند کرلیں میں ان اختلافات میں حصہ نہیں لینا چاہتا جو صدیق اکبر رضؓ اور فاروق اعظم رضؓ کی بیعت سے متعلق شیعوں اور ان کے مخالفین نے پیدا کیے ہیں۔ میں تو صرف یہ ریکارڈ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت علی رضؓ نے ان دونوں خلفاء کی اخلاص کے ساتھ بیعت کی اور سچائی کے ساتھ ان کے خیر خواہ بنے رہے اور جب جب ضرورت پڑی ان کو مشورے دیتے رہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان یہ کہتے کہ علی رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہیں، ان کے پرورش کردہ ہیں، ان کی امانتوں کے ذمہ دار اور مواخاۃ کی تقریب سے آپ کے بھائی ہیں، پھر آپ کے [illegible] آپ سے

چلنے والی نسل کے جدّ امجد ہیں، آپؐ کے علمبردار، آپ کے گھر کے جانشین اور آپؐ کے لیے موسیٰؑ کے ہارون مسلمان یہ سب کچھ کہتے اور ان وجوہ کی بنا پر ان کو خلیفہ بنا لیتے تو یہ نہ کوئی سرتابی ہوئی اور نہ راستے سے دور ہونا، کہا جاتا ہے کہ عباسؓ بن عبدالمطلب نے چاہا کہ علی رض کی بیعت کر لیں، لیکن خود حضرت علیؓ نے انکار کیا۔ اور مسلمانوں میں تفریق گوارا نہ کی اور دونوں خلفائے راشدین تک معاملہ یونہی چلتا رہا۔

پھر حضرت عمر رض نے بھی بات ان کے سپرد نہیں کی، بلکہ مجلس شوریٰ بنائی اور اس میں ان کو بھی ایک رکن بنایا حالانکہ وہ خود ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر علی رض کو لوگوں نے والی بنایا تو وہ ان کو سیدھی راہ پر چلا سکیں گے۔

حضرت عمر رض نے حضرت علی رض کو دو باتوں کے پیش نظر نامزد نہیں کیا، ایک تو یہ کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے معاملات کی ذمہ داری زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اپنے سر لیں۔ دوسری یہ کہ قریش کی اکثریت بنی ہاشم سے خلافت اس خوف سے نکالنا چاہتی تھی کہ مبادا وہ ان کی وراثت ہو جائے اور پھر قیامت تک قریش کے کسی دوسرے خاندان میں منتقل نہ ہو سکے۔ چنانچہ قریش کے اس خطرے نے کہ وہ بنی ہاشم کی رعایا نہ بن جائیں اور خلافت کسی دوسرے خاندان میں منتقل نہ ہو جاتے، بنی ہاشم کو قصداً اس سے دور رکھا۔

حضرت عثمان رض کو بھی فاروق اعظم رض نے دو ہی باتوں کے خیال سے نامزد نہیں کیا، ایک تو یہی کہ مسلمانوں کے معاملات کا بار زندگی کے بعد اپنے سر نہ لیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کو خوف تھا کہ بنی امیہ خلافت کو اپنے لیے خاص کر لیں گے اور کسی دوسرے خاندان کو موقع نہیں دیں گے۔ کہتے ہیں کہ عباسؓ نے حضرت علی رض کو مشورہ دیا کہ وہ شوریٰ میں حصہ نہ لیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ ذمہ لیتے ہیں کہ لوگ ان سے اختلاف نہیں کریں گے، لیکن حضرت علی رض نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح حضرت عمر رض کی بیعت قبول کر لی اور وفاداری کے ساتھ حضرت عمر رض کی زندگی اور موت تک اس پر قائم رہے۔ حضرت عمر رض کی وفات کے بعد خلافت کی ہر بات حضرت علیؓ کے حق میں تھی۔ نبیؐ سے آپ کا رشتہ، اسلام کی طرف آپ کی سبقت، مسلمانوں کی نگاہوں میں آپ کا درجہ، اللہ کی راہ میں آپ کی ثابت قدمی، آپ کی صاف اور ستھری زندگی جس میں کہیں دھبہ نہیں دین میں آپ کی شدت، کتاب و سنت میں آپ کا تفقہ، مشکلات اور پیچیدگیوں کے مواقع پر آپ کی صحت فکر اور اصابت رائے۔

حضرت ابوبکر رض پر آپ کو مقدم کرنے میں مسلمانوں نے اگر کچھ حرج دیکھا، اس لیے کہ وہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بڑا درجہ رکھتے تھے، آپ کے غار کے ساتھی تھے، انھیں کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عمر رض سے بھی ترجیح دینے میں اگر مسلمانوں نے کچھ مضائقہ سمجھا کہ ان کا بھی بڑا درجہ ہے اور حضرت ابوبکر رض نے ان کو نامزد بھی کر دیا تھا، لیکن یہ تو مسلمانوں کے بس کی بات تھی کہ وہ حضرت عمر رض کے بعد حضرت علی رض کو خلیفہ پسند کرتے، ایسا کرنے میں ان کے لیے کوئی حرج اور مضائقے کی بات نہ تھی۔ حضرت عمر رض نے خود ان کو امیدوار بنایا تھا۔ ان کی حیثیت بھی امیدواری کے حق میں تھی، پھر وہ عام عربوں میں اور خاص قریش میں تعلقات کے اعتبار سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض کی طرح تھے، آپ کی دامادی کا رشتہ قریش میں تھا، مضر میں تھا، ربیعہ میں تھا اور یمنیوں میں بھی تھا۔ مختلف قبیلوں میں ازدواجی رشتوں نے آپ کے بہت سے بیٹے پیدا کر دیئے تھے، اگر عام مسلمانوں میں افتراق ہونے سے پہلے آپ خلیفہ ہو جاتے تو یقیناً دور دور کے تعلقات اور رجحانات میں نزدیکی پیدا کر لیتے اور لوگوں کو اپنی اطاعت پر متحد کر لیتے اور بقول حضرت عمر رض "راستے پر چلاتے۔"

لیکن مسلمانوں نے دو باتوں کی وجہ سے ایسا کرنا پسند نہیں کیا، ایک تو قریش کا یہ خدشہ کہ اگر کسی ہاشمی کو خلافت ملی تو وہیں کی ہو کر رہ جائے گی، حالانکہ واقعات نے بتا دیا کہ حضرت علی رض نے خلافت کو وراثت نہیں بنایا، ان کی راہ اس معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت عمر رض کی راہ تھی، آپ نے کسی کو نامزد نہیں کیا۔

دوسری بات یہ کہ بیعت کے موقع پر عبدالرحمٰن بن عوف رض جب یہ شرط پیش کر رہے تھے کہ وہ کتاب اور سنت پر چلیں گے اور شیخین رض کی اتباع کریں گے اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کریں گے، تو حضرت علی رض نے اس شرط کے ماننے سے انکار کر دیا، ان کو یہ ڈر تھا کہ مبادا حالات شرط پوری کرنے کی راہ میں حائل ہو جائیں، حضرت علی رض کا یہ خطرہ اس کا مستحق تھا کہ مسلمان اس پر توجہ کرتے، ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے اور ان کے اخلاص پر اعتماد کرتے اس لیے کہ انھوں نے اپنی طاقت اور امکان کے اندر اتباع کرنا ضروری خیال کیا، لیکن عبدالرحمٰن بن عوف رض دوسرے مسلمانوں کی طرح خلافت سے متعلق تمام معاملات میں بڑے محتاط اور دور رس تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن رض ڈرے کہ حضرت علی رض کی یہ تحفظ والی روش کہیں مطلب اور خود غرضی والی روش تو نہیں ہے۔ بس جب حضرت عثمان رض نے بلا کسی تذبذب کے منظور کر لیا کہ وہ کتاب و سنت اور شیخین رض کی اتباع اپنے لیے لازمی قرار دیں گے، تو اطمینان کے ساتھ ان کی بیعت کر لی حالانکہ بعد میں ہونے والے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ حضرت عثمان رض وہ نہ کر سکے، جو شیخین رض نے کیا اور وہ ان کی راہ پر قائم رہے اور حضرت علی رض

نے اپنی خلافت کی مختصر مدت میں جیساکہ واقعات بتلاتے ہیں، وہ کچھ کر بتایا جو شیخینؓ نے کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی اہم، حضرت علیؓ نے فاروقی سیرت کی اتباع ایک ایسی رعایا میں کی جو حضرت عمرؓ کی رعایا سے کہیں زیادہ سخت کڑا اور دنیا کی طرف راغب تھی۔ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کی راہ اس دور میں چلتے رہے جو اختلاف، سرکشی، بغاوت اور فتنوں کا دور تھا جس کے بعد مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔

حضرت علیؓ کی زندگی جیسی فتوحات سے پہلے خشک اور زاہدانہ تھی، فتوحات کے بعد بھی ویسی ہی سادہ اور تنگ رہی، نہ انھوں نے کوئی تجارت کی، نہ کوئی کاروبار بڑھایا، ان کو جو وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قناعت کی، اسی سے اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالتے رہے۔ مقام ینبع میں ان کی ایک زمین تھی۔ اسی میں کچھ سرمایہ لگاتے اور فائدہ اٹھاتے تھے اور بس، اور جب ان کا انتقال ہوا تو آپ کے ترکے کا حساب کروڑوں لاکھوں تو کیا ہزاروں سے بھی نہ ہو سکا، بقول آپ کے صاحبزادے حسنؓ کے کل سات سو درہم تھے اور آپ چاہتے تھے کہ اس سے ایک غلام خرید لیں۔

حضرت علیؓ اپنی خلافت کے مختصر دور میں موٹا لباس پہنتے تھے اور وہ بھی پیوند لگا ہوا، ہاتھ میں دُرّہ لیے بازاروں میں گشت لگاتے اور حضرت عمرؓ کی طرح عوام کو نصیحت اور تمیز سکھاتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بہت ٹھیک اندازہ لگا کر اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا تھا کہ "اس اصلح[1] کو اگر لوگوں نے والی بنایا، تو وہ ان کو راستے پر لے چلے گا":

بلاشبہ حضرت علیؓ اپنے مرکزی رجحان کی بنا پر اس بات کے مخالف تھے کہ خلافت غیر بنی ہاشم میں کر دی جائے، لیکن وہ آج کل کے مفہوم میں پوری طرح جمہوری تھے اور خلافت کو موروثی خیال نہیں کرتے تھے، وہ تو اس کو ایک ذمہ داری تصور فرماتے تھے جو مسلمان ارباب حل وعقد کی طرف سے خلیفہ کو دونوں کی رضامندی کے بعد سپرد کی جاتی ہے۔ چنانچہ پہلی بار جب ذمہ داروں نے خلافت ان کے سپرد نہیں کی بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو دی اور دوسری بار حضرت عمرؓ کے حوالے کی تو انھوں نے سر تسلیم خم کر لیا۔ اور شیخینؓ کی بیعت کر لی اور ان کے وفادار رہے اور مخلصانہ مشورے بھی پیش کرتے رہے، آپ نے حضرت عمرؓ کی موت کے بعد جب کہ شوریٰ کے لوگ باہم مشورہ کر رہے تھے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن یہ مشورہ انتہائی شرمیلے انداز میں تھا اور پھر رک گئے۔ اور اپنے کو دوسروں کی طرح بنالیا اور عبدالرحمٰنؓ سے مسلمانوں کی خیر خواہی کا عہد لیا اور اپنی طرف سے اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا بعض تصنیف کرنے والے راوی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت میں تاخیر کی، تب

---

[1] اصلح وہ آدمی جس کے سر پر صرف کانوں کی طرف بال ہوں۔ مراد حضرت علیؓ ہیں۔

عبدالرحمٰن رضؓ نے ان کو متنبہ کیا اور دھمکی دی۔ لیکن دوسرے راویوں کا بیان حضرت علیؓ کی سیرت اور اخلاق کے بالکل مناسب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت علی رضؓ نے عبدالرحمٰن رضؓ کی پیش کردہ شرطیں منظور نہیں کیں اور حضرت عثمان رضؓ نے منظور کر لیا تو حضرت علی رضؓ نے کہا ابو عبداللہ نے شرط مان لی ہے، اب تم ان کی بیعت کر لو، اگر انھوں نے تاخیر کی ہوتی یا جبر واکراہ سے بیعت کی ہوتی تو ان کو اپنے گھر بیٹھ رہنا اور حضرت عثمان رضؓ اور شوریٰ سے کچھ دنوں کے لیے یا عرصہ تک کے لیے قطع تعلق کر لینا مناسب تھا۔ لیکن وہ اپنے گھر بیٹھ نہیں رہے۔ حضرت عثمان رضؓ کی مجلس بیعت میں حاضر رہے اور عبیداللہ بن عمر رضؓ کے قصے میں حضرت عثمان رضؓ کو اشارہ بھی کیا کہ ہرمزان کے قتل کے عوض عبیداللہ سے قصاص لینا چاہیئے۔

حضرت علی رضؓ تینوں خلفاء کے مخالف تھے لیکن شیخین رضؓ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے خفیف اعتراض کا بھی ان کو موقع ملتا۔ چہ جائیکہ تلخ تنقید اور کڑی نکتہ چینی کا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لیے حضرت علی رضؓ کی مخالفت نمایاں نہیں ہوئی۔ دوسرے مہاجر اور انصار صحابہ رضؓ کی طرح حضرت علی رضؓ بھی اپنی خیر خواہی اور مشورہ پیش کرتے رہے۔ اور اطاعت کرتے رہے، جب حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت علی رضؓ کی مخالفت میں تھوڑی سی شدت مجلس شوریٰ کے موقع پر پیدا ہوئی لیکن پھر انھوں نے وہی روش اختیار کر لی۔ جو شیخین رضؓ کے ساتھ رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے حضرت عثمان رضؓ کی خیر خواہی کی ان کی اطاعت کی اور ان کو مشورے اور اشارے دیئے لیکن حضرت عثمان رضؓ کے طرز عمل نے ان میں مخالفت کا ذرا سخت جذبہ پیدا کر دیا۔ عبیداللہ بن عمر رضؓ کے معاملے میں ان کی طرح حضرت علی رضؓ کی رائے معاف کر دینے کی نہ تھی۔ پھر بعد کے حالات اور حوادث نے ایسے مواقع فراہم کر دیئے کہ حضرت علی رضؓ کی مخالفت میں تدریجاً اضافہ ہی ہوتا گیا۔ لیکن یہ سب کچھ بہر حال ایک نیک اور گرم مخالفت اور اللہ کے عتاب سے ڈرانے کے حدود سے باہر نہ تھا، پھر حالات نے ایسی شدت اور نزاکت اختیار کر لی کہ ایک دن حضرت علیؓ مجبور ہوئے کہ لوگوں کے سامنے حضرت عثمان رضؓ کی مخالفت کریں اور یہ وہ موقع تھا جب عثمان رضؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس مال سے بلا کسی پابندی کے اپنی ضرورت کے مطابق مخالفین کے علی الرغم لے لیں گے۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا تو آپ کو اس سے روکا جائے گا، بہر حال حضرت علی رضؓ کا طرز عمل حضرت عثمان رضؓ کے ساتھ خیر خواہی، مشورہ اور بعض اوقات سخت اعتراض کے سوا کچھ نہ تھا اور کبھی وہ ان حدود سے آگے نہیں بڑھے وہ بعض مواقع پر حضرت عثمان رضؓ اور ان کے مخالفین کے درمیان واسطہ بھی بنے۔ ایک طرف حضرت عثمان رضؓ کو حقیقت حال سے باخبر کیا، دوسری طرف لوگوں کو فتنے سے روکا

لیکن جب مایوس ہو گئے کہ حضرت عثمان رضؓ خود اپنے گھر والوں پر قابو نہیں پاتے تو گھر بیٹھ رہے اور بیچ بچاؤ کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے باوجود محاصرے کے دوران میں وہ حضرت عثمان رضؓ کے لیے ایک درد مند محسن رہے۔ ان کے گھر تک پانی پہنچایا۔ محاصرہ کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دونوں لڑکوں کو بھیجا۔ بلا شبہ حضرت عثمان رضؓ کے پورے دور خلافت میں حضرت علی رضؓ کی ایک چشمک تھی۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کو ان کے رشتہ داروں نے حضرت علی رضؓ سے بے حد خائف رکھا، اگر حضرت عثمان رضؓ حضرت علی رضؓ کے نقش قدم پر چلتے اور ان کے رشتہ دار ان کے اور لوگوں کے درمیان حائل نہ ہوتے تو یقیناً حضرت علی رضؓ کی روش وہی ہوتی جو شیخین رضؓ کے ساتھ تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو نہ یہ فتنہ ہوتا اور نہ ہم کو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت پڑتی۔

حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے تعلقات میں خرابی پیدا کرنے والے حضرت عثمان رضؓ کے رشتہ داروں کے علاوہ کوئی نہ تھا، ان ہی لوگوں کی بدولت ایک مرتبہ دونوں میں تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس بات کا ثبوت بلاذری کی وہ روایت ہے جو انھوں نے انساب الاشراف میں اپنی سندوں کے ساتھ درج کی ہے کہ حضرت عباس رضؓ دونوں کے درمیان تھے، انھوں نے حضرت عثمان رضؓ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "میں علی رضؓ کے متعلق آپ کو خدا کی یاد دلانا چاہتا ہوں جو آپ کے بھتیجے ہیں، ماموں کے لڑکے ہیں، آپ کے داماد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے دوست بھی، مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کچھ ارادہ رکھتے ہیں" حضرت عثمان رضؓ نے کہا۔ سب سے پہلا جواب میری طرف سے یہ ہے کہ میں آپ کی سفارش قبول کرتا ہوں، اگر علی رضؓ چاہتے تو میرے نزدیک ان کی جگہ سب سے اونچی ہے لیکن ان کو تو اپنی بات کی ضد ہے، پھر حضرت عباس رضؓ نے حضرت علی رضؓ کو حضرت عثمان رضؓ ہی کی طرح خطاب کیا، حضرت علی رضؓ نے جواب دیا اگر عثمان رضؓ مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم دیں تو میں گھر چھوڑ دوں گا۔[۵]

لیکن یہ بیچ بچاؤ سب بے سود رہا، حضرت عثمان رضؓ اپنی راہ چلتے رہے، حضرت علی رضؓ مخالفت سے باز نہ آئے اور حضرت عثمان رضؓ کے رشتہ دار طرفین کے تعلقات میں بدستور خرابی پیدا کرتے رہے۔ تا آنکہ معاملہ نازک ہو گیا، بلاذری ہی نے اپنی سندوں سے روایت کی ہے، عبداللہ بن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ نے حضرت علی رضؓ کی شکایت کرتے ہوئے میرے والد سے کہا کہ ماموں! علی رضؓ نے تعلق توڑ رکھا ہے اور تمہارے صاحبزادے نے لوگوں کو لگا رکھا ہے۔ اے عبدالمطلب کے لڑکو! بخدا اگر تم یہ بات (خلافت) بنی تیم اور بنی عدی کے لیے طے کر چکے ہو تو عبد مناف کی اولاد اس کی زیادہ

حقدار ہے کہ تم اس کے حاسد نہ بنو، اور اس معاملے میں اس سے جھگڑا نہ کرو، عبداللہ بن عباس رض کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرے باپ دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد کہا بھانجے! اگر علی رض آپ کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں تو آپ ان کی نگاہوں میں پسندیدہ کس طرح بن سکتے ہیں، جہاں تک رشتہ داری اور خدمت کا تعلق ہے اس میں آپ سے نہ اختلاف ہے نہ انکار۔ اب اگر آپ کتر بیونت کر کے کچھ اونچے کو نیچا اور کچھ نیچے کو اونچا کر دیں تو دونوں قریب تر ہو جاتے ہیں اور یہی بات زیادہ بہتر اور ملاپ کی ہے۔ حضرت عثمان رض نے کہا میں اس معاملہ میں تم کو اختیار دیتا ہوں۔ عبداللہ بن عباس رض کہتے ہیں کہ اب بات قریب آ چکی تھی۔ لیکن جب ہم ان کے پاس سے نکلے تو مروان ان سے ملنے گیا، اس نے حضرت عثمان رض کو ان کی رائے پر قائم نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ان کا آدمی میرے والد کو بلانے آیا اور جب وہ پہنچے تو حضرت عثمان رض نے کہا، ماموں! میں نے آپ کو جو اختیار دیا ہے اس کو ابھی ملتوی رکھیئے۔ ابھی میں اس میں غور کروں گا، میرے والد واپس آئے اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے، یہ شخص تو دوسروں کے بس میں ہے۔ اس کے بعد خدا سے دعا مانگی۔ اے اللہ! تو مجھے فتنے سے پہلے اٹھا لے، مجھے تو اس بات کے لیے باقی نہ رکھ جس میں میرے لیے کوئی بھلائی نہیں۔ چنانچہ جمعہ بھی نہیں آیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا[1]۔

حضرت عباس رض نے دونوں کے درمیان صلح و صفائی کی کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ پھر حضرت عثمان رض نے دوسری بار ان کو درمیان میں ڈالا اور غالباً پہلی مرتبہ کی طرح وہ کامیاب ہو جاتے لیکن مروان نے ان کو ان کی رائے سے پھرا دیا۔ جس کی وجہ سے معاملات خراب سے خراب تر ہو گئے اور وہ فتنہ ہوا جس کا عباس رض کو خطرہ تھا۔

ان آخری پانچ فصلوں میں ناظرین نے شوریٰ کے ممبروں کی سیرت کا کچھ حال پڑھا اور دیکھا کہ خلیفہ ہو جانے کے بعد حضرت عثمان رض کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے اور وہ کس پوزیشن میں تھے۔ غالباً ان فصلوں کا بہترین خاتمہ وہ روایت ہو گی جس میں ان کے متعلق حضرت عمر رض کی رائے بیان کی گئی ہے۔ یہ رائے روایت کے اعتبار سے واقعۃً حضرت عمر رض کی ہو یا نہ ہو، اس سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت لوگوں کے دلوں میں کیا تھا، اور راویوں، مؤرخوں اور خصوصاً محدثوں کے افکار و خیالات کیا تھے؛

ابن عباس رض سے بلاذری نے اپنی سندوں کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضرت عمر رض نے زخمی ہونے سے

---

[1] انساب الاشراف بلاذری ج ص ۱۳، ۱۴ مطبوعہ قدس۔

پہلے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امتِ محمدؐ کے لیے کیا کروں! میں نے کہا فکر کیوں کرتے ہو. آپ کے پاس جانشین تو ہیں، فرمانے لگے کون! تمھارے دوست علیؓ! میں نے کہا ہاں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار اور ان کے داماد ہونے کی وجہ سے اس کے اہل ہیں. پھر وہ اسلام کے سابقین میں ہیں اسلام کی راہ میں انھوں نے مصیبتیں اٹھائی ہیں. حضرت عمرؓ نے جواب میں کہا ان میں مذاق اور ظرافت ہے، میں نے کہا پھر طلحہؓ کے متعلق کیا خیال ہے! فرمانے لگے ان کی تمکنت اور نخوت کے کیا کہنے! میں نے کہا عبدالرحمٰنؓ بن عوف، فرمایا مرد نیک مگر دینے والا. میں نے کہا پھر سعد. آپ نے کہا وہ تو ہجوم اور حملے کے آدمی ہیں ذمہ داری دے دی جائے تو ایک گاؤں بھی سنبھال نہ پائیں گے. میں نے کہا تو پھر زبیرؓ، فرمایا متلون مزاج، خوشی کا مومن غصے کا کافر. حریص خلافت کے لیے تو ایک ایسا قوی اور دردمند درکار ہے جس کی قوت میں ظلم کا، جس کی ہمدردی میں کمزوری کا پہلو نہ ہو. جو فیاض ہو لیکن مسرف نہ ہو. میں نے کہا تو پھر عثمان رضؓ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، فرمانے لگے، ان کو اگر والی بنا دیا گیا تو وہ ابو معیط کے خاندان کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیں گے. اور اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ ان کی جان لے لیں گے[1]

عبداللہؓ بن مسعود

شوریٰ کے ان ممبروں کی مخالفت تو معمولی تھی، لیکن دوسرے صحابہ رضؓ اور کہنا چاہیئے کہ جلیل القدر اور ممتاز صحابہ، حضرت عثمان رضؓ کے شدید مخالف تھے ان کی شدید کشاکش تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے. جس پر گفتگو کرنے والوں نے بہت کچھ کہا ہے اور اختلاف کرنے والوں نے خوب خوب ردوقدح کی ہے، حضرت عثمان رضؓ کے مخالف صحابہ میں ایک حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں. جو بنی زہرہ کے حلیف تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ چھوٹے تھے اور عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چراتے تھے. ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر رضؓ کے ساتھ ان کے پاس آئے اور کہا کچھ دودھ ہو تو پلاؤ، انھوں نے کہا میں آپ کو دودھ نہیں پلا سکتا. یہ بکریاں دوسرے کی امانت ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمھارے پاس کوئی ایسی بکری ہے جس کے بچہ نہ ہو، اس پر

---

[1] انساب الاشراف بلاذری ص ۱۶، ۱۷ مطبوعہ قدس.

انھوں نے ایک بکری پیش کردی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھن پر ہاتھ پھیر دیا اس میں دودھ اتر آیا، پھر حضرت ابوبکر رض ایک گہری چٹان پر لے گئے اور اس کو دوہا اور دونوں نے پیاس بجھائی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھن کو فرمایا "خشک ہو جا" چنانچہ وہ اپنی حالت پر آگیا اس وقت سے ابن مسعود رض اسلام کی حلقہ بگوشی میں آگئے۔ اور حضور کی صحبت اختیار کرلی۔ عبداللہ بن مسعود رض صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے راوی اور سب سے زیادہ مکہ میں قرآن کا مظاہرہ کرنے والے صحابی ہیں، انھوں نے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مہاجرین میں سے زبیر بن العوام کا اور انصار میں سے معاذ بن جبل کا بھائی چارہ کیا۔ عبداللہ بن مسعود رض بدر، اُحد اور تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے، آپ ہی نے ابوجہل کا سر، جب وہ معرکۂ بدر میں گر پڑا تھا، کاٹا۔ یہ سفر و حضر میں مسلسل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ یہ اہل بیت کے ایک فرد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ بلا اجازت حاضری دیتے تھے، حضور کے نکلنے کے موقع پر آپ کو جوتا پہنانا، پھر عصا لے کر آگے آگے چلنا ان کی خدمت تھی۔ جب آپ اپنی جگہ پر پہنچ جاتے تو یہ نعلین اپنی آستینوں میں لے لیتے، عصا دے دیتے اور خدمت میں کھڑے ہو جاتے، سفر میں آپ کا بستر کرنے اور وضو کرانے کی خدمت بھی انھیں کے سپرد ہوتی۔ حضور ان سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ اور دوسروں کو ان کی محبت کرنے کی ہدایت بھی فرماتے تھے۔ ایک دن صحابہ رض نے ان کو درخت پر چڑھتے دیکھا۔ پنڈلیوں کی لاغری دیکھ کر سب ہنس پڑے آپ نے فرمایا یہ دُبلی پنڈلیاں قیامت کے دن میزان میں اُحد پہاڑ سے بھاری ہوں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسلمانوں کا رُخ فتوحات کی طرف پھر گیا تو یہ بھی شام کی طرف جہاد کرتے ہوئے نکلے۔ حمص میں قیام کیا، وہاں سے حضرت عمر رض نے کوفہ بھیج دیا اور کوفہ والوں کو لکھا "کہ ان سے تعلیم حاصل کرو، ان کو تمھارے لیے اپنی ضرورت چھوڑ کر بھیج رہا ہوں"

عبداللہ بن مسعود رض حضرت عمر رض کی شہادت اور حضرت عثمان رض کی بیعت کے موقع پر حاضر تھے بعد میں بڑی تیزی کے ساتھ کوفہ پہنچے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی، ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، باقی رہنے والوں میں سے ہم نے بہترین آدمی کو پسند کیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو حضرت عثمان رض کی بیعت پر آمادہ کیا۔

کوفہ کے بیت المال پر عبداللہ بن مسعود رض کا تقرر اس وقت ہوا جب سعد ابن ابی وقاص وہاں کے گورنر تھے۔ جب وہ معزول ہوئے تو ولید کے ابتدائی زمانے تک یہ بھی اپنے عہدے پر باقی نہ رہے

ہوا یہ کہ ولید نے بیت المال سے کچھ رقم قرض لی، جب قرض کی مدت پوری ہوگئی تو ابن مسعودؓ نے رقم طلب کی، ولید نے ٹال مٹول کیا، ابن مسعودؓ نے اصرار کیا، ولید نے حضرت عثمانؓ کو خط لکھا اور اس میں ابن مسعودؓ کی سختی کی شکایت کی، تب حضرت عثمانؓ نے ابن مسعودؓ کو لکھا کہ تم ہمارے خازن ہو۔ ولید نے بیت المال سے جو قرض لیا ہے اس سے تم تعرض نہ کرو۔ ابن مسعودؓ اس بات سے ناراض ہوئے اور بیت المال کی کنجیاں پیش کر کے گھر بیٹھ رہے اور لوگوں کو وعظ ونصیحت اور تعلیم دینا شروع کیا، اس وقت سے سیاسی اور مالی معاملات میں عبداللہ ابن مسعودؓ کی طرف سے حضرت عثمانؓ کی مخالفت شروع ہوئی، اس کے بعد اس مخالفت میں اور زیادہ پیچیدگی اس وقت پیدا ہوگئی، جب حضرت عثمانؓ نے مصحف ایک کر دیا اور اس کی کتابت زید بن ثابتؓ کی سرکردگی میں چند افراد کے سپرد کر دی اور بقیہ تمام نسخوں کو جلا دینے کا اقدام کیا جس کو ابن مسعودؓ نے اور بہت سے مسلمانوں نے ناپسند کیا اور جس سے ابن مسعودؓ کی مخالفت میں اور تیزی پیدا ہوگئی، ابن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ کہا کرتے تھے، وہ اپنے بیان کے دوران میں فرماتے "سب سے سچی بات کتاب اللہ کی ہے، بہترین سیرت سیرتِ محمدیؐ ہے، بدترین کام نئی باتیں ہیں، ہر نئی بات بدعت اور ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی آگ میں جائیگی" ولید نے اس کا تذکرہ اپنے خط میں حضرت عثمانؓ سے کیا اور کہا یہ آپ پر چوٹ ہے۔ تب حضرت عثمانؓ نے ولید کو لکھا کہ وہ ان کو مدینہ بھیج دے، چنانچہ وہ بھیجے گئے، روانگی کے وقت کوفہ والوں نے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کیا، ابن مسعودؓ مدینہ پہنچ کر مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت عثمانؓ منبر نبوی پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے، ابن مسعودؓ کو آتے دیکھ کر کہا، لو وہ برائی کا کیڑا آگیا جو اپنے کھانے پر چلتا ہوا قے کرتا ہے اور براز، یہ سن کر ابن مسعودؓ نے کہا میں ایسا نہیں ہوں۔ میں بیعت رضوان میں اور معرکۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی ہوں، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آواز سے کہا، عثمانؓ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کو آپ یہ کہتے ہیں، حضرت عثمانؓ نے ابن مسعودؓ کو سختی کے ساتھ مسجد سے نکلوا دیا، پھر وہ زمین پر پٹک دیئے گئے جس سے ان کی پسلی ٹوٹ گئی، حضرت علیؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت عثمانؓ پر اعتراض کیا کہ یہ سب کچھ آپ ولید کے کہنے سے کر رہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا ولید کے کہنے پر میں نے ایسا نہیں کیا، میں نے زبید بن کثیر کو خط بھیجا تھا، اس نے سُنا کہ عبداللہ بن مسعودؓ میرا خون حلال قرار دیتے ہیں، حضرت علیؓ نے کہا زبید ایک بے اعتبار آدمی ہے اس کے بعد حضرت علیؓ اٹھے اور ابن مسعودؓ کو ان کے گھر پہنچا دینے کا حکم دیا۔

حضرت عثمانؓ یہیں تک آکر نہیں رک گئے، انھوں نے ابن مسعودؓ کا وظیفہ بند کر دیا اور مدینہ سے

ان کو باہر نکلنے کی ممانعت کر دی، ابن مسعودؓ چاہتے تھے کہ ان کو جہاد میں شرکت کے لیے شام جانے کی اجازت مل جائے لیکن حضرت عثمان رضؓ نے انکار کر دیا، مروان نے ان سے کہا تھا کہ کوفہ کو تو انھوں نے اپنا مخالف بنا دیا، اب شام کو تو بچا رہنے دیجئے۔

اس طرح کوفہ سے ابن مسعودؓ حضرت عثمان رضؓ کے مخالف بن کر نکلے اور دو یا تین سال تک مدینے میں مخالفت کا اعلان کرتے رہے۔ اس کے بعد ان کی وفات کے دن قریب آ گئے، راویوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عثمان رضؓ ان کی عیادت کے لیے گئے لیکن اس کے بعد کے بیانات میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ نے معذرت کی اور دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو کر ہی اس مجلس سے جدا ہوئے اور جب ابن مسعودؓ کا انتقال ہوا تو حضرت عثمان رضؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بعض کہتے ہیں کہ عیادت کے موقع پر ابن مسعودؓ حضرت عثمان رضؓ سے خوش ہو کر نہیں ملے، دونوں کا مکالمہ سنیے:-

حضرت عثمان رضؓ	آپ کو کیا شکایت ہے؟
عبداللہ بن مسعودؓ	اپنے گناہوں کی۔
حضرت عثمان رضؓ	آپ کیا چاہتے ہیں؟
عبداللہ بن مسعودؓ	اللہ کی رحمت۔
حضرت عثمان رضؓ	کیا آپ کے لیے طبیب بلواؤں؟
عبداللہ بن مسعودؓ	طبیب ہی نے تو بیمار کیا ہے۔
حضرت عثمان رضؓ	کیا آپ کا وظیفہ جاری کردوں؟
عبداللہ بن مسعودؓ	ضرورت تھی تو آپ نے بند کر دیا۔ اب ضرورت نہیں تو جاری کرنا چاہتے ہیں۔
حضرت عثمان رضؓ	تمھارے اہل و عیال کے کام آئے گا۔
عبداللہ بن مسعودؓ	خدا ان کا رزاق ہے۔
حضرت عثمان رضؓ	میرے لیے مغفرت کی دعا کیجیے۔
عبداللہ بن مسعودؓ	خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میرے معاملہ میں آپ سے مواخذہ کرے۔

کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ باہر نکلے تو عبداللہ بن مسعودؓ نے وصیت کی کہ حضرت عثمان رضؓ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں، جب ان کا انتقال ہوا تو کسی نے ان کو خبر نہیں کی، عمار بن یاسرؓ نے نماز جنازہ

پڑھائی اور دفن کر دیئے گئے، دوسرے دن حضرت عثمان رض گذرے تو ایک نئی قبر دیکھ کر لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ابن مسعود رض کی قبر ہے۔ حضرت عثمان رض خفا ہوئے اور فرمایا کہ مجھے مطلع نہیں کیا گیا۔ حضرت عمار رض نے کہا انھوں نے وصیت کی تھی کہ آپ کو نماز جنازہ نہ پڑھانے دی جائے۔ حضرت عثمان رض نے بات دل میں رکھی۔ حضرت عمار رض کے خلاف حضرت عثمان رض کے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

بالکل کھلی بات ہے کہ یہ بیان حقیقت سے دور ہے۔ عبداللہ بن مسعود رض کی سیرت کا تقاضا یہ ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان رض کو معاف کر دیا، ان کے لیے مغفرت بھی چاہی، صحابہ رض میں جو لوگ ان سے بہت مانوس تھے، کہا کرتے تھے کہ عبداللہ بن مسعود رض اپنے طور طریقوں میں، سیرت اور اخلاق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ پھر وہ سب سے زیادہ قرآن کے قاری اور عامل بھی تھے، یقیناً انھوں نے ارشاد خداوندی ولمن صبر وغفر ان ذلك لمن عزم الامور پڑھا ہوگا، اور وہ اس بات کے سب سے زیادہ اہل ہیں کہ صبر کریں، معاف کردیں اور مستقیم رہیں۔

ابوذر غفاری رض

ابوذر غفاری رض کنانہ کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ عہد جاہلیت میں وہ لوگوں سے دور الگ تھلگ رہا کرتے تھے، گویا طبعاً فقر پسند تھے، ایک دن وہ مکہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پاکر آپ سے قریب ہوئے اور آپ کی باتیں سنیں اور اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ اس کے بعد انکو مکہ میں قیام کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ البتہ ہجرت کے کے مدینہ پہنچے اور آپ کی خدمت میں رہنے لگے ان کا شمار بھی اسلام کے سابقین میں اور ان لوگوں میں ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رکھتے تھے، اور جن کی تعریف کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ابوذر رض سے سچا کوئی نہیں، اور فرماتے تھے کہ ابوذر رض تنہا ایک قوم بنا کر اٹھائے جائیں گے۔ حضرت ابوذر رض روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جب آبادی سلع (پہاڑ) تک پہنچ جائے تو مدینہ چھوڑ دینا۔ چنانچہ وہ صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض اور عثمان رض کے ابتدائی دور تک مدینہ منورہ میں رہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ عمارتیں سلع تک بن چکی ہیں تو حضرت عثمان رض سے

درخواست کی کہ ان کو جہاد کے سلسلے میں شام جانے کی اجازت دی جائے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رض کے زمانے میں شام چلے گئے تھے اور وہاں دفتر میں قیام کیا تھا، پھر حج کے لیے آتے اور مدینہ میں قیام کرتے اور حضرت عثمان رض سے اجازت لے کر روضۂ اقدس کے پاس کچھ وقت گذارتے، ایک دن انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رض مروان بن الحکم کو بہت سا مال دے رہے ہیں اور ان کے بھائی حارث ابن الحکم کو تین لاکھ درہم عنایت کر رہے ہیں اور اسی طرح زید بن ثابت رض انصاری کو ایک لاکھ کا عطیہ دے رہے ہیں، یہ ان کو بہت ناگوار اور زیادہ معلوم ہوا۔ فرمانے لگے، دولت جمع کرنے والوں کو آگ کی خوشخبری سنادو، اس کے بعد تلاوت فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں - اور
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔	عذاب کی بشارت دے دو۔

مروان بن الحکم نے حضرت عثمان رض سے ابوذر رض کی اس بات کی شکایت کی، حضرت عثمان رض نے اپنے ایک غلام کو بھیج کر ابوذر رض کو منع کیا۔ ابوذر رض نے کہا کیا عثمان رض مجھ کو اللہ کی کتاب پڑھنے اور اللہ کے حکم سے سرتابی کرنے والوں پر اعتراض کرنے سے روکیں گے؟ عثمان رض کو ناراض کرکے اللہ کو خوش رکھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ اس بات سے کہ میں عثمان رض کو خوش کرنے کے لیے اللہ کو ناراض کردوں، حضرت عثمان رض نے برداشت سے کام لیا اور صبر کیا۔

لیکن ابوذر رض اپنی تنقید اور اعتراض پر مصر رہے اور قناعت اور اعتدال کی دعوت اور دولت سے نفرت کی تحریک کرتے رہے۔ ایک دن وہ حضرت عثمان رض کے پاس بیٹھے تھے۔ کعبؓ بن احبار بھی حاضر تھے بعض راویوں کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رض نے سوال کیا کہ کیا خلیفہ کے لیے حلال ہے کہ وہ بیت المال سے کچھ قرض لے اور جب میسر ہو تو واپس کردے، کعبؓ نے کہا میرے نزدیک تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ابوذر رض اس پر خفا ہوئے اور کہا یہودی کے بچے! ہم کو ہمارا دین سکھاتا ہے؟ حضرت عثمان رض ابوذر رض پر خفا ہوئے اور حکم دیا کہ وہ شام چلے جائیں۔ دوسرے راویوں کا بیان ہے کہ ابوذر رض حضرت عثمانؓ سے کہہ رہے تھے کہ صرف زکوٰۃ دے دینا کافی نہیں بلکہ بھوکے کو کھانا کھلانا، سائل کی ضرورت پوری کرنا اور پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کرنا بھی ضروری ہے۔ اس پر کعبؓ نے کہا جس نے زکوٰۃ ادا کردی پس اس کے لیے کافی ہوگیا، اس پر ابوذر رض غصہ ہوگئے اور کعبؓ کو اپنی زبان اور ہاتھ سے تکلیف پہنچائی اور حضرت عثمان رض نے ان کو حکم دیا کہ وہ ان کے دفتر شام میں چلے جائیں۔

بہر حال ابوذر رض شام گئے، لیکن وہاں زیادہ دیر قیام نہ کر سکے۔ وہاں بھی وہ سب کچھ کہنے لگے جو مدینہ میں کہا کرتے تھے۔ امیر معاویہ رض کی بہت سی باتوں پر ان کو اعتراض تھا۔ اس پر بھی اعتراض تھا کہ مسلمانوں کے مال کو وہ اللہ کا مال کہتے ہیں۔ وہ "خضرا" کی تعمیر پر بھی معترض تھے اور امیر معاویہ رض کو خطاب کر کے کہا۔ اگر تم نے یہ تعمیر مسلمانوں کے پیسے سے کی تو یہ ایک خیانت ہے اور اگر اپنی رقم خرچ کی ہے، تو یہ اسراف ہے"۔

حضرت ابوذر رض یہ بھی کہا کرتے تھے کہ دولت مند، محتاجوں اور مفلسوں کی طرف سے تباہیوں کے مستحق ہیں، لوگ ان کے پاس جمع ہونے لگے، ان کی باتیں سننے لگے اور ان کو ماننے بھی لگے امیر معاویہ رض کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شامیوں میں ان کی تحریک زور نہ پکڑ لے، انھوں نے حضرت عثمان رض کو شکایت کا خط لکھا۔ جواب ملا کہ ٹڈی کو سخت سواری اور پیچیدہ راہ سے میرے پاس بھیج دو۔ امیر معاویہ رض نے بے اعتنائی کے ساتھ ان کو مدینہ واپس کر دیا، مدینہ پہنچے تو بدستور اپنی بات پیش کرتے رہے۔ اور کہتے رہے کہ دولت مندوں کو آگ سے داغے جانے کی بشارت دے دو، ان کی پیشانیاں، ان کی پشت اور ان کی پسلیاں آگ سے داغی جائیں گی، انھوں نے حضرت عثمان رض پر بھی اعتراضات شروع کر دیئے، اس لیے کہ حضرت عثمان رض نے مسلمانوں کے مال میں اپنا ہاتھ آزاد کر رکھا تھا نوجوانوں کو حکومت دے دی تھی۔ اور فتح مکہ کے امن یافتوں کو عہدے دیئے تھے۔ حضرت عثمان رض کو اس سے بڑی کوفت ہوئی۔

یہاں پہنچ کر راویوں میں اختلاف ہوتا ہے بعض کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رض نے ان کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور کہا کہ کوفہ، بصرہ اور شام کو چھوڑ کر جہاں جی چاہے چلے جاؤ، اس پر حضرت ابوذر رض نے ربذہ جانا پسند کیا۔ حضرت عثمان رض نے اجازت دے دی اور وہ مذکورہ مقام پر چلے گئے اور وہیں انتقال کیا، بعضوں کا خیال یہ ہے کہ ربذہ جانا خود ابوذر رض نے پسند نہیں کیا بلکہ حضرت عثمان رض نے ان کو جلا وطن کر دیا اور وہ غریب الوطنی کی زندگی گذار رہے تھے، تا آنکہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ حد یہ ہے کہ ان کی بیوی تجہیز و تکفین سے عاجز تھیں۔ اور کچھ لوگ جو عراق سے حج یا عمرہ کی غرض سے آئے تھے انھوں نے حضرت ابوذر رض کی تجہیز و تکفین کی، اور جب حضرت عثمان رض کو ان کی موت کی اطلاع ہوئی تو ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ان کی بیوی کو اپنے متعلقین کے ساتھ کر دیا۔

حضرت عمار بن یاسر رض چونکہ حضرت ابوذر رض سے بڑی ہمدردی اور ان کے حال پر بڑی شفقت

فرماتے تھے۔ اس لیے حضرت عثمان رض نے محسوس کیا کہ وہ بھی ابوذر رض کی جلاوطنی پر معترض ہیں، غصہ ہو کر ان کو ربذہ چلے جانے کا حکم دے دیا اور جب حضرت عمار رض نے نکلنے کی تیاری کی تو بنی مخزوم جو آپ کے حلیف تھے مشتعل ہو گئے اور حضرت علی رض بھی ناراض ہوئے اور حضرت ابوذر رض کی جلاوطنی پر حضرت عثمان رض کو ملامت کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ وہ حضرت عمار رض کو شہر بدر نہ کریں۔ اس کے بعد دونوں میں بحث و تکرار ہونے لگی، حضرت عثمان رض نے حضرت علی رض کو کہا کہ آپ بھی عمار رض سے کچھ کم نہیں ہیں، آپ بھی جلاوطنی ہی کے قابل ہیں۔ حضرت علی رض نے مقابلے کا جواب دیتے ہوئے کہا، ارادہ ہو تو کر کے دیکھیے اس کے بعد مہاجرین کھڑے ہو گئے اور حضرت عثمان رض پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا جس پر بھی آپ خفا ہوتے ہیں اس کو جلاوطن کر دیتے ہیں، یہ آپ کے لیے مناسب نہیں، پھر حضرت عثمان رض، عمار رض اور علی رض سے باز رہے۔

آپ نے دیکھا، حضرت ابوذر رض سب سے پہلے نظام اجتماعی سے اپنے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں، ان کو یہ ناپسند تھا کہ دولت مند اتنا سرمایہ دار ہو کہ وہ چاندی سونا جمع کرے اور محتاج اتنا تنگدست کہ خرچ کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہو، یہ بھی ان کو ناگوار تھا کہ خلیفہ دولت مندوں کو ناحق مسلمانوں کا مال دیا کرے جس کی وجہ سے محتاج کا فقر اور غنی کی دولت بڑھتی رہے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ رفاہ عام کو چھوڑ کر دولت کے لیے ایسے لوگ پسند کیے جائیں جن کو اس کی ضرورت نہ ہو، مزید برآں حضرت ابوذر رض خلیفہ کو اس بات کا مجاز نہیں خیال کرتے تھے۔ کہ وہ تنقید کو روکے یا اختلاف پر سزا دے۔ ان کی رائے میں اقتدار کو خفا کر کے خدا کو راضی رکھنا زیادہ اچھا ہے اس بات سے کہ خدا کو ناراض کر کے اقتدار کو خوش رکھا جائے، حضرت ابوذر رض کی مخالفت سیاسی بن کر اور پیچیدہ ہو گئی، چنانچہ انھوں نے اس تنقید ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ خلیفہ اور اس کے حاکم مسلمانوں کا مال غلط راہ میں خرچ کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے حضرت عثمان رض کی سیاست، ان کی تقرری اور معزولی پر بھی اعتراض کیا ہے، نوجوان اور فتح مکہ کے پناہ گزینوں کو حاکم بنا دینے کو برا کہا، لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود ان کی حد بغاوت یا سرتابی کی حد نہ تھی، اگر خلیفہ ان کو سزا دینا چاہتا تو وہ اس کی سرتابی کرنے والے نہ تھے، پس ان کی مخالفت کا پہلو سلبی پہلو تھا۔ یعنی تلخ تنقید اور سخت نصیحت، یہی وجہ ہے کہ جب ان کو شام چلے جانے کا حکم ملا تو وہ چلے گئے اور جب ربذہ جانے کا حکم ہوا تو سر تسلیم خم کر لیا اور کہا مجھے تو اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، خواہ میرا حاکم نکٹا غلام کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں نے حضرت ابوذر رض سے مخالفت کے اثباتی پہلو کا تقاضا کیا اور چاہا کہ رہنمائی کریں، ان کو انھوں نے جواب دیا۔

"اگر عثمان رض مجھے کھجور کے درخت کی سب سے لمبی شاخ پر سولی دے دیں گے، تو میں سرتابی نہیں کروں گا؟"
اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابوذر رض مقابلے کی امکانی طاقت کے ساتھ اختلاف کرنا، اگر اطاعت کے حدود میں ہو اور خلیفہ کی بغاوت نہ ہوتی ہو تو اپنا حق سمجھتے تھے۔

عمّار بن یاسر رض

عمار بن یاسر رض مکہ کے کمزوروں میں سے تھے، ان کے باپ یمنی ہیں، بنی مخزوم کے حلیف تھے ان کی والدہ سمیہ رض بنی مخزوم کی لونڈیوں میں ایک کنیز تھیں۔ عمار رض اور صہیب رض ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اس وقت تیس سے زیادہ آدمی مسلمان ہوچکے تھے، دونوں نے اسلام قبول کیا اس کے بعد عمار رض کے ماں باپ بھی مسلمان ہوگئے۔ اب تو قریش ان سب کو ستانے اور اذیت پہنچانے کے لیے بھڑک اٹھے۔ حضرت عمار رض کو مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیا جاتا۔ انگاروں سے داغا جاتا، طرح طرح کا عذاب دیا جاتا۔ گلو خلاصی کے لیے اپنے معبودوں کی تعریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی پر مجبور کیا جاتا۔ حضرت عمار رض نے جب صورت حال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا اگر وہ پھر ایسا کریں تو تم مان لو۔ حضرت عمار رض کے متعلق ایک سے زیادہ آیتیں قرآن میں نازل ہوئیں، اللہ کے رسول ان کے اور ان کے والدین کے حال سے بہت زیادہ متاثر ہوتے اور ان پر ترس کھاتے، جب کبھی آپ کا گذر ہوتا اور انھیں گرفتار عذاب دیکھتے تو ازراہ شفقت ان کے لیے مغفرت چاہتے اور جنت کی بشارت دیتے، ایک دن تو فرمایا اے خدا! آلِ یاسر رض کو بخش دے، اور تو نے بخش دیا۔ حضرت عمار رض نے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کی، سب سے پہلے انھوں نے مکہ میں نماز کے لیے اپنا گھر مسجد بنایا۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا، سب لوگ ایک ایک اینٹ لاتے تھے، یہ دو دو اینٹیں اٹھاتے، دوران عمل میں گنگناتے۔ نحن المسلمون۔ نبتنی المساجد۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نغمے کا جواب دیتے اور لفظ "مساجد" دُہراتے، اسی طرح خندق کھودنے میں حضرت عمار رض نے نمایاں حصہ لیا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا غبار صاف کیا۔ یہ بدر کے معرکے میں، اُحد کے معرکے میں اور تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ شریک رہے، یمامہ کے دن تو بڑا خوفناک مقابلہ کیا، اس دن مسلمانوں نے ان کو دیکھا کہ ایک چٹان پر چڑھ کر مسلمانوں کو للکار رہے ہیں کہ کیا تم جنت سے گریز کر رہے ہو۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور ان کے ساتھ بیت المال پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اور سواد پر حذیفہ الیمانؓ کا تقرر کیا تو ان کے لیے روزانہ ایک بکری کا راشن مقرر ہوا۔ نصف ان کے لیے اور نصف دونوں ساتھیوں کے لیے، حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا تو ان سے دریافت کیا کہ میری معزولی تم کو ناگوار تو نہیں ہوئی آپ نے جواب دیا کہ جب آپ یہ کہہ رہے ہیں تو عرض ہے کہ اس وقت بھی میں خوش نہ تھا جب آپ نے میرا تقرر کیا تھا اور آج بھی خوش نہیں جب آپ نے معزول کر دیا ہے۔

حضرت عمارؓ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح حضرت عثمان رضؓ کی بیعت کی تھی، لیکن بعد کے واقعات نے ان کو حضرت عثمان رضؓ کا شدید مخالف بنا دیا۔ ایک دن لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ حضرت عثمانؓ نے بیت المال کے جواہرات میں سے کچھ لے لیا ہے اور اپنے گھر کے لیے کسی کا زیور بنا لیا ہے لوگ اس بات سے ناراض ہوئے اور حضرت عثمان رضؓ پر اعتراضات کیے۔ حضرت عثمان رضؓ غصے میں آئے اور خطبہ دیتے ہوئے کہا "ہم اس خراج کے مال میں سے اپنی ضرورت کے مطابق ضرور لیں گے، کچھ لوگ ناراض ہوتے ہوں تو ہوں"۔ اس پر حضرت علی رضؓ نے کہا "آپ کو اس سے روکا جائے گا"۔ عمار بن یاسرؓ نے کہا "میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ سب سے پہلا ناراض میں ہوں" حضرت عثمان رضؓ نے کہا، لونڈی کے بچے! مجھ پر تیری یہ جرأت پکڑو اس کو، چنانچہ وہ پکڑے گئے۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ان کو اس قدر مارا کہ بیہوش ہو گئے[1] اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر اٹھا کر لائے گئے جہاں وہ پورے دن بیہوش رہے۔ اسی میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں بھی جاتی رہیں۔ پھر جب ہوش آیا تو وضو کیا اور نماز پڑھ کر فرمایا "اے خدا تیرا شکر! تیرے بارے میں اذیت پانے کا یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے، کہا جاتا ہے کہ ام سلمہؓ اور عائشہ رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال، کپڑا اور جوتا نکالا اور فرمایا، یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بال، ان کا کپڑا اور جوتا ہے، ابھی یہ پرانا نہیں ہوا اور تم ان کی سنت چھوڑ رہے ہو، لوگ چلا اٹھے اور حضرت عثمان رضؓ آپے سے باہر ہو گئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں؛

ایک اور موقع پر حضرت عمارؓ نے صحابہؓ کی ایک جماعت کا ساتھ دیا جس نے حضرت عثمانؓ کے نام ایک خط لکھا تھا، خط میں حضرت عثمان رضؓ کے خلاف اعتراضات اور ان کے لیے نصیحتیں تھیں۔

---

[1] انساب الاشراف بلاذری ص ۴۸ مطبوعہ قدس۔

عمارؓ وہ خط لے کر حضرت عثمان رضؓ کے پاس آئے اور اس کا ابتدائی حصہ حضرت عثمان رضؓ پر پڑھا۔ حضرت عثمان رضؓ نے بُرا بھلا کہا اور جرابیں پہنے ہوئے پاؤں سے اس طرح مارا کہ وہ مرض فتق میں مبتلا ہوگئے اور وہ بوڑھے تھے۔

اس سے پہلے ہم ابن مسعودؓ اور ابوذرؓ کے سلسلے میں ان کی پوزیشن واضح کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ ان کو شہر بدر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور پھر باز آگئے، بہرحال حضرت عمارؓ حضرت عثمان رضؓ کے سخت معترضین اور مخالفین میں تھے۔ اس سلسلے میں وہ ایک طرف صحابہؓ میں معتدل خیال کے حضرات سے اشتراک رکھتے تھے اور دوسری طرف مدینہ آنے والے کٹر مخالفوں کا بھی ساتھ دیتے تھے۔ اور اس کے لیے مصیبتیں بھی برداشت کرتے رہے۔

یہ ہیں مدینہ میں حزب مخالف کے سربرآوردہ اور ممتاز رہنما اور یہ سب کے سب جلیل القدر صحابی رضؓ اور ممتاز مہاجر ہیں۔ انصار کی طرف سے گو اختلاف کی آواز نہیں اٹھتی تھی اس لیے کہ وہ حکومت سے دور رکھے گئے تھے لیکن وہ عوام کے شریک تھے۔ اکا دکا کہیں کہیں سے اختلاف کی آواز بھی اٹھتی تھی، جیسا کہ ہم نے عبیداللہ بن عمر رضؓ کے بارے میں زیاد بیاضی کے اشعار نقل کیے ہیں۔ انصار کی اکثریت حضرت عثمان رضؓ کی ہم نوا نہ تھی۔ ہاں چند افراد حامی تھے۔ جن میں زید بن ثابت رضؓ کعب بن مالک رضؓ حسان بن ثابت پیش پیش تھے۔ انصاری بزرگ بعض اوقات حضرت عثمان رضؓ اور ان کے مخالفین کے درمیان واسطہ بن جاتے تھے۔ مثلاً محمد بن مسلمہؓ کا مصریوں اور حضرت عثمان رضؓ کے درمیان پڑ جانا جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

انھیں دنوں مدینہ میں ایک خفیہ تحریک بھی عوام میں تھی۔ جو زبانوں پر تو تھی لیکن اس کے چلانے والوں کا پتہ نہیں۔ مثلاً جب حضرت عثمان رضؓ مسجد نبویؐ کی توسیع کر رہے تھے تو لوگ کہتے تھے کہ نبیؐ کی مسجد بڑھا رہے ہیں، لیکن ان کی سنت ترک کر رکھی ہے۔ اور مثلاً جب مدینہ میں کبوتروں کی کثرت ہوئی اور نوجوانوں نے تیر اندازی شروع کی۔ حضرت عثمان رضؓ نے کبوتروں کو ذبح کرنے کا مشورہ دیا اور ایک شخص کو مقرر کیا کہ لوگوں کو تیر اندازی سے روکے تو لوگوں نے کہا کبوتروں کو تو ذبح کیا جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکالے ہوؤں کو بلایا جا رہا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ حضرت عثمان رضؓ حکم بن العاص اور ان کے لڑکوں کو ٹھہرا رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں نے حضرت عثمان رضؓ کے عہد میں ہونے والے واقعات کی تصویر جو لوگوں کے حالات کے بالکل قریب ہے پیش کر دی ہے، ساتھ ہی مدینہ اور دوسرے شہروں میں مخالفت کی کیفیت

بھی بتادی. اب یہ آسان ہوگا کہ ہم ان واقعات تک خود پہنچیں اور ان کے متعلق قدماء کے خیالات کا پتہ چلائیں، اور پھر اپنے افکار پیش کریں۔ اور جہاں تک ہو سکے، حق اور اعتدال ہمارے پیش نظر ہو۔

فتوحات پر کوئی اعتراض نہیں

سب سے پہلی بات جس پر ہم نظر ڈالنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ قدماء میں جن لوگوں نے حضرت عثمان رضہ کے مسلک پر اعتراض کیا ہے اور اس کی خرابیاں گنائی ہیں، انھوں نے آپ کے عہد کی فتوحات پر کوئی تنقید اور نکتہ چینی نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کام کا طریقہ وہی تھا جو حضرت عمر رضہ کے عہد میں جاری تھا اور جس کی پابندی کے لیے حضرت عثمان رضہ نے خلیفہ ہونے کے بعد ہی سپہ سالاروں کو فرمان بھیجے تھے۔ ہم اس سے قبل ان فرامین کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ جو لوگ حضرت عثمان رضہ کے عہد کی فتوحات، اور اس کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں گے وہ دیکھیں گے کہ آپ کے حاکموں اور سپہ سالاروں نے خوب خوب دادِ شجاعت دی، ہمت اور حوصلے کا حق ادا کر دیا۔ بعض ایسے علاقے اور آبادیاں جو عہدِ فاروقی میں فتح ہو چکی تھیں لیکن اب وہ باغی تھیں یا آمادۂ بغاوت ہو رہی تھیں۔ حضرت عثمان رضہ کے افسروں نے ان کو زیادہ تر مقابلہ کر کے اور کہیں کہیں شوکت اور قوت کا مظاہرہ کر کے از سرِ نو تابع فرمان کیا۔

حضرت عمر رضہ کی جب وفات ہوئی تو فارس کا علاقہ سب کا سب فتح نہ ہو سکا تھا۔ خود کسریٰ یزدگرد ابھی زندہ تھا۔ جو شکست کھا کر ایک آبادی سے دوسری آبادی میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ لوگ اس کے گرد و پیش ایک جگہ جمع ہوتے اور دوسری جگہ منتشر ہو جاتے، لیکن اس گئی گذری حالت پر بھی وہ اپنے موروثی اقتدار سلطنت سے قوت ہار رہا تھا۔ جو لوگ مفتوح ہو چکے تھے اور جو ابھی مقابلہ کر رہے تھے اور جن تک ابھی یہ جنگ پہنچی نہ تھی، وہ سب کے سب اس کی اطاعت کو ضروری قرار دیتے تھے اور اس کے حق کا اعتراف کرتے تھے۔ ایسی حالت میں حضرت عثمان رضہ کے فوجی افسران سرحدوں پر جو کوفہ اور بصرہ سے متصل تھیں۔ فاتحانہ آگے بڑھتے رہے، جہاں کہیں یزدگرد کے حامی گئے انھوں نے ان کا تعاقب کیا۔ بادشاہ نے ان کی جمعیت کو منتشر کیا، ان شہروں اور صوبوں پر قبضہ کیا جن پر یزدگرد کا دعویٰ یا واقعی اقتدار تھا اور بالآخر اس کو مجبور کیا کہ وہ بے یار و مددگار بھاگتا پھرتا مقتول ہو کر اپنی موت سے جا ملے۔ اس طرح حضرت عثمان رضہ کے عہد میں کسروی حکومت کا

ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رض کے یہ حکام اور سپہ سالار بدستور فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھاتے رہے تا آنکہ ترکوں کی سرزمین تک پہنچ گئے۔ اور ان سے بھی بڑی نوک جھونک رہی، حضرت عثمان رض ہی کے زمانے میں آرمینیہ فتح ہوا، انھیں کے عہد میں اسلامی حکومت کا اقتدار مغرب تک پہنچا، چنانچہ افریقہ فتح ہوا اور اندلس پر حملے کا آغاز ہوا۔ انھیں کے دور میں امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن ابی سرح نے وہ کچھ کیا جو عہد فاروقی کا کوئی گورنر، کوئی فوجی افسر نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ روم پر بحری حملہ ہوا اور قبرص فتح کر لیا گیا اور مسلمانوں کا بحری بیڑہ آبنائے قسطنطنیہ تک پہنچا اور عبداللہ بن سعد رض کو ذات صواری میں رومی بیڑے کے مقابلے میں نہایت شاندار اور فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی۔

حضرت عثمان رض کی فوجی طاقت حضرت عمر رض ہی کے جیسی تھی۔ لیکن فتوحات کی وسعت کا، قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے الٹ دینے کا، ان کی بری اور بحری طاقتوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردینے کا جو موقع حضرت عثمان رض کو ملا، وہ حضرت عمر رض کو نہ مل سکا۔ لیکن یہی امتیاز فتنے اور اختلافات کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس لیے کہ فتوحات کے ذریعے مسلمان غنیمت اور خراج کی بہت بڑی دولت پا رہے تھے۔ غنیمت کے مالوں اور خراج کی رقموں میں حضرت عثمان رض کا اختیار فوج میں مخالفت کا جذبہ پیدا کرسکتا تھا جیسا کہ عبداللہ بن سعد رض اور مروان بن الحکم سے متعلق افریقیا کی فتوحات میں ہوا۔ اور مہاجرین اور انصار میں بھی اس سے مخالفانہ خیالات پیدا ہوسکتے تھے جیسا کہ بیت المال سے جواہرات کے تصرف میں ہوا اور حضرت عمار کی زدوکوب تک نوبت پہنچی۔ اس سلسلے میں جوبات شبہ سے خالی ہے وہ یہ کہ عہد عثمانی میں حکومت کی طاقت میں کمزوری کے لیے باہر سے کوئی راہ نہیں مل سکی۔ باہر سے تو قوت اور شوکت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

دوسری بات جو اس کے بعد ہم پیش نظر رکھنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ لوگ حضرت عثمان رض کے عہد میں ہونے والے واقعات کے بارے میں اور اس بارے میں کہ ان واقعات میں خود حضرت عثمان رض کا کتنا حصہ ہے، سخت متضاد خیالات رکھتے ہیں، کچھ لوگ تو اس طرح مطمئن ہیں کہ ان کے خیال میں ان واقعات کا اکثر حصہ جھوٹ اور بناوٹی ہے۔ بتانے والے جو کچھ پیش کر رہے ہیں اس سے بعضوں کا مقصد اسلام کے خلاف مکاری اور ریشہ دوانی ہے۔ اور بعض جماعتوں کی باہمی خصومت کا شکار ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ اکثر واقعات کا انکار کرتے ہیں، اس کو اہم یا کوئی بڑی بات تصور نہیں کرتے۔ اور خیال کرتے ہیں کہ یہ خلیفہ کے اجتہاد کی بات ہے۔ جس میں اگر وہ حق پر ہے تو دو اجر کا مستحق ہے اور اگر غلطی پر ہے

تب بھی اس کو ایک اجر ملے گا اور خلیفہ بہر حال خیر خواہ ہے۔ جس کا کام بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں۔ جن روایتوں میں حضرت عثمان رض اور صحابہ رض کے درمیان اختلاف اور کش مکش کی باتیں مذکور ہیں یہ لوگ ان تمام روایتوں کو زیادہ تر غلط اور بناوٹی سمجھتے ہیں اور جن کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، ان میں اجتہاد والی بات کہہ کر اپنا اطمینان کر لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے خیال کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اسلام کے اس عہد کو مقدس اور متبرک جانتے ہیں انھیں ہرگز یہ پسند نہیں کہ جو مقابلے کی بات دنیادار قسم کے لوگ امتیاز اور اغراض سامنے رکھ کر کرتے ہیں، وہ ان حضرات پر چسپاں کر دی جائے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہو جو اللہ کی راہ میں تن، من، دھن سب کچھ قربان کر کے اسلام کی حکومت قائم کر چکے ہوں۔ یہ حضرات تو مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، ہمیشہ بھلائی کی راہ میں دوڑتے ہیں، رائے میں ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ کبائر میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ ہاں چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہو سکتی ہیں جن کو اللہ نیک بندوں سے معاف کر دیتا ہے۔ اس گروہ میں چھوٹی سی تعداد ایسے افراد کی بھی ہے جو اپنی عقل کی کاہلی اور شعور کی کسلمندی کی وجہ سے تحقیق و تلاش کی زحمت گوارا کرنی نہیں چاہتے۔

ایک اور جماعت ہے جو دوسرے طریقے پر مطمئن ہے۔ اس کے خیال میں ایسا ممکن ہی نہیں کہ اس قسم کے فتنہ و فساد کی باتیں نبی کے صحابہ سے سرزد ہوں۔ یہ تو اسلام کے دشمنوں کی مکارانہ سازشیں ہیں۔ جن کی تہ میں عبداللہ ابن سبا قسم کے عیاروں کا ہاتھ تھے جس کے ساتھ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی ٹولی تھی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم نہ یہ راہ چل سکتے ہیں نہ وہ۔ نہ ہم کو عقلی کسلمندی کے زیر اثر عافیت کے گوشوں میں جانا ہے اور نہ انسانوں کی تقدیس میں ہمیں اتنا مبالغہ منظور ہے کہ ہم صحابہ میں کوئی ایسی بات مان لیں جو وہ خود اپنے اندر نہ پاتے ہوں۔ وہ اپنے کو بشر جانتے تھے۔ اور دوسرے انسانوں کی طرح اپنے کو غلطیوں اور گناہوں کی زد میں سمجھتے تھے۔ انھوں نے باہم شدید الزامات لگائے، ایک جماعت نے کفر و فسق تک نوبت پہنچا دی، چنانچہ روایت کی جاتی ہے کہ عمار بن یاسر رض حضرت عثمان رض کی تکفیر کرتے تھے۔ ان کو "نعثل" سادہ لوح بوڑھا یا لکڑ بگھا کہا کرتے تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ابن مسعود رض جب کوفہ میں تھے تو حضرت عثمان رض کے خون کو حلال قرار دیتے تھے۔ لوگوں میں جب تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو فرماتے کہ سب سے بُری چیز نئی باتیں ہیں۔ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت ہی سے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا آگ ہے۔ ان الفاظ میں حضرت عثمان رض اور ان کے گورنر ولید کی

طرف اشارہ ہے۔

یہ بھی روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا اگر جی چاہتا ہے تو اپنی تلوار لے آؤ، میں بھی اپنی تلوار لے لیتا ہوں، اس لیے کہ انھوں (عثمانؓ) نے مجھے جو زبان دی تھی اس سے وہ پلٹ گئے۔ اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ انھوں نے اپنے مرض موت میں اپنے بعض ساتھیوں سے کہا تھا کہ "ان (عثمانؓ) کے زیادتی کرنے سے پہلے تم ہاتھ بڑھا دو"۔

صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے حضرت عثمان رضؓ کی حمایت کی، ان کا خیال تھا کہ ان کا مقابلہ کرنے والے دین کے مخالف اور باغی ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ سب نے آپس میں قتل و قتال کو جائز سمجھا۔ اور بعض نے تو جمل اور صفین کے موقع پر عمل بھی کیا۔ البتہ سعد اور ان کے ساتھیوں کی ایک مختصر سی جماعت تھی جو کنارہ کش رہی اور جنگ و جدال میں حصہ نہیں لیا۔ حضرت سعدؓ نے اس جماعت کے نقطۂ نظر کی بہترین ترجمانی اپنے اس جملے میں کی ہے: "میں اس وقت تک نہیں لڑوں گا جب تک تم مجھ کو ایسی تلوار نہ لادو جو خود کہے کہ یہ مُؤمن ہے اور یہ کافر"۔ پس جب صحابہؓ خود ان اختلافات میں مبتلا ہو گئے، کبائر کا ارتکاب کیا، بعضوں نے قتل اور خونریزی تک کی۔ تو ہماری رائے ان کے متعلق خود ان کی رائے سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ اور ہمارے لیے مناسب نہیں کہ ہم ان لوگوں کی راہ چلیں جو فتنہ و فساد کی زیادہ تر روایات کی جو ہم تک پہنچی ہیں تکذیب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم بعثتِ نبویؐ سے لے کر اس وقت تک کی پوری اسلامی تاریخ کو جھٹلاتے ہیں کیونکہ جو لوگ ان فسادات اور فتنوں کی روایات کے راوی ہیں، ان ہی لوگوں نے فتوحات اور غزوات کی روایات بھی کی ہیں، ان ہی لوگوں نے نبیؐ اور خلفاء کی سیرت کا بھی بیان کیا ہے۔ اب یہ تو بالکل مناسب نہیں کہ انکی جو باتیں ہم کو اچھی معلوم ہوں، ان کی تصدیق کریں، اور جو ناگوار ہوں ان کی تکذیب اور یہ بھی غیر مناسب ہے کہ تاریخ کے بعض حصوں کو محض اس لیے تسلیم کریں کہ ان سے ہم کو خوشی ہوتی ہے اور بعض کا اس لیے انکار کر دیں کہ وہ ہماری تکلیف اور ناراضی کا باعث ہیں، پھر یہ بھی نامناسب ہے کہ روایات میں جو کچھ ہے سب کا سب تسلیم کر لیا جائے۔ یا سب کو جھٹلا دیا جائے۔ یہ راوی بھی تو انسانوں ہی میں سے ہیں، ان سے صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے، وہ سچ بول سکتے ہیں اور جھوٹ بھی، خود قدماء اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے اور اسی لیے انھوں نے جرح و تعدیل کے، تصدیق و تکذیب کے، ترجیح و اسقاط کے اور شک کے اصول اور قواعد وضع کیے، پس ہمارے لیے قدماء کی راہ چلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی حرج کی بات ہوگی کہ اس قدیم آئین کے پہلو بہ پہلو ہم ان جدید قواعد کا بھی

اضافہ کرلیں جو نئے لوگوں نے دریافت کیے ہیں اور جن سے کسی معاملے کی تحقیق اور چھان بین میں مدد لی جاسکتی ہے۔

اس بات میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ مسلمانوں نے حضرت عثمان رض سے اختلاف کیا۔ یہ اختلاف بغاوت تک پہنچا جس میں ان کی جان گئی اور اس بغاوت نے مسلمانوں کو اس طرح متفرق کیا کہ پھر آج تک جمع نہیں ہوسکے۔

یقیناً اس اختلاف اور بغاوت کے کچھ اسباب ہوں گے، حضرت عثمان رض نے خودکشی نہیں کی اور نہ اپنے آپ کو قاتلوں کے حوالے کردیا۔ پھر جن لوگوں نے حضرت عثمان رض سے اختلاف کرکے ان کے خلاف بغاوت کی اور ان کی جان تک لے لی۔ انھوں نے بھی یہ سب کچھ بلاسبب نہیں کیا، کچھ تو ایسی باتیں تھیں جن کو وہ غلطی سے یا صحیح طور پر برا سمجھتے تھے۔ جن کی وجہ سے اختلاف اور پھر بغاوت پیدا ہوئی اور بغاوت نے وہ سانحہ بپا کیا جس کی ان کے پاس مثال نہیں۔ یعنی خلیفہ کو جبر اور قوت سے قتل کردینا۔

پھر ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عثمان رض کی خلافت ایک سچی حقیقت تھی۔ جس میں ادنیٰ شک کی گنجائش نہیں، تمام مسلمانوں نے ان کی بیعت کی، سب نے ان کی خلافت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور اطاعت کا اعلان، خلفاء کے انتخاب کے سلسلے میں مسلمانوں کے طریقے پر کہنے والے جو چاہیں کہیں لیکن یہ انتخاب صحیح اور متفقہ تھا، حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کے انتخاب کے موقع پر سعدؓ بن عبادہ ایک مخالف تھے جن کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، لیکن حضرت عثمان رض کی بیعت میں تو ایک بھی مخالف نہ تھا۔ حضرت علی رض کی تاخیر کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ یہ بات ان کی سیرت سے میل نہیں کھاتی اور نہ ان کے اخلاق اور شیخین رض کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کو اس سے کچھ نسبت ہے۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض سے حضرت علی رض نے جو عہد و پیمان کیا تھا اور حضرت عثمان رض کے ساتھ ان کا جو برتاؤ تھا، یہ بات اس کے بھی خلاف ہے۔ حضرت طلحہ رض جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں غصہ ہوئے، گھر بیٹھ رہے۔ اور یہ بھی کہا کہ مجھ جیسے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی وہ رکے نہیں رہے۔ دوسروں کی طرح انھوں نے بھی بیعت کرلی اور خلیفہ کی اطاعت کی۔ پس حضرت عثمان رض کی خلافت شیخین رض کی خلافت کی طرح صحیح اور متفقہ تھی۔ اور جو کچھ انھوں نے حکم دیا، جو کچھ کیا اور کہا اس کی حیثیت ایک ایسے امام کے احکام اور افعال کی تھی جس کی بیعت صحیح اور جس کی اطاعت واجب تھی لیکن بیعت جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، خلیفہ اور رعایا کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے صرف

رعایا یا تنہا خلیفہ پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ حضرت عثمان رض اور مسلمانوں کے درمیان اس بات پر عہد و پیمان ہوا تھا کہ حضرت عثمان رض اللہ کی کتاب، رسولؐ کی سنت اور شیخین رض کی راہ پر چلیں گے اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور مسلمان ان کی اطاعت کریں گے اور جب تک خلیفہ راہ سے نہ ہٹ جائے وہ اطاعت اور فرماں برداری میں رہیں گے۔

تو اب اصل سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان رض نے کتاب و سنت اور شیخین رض کی سیرت کی پوری پوری پابندی کی یا کچھ اس کے خلاف کیا۔ اگر خلاف کیا تو مسلمانوں پر بیعت کی ذمہ داری نہیں رہ جاتی اور اگر پوری پوری پابندی کی تو بغاوت محاصرہ اور قتل تو الگ رہا مسلمانوں کو اس کا بھی حق نہیں کہ وہ اس کے کسی حکم کی نافرمانی کریں یا اس کی روش سے ناراض ہوں۔

تصویر کا یہی رُخ ہے جسے پیش کرنا چاہیے، اب ہمیں دیکھنا ہے کہ قدما نے اس کو مختصر اور مفصل کس طرح پیش کیا ہے۔

قدماء کا نقطۂ نظر

حضرت عثمان رض پر اعتراض اور ان سے اختلاف والے تمام واقعات پر قدما نے خالص مذہبی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی ہے اور یہی نقطۂ نگاہ حضرت عثمان رض کے تمام معاصرین کا ہے چاہے وہ آپ کے حامی ہوں یا مخالف اس لیے کہ وہ دین اور دنیا دونوں قسم کے معاملات کو اسی دینی عینک سے دیکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی بحثوں میں مسائل کے صحیح، غلط، مفید اور مضر ہونے سے کہیں زیادہ کفر و ایمان کی بات ہوتی ہے۔ پس ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے میں ہم متعلقہ واقعات کو ان ہی کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ البتہ واقعات کی نوعیت کا کچھ فرق ضرور ہمارے پیش نظر ہوگا اس لیے کہ بعض واقعات تو خالص دینی ہیں اور کسی آیت یا حدیث سے متعلق ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کا تعلق سیاسی امور سے ہے جن میں امام کو اجتہاد کا حق ہے۔ کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جن کا سماجی نظام سے تعلق ہے اور اس میدان میں بھی امام اجتہاد کا حق دار ہے یعنی غلطی کرنے پر معذور اور حق پر مبنی حالت میں فضیلت اور امتیاز کا مالک۔ سیاسی امور اور سماجی نظام میں جو چیز معیار کا درجہ رکھتی ہے وہ عدل ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی رضامندی۔

اب ہم ان واقعات میں ایسی باتوں سے بحث کا آغاز کرتے ہیں جو بالکل مذہبی ہیں۔ حضرت عثمانؓ

کے مخالف معترض ہیں کہ انھوں نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی اللہ کی ایک حد معطل کر کے قرآنی حکم کی سخت خلاف ورزی کی اور یہ اس طرح کہ عبیداللہ بن عمرؓ کو معاف کر دیا اور ان سے ہرمزان، جفینہ اور ابو لؤلؤ کی لڑکی کا بدلہ نہیں لیا۔ ہرمزان ایک ایرانی مسلمان امیر تھا۔ دوسرے دونوں ذمی تھے اور اللہ نے مسلم اور ذمی دونوں کے خون کی حفاظت کی ہے اور حدیں مقرر کی ہیں، مقتول مسلمان ہو یا ذمی، ہر حالت میں قاتل پر حد جاری ہوگی۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد خداوندی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى
بِالْأُنْثَى ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ
أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ
وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ
تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ
فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ
حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ ۝

اے ایمان والو! فرض ہوا تم پر قصاص،
مقتولوں میں، آزاد کے بدلے آزاد، غلام
کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت
پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی
طرف سے کچھ بھی تو تابعداری کرنی چاہیئے
موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہیئے اس کو
خوبی کے ساتھ۔ یہ آسانی ہوئی تمھارے رب کی
طرف سے اور مہربانی، پھر جو زیادتی کرے اس
فیصلے کے بعد تو اس کے لیے ہے عذاب
دردناک اور تمھارے واسطے قصاص میں بڑی
زندگی ہے اے عقل مندو، تاکہ تم بچو۔

اسی طرح سورۂ نساء میں ارشاد ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا
إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا
خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ
وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا
أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ
عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ
رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ

اور مسلمان کا کام نہیں ہے کہ قتل کرے
مسلمان کو مگر غلطی سے اور جو قتل کرے مسلمان
کو غلطی سے تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی
اور خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو
مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں پھر اگر مقتول تھا
ایسی قوم میں سے کہ وہ تمھارے دشمن ہیں اور
خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن ایک
مسلمان کی اور اگر تھا وہ ایسی قوم میں سے کہ

فدية مسلمة الى اهله و تحرير رقبة مؤمنة ، فمن لم يجد فصيام شهرين متتابعين توبة من الله ، وكان الله عليما حكيما ۝ ومن يقتل مؤمنا متعمدا فجزآؤه جهنم خالدا فيها وغضب الله عليه ولعنه واعد له عذابا عظيما ۝

تم میں اور اس میں عہد ہے تو خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی۔ پھر جس کو میسر نہ ہو، وہ روزے رکھے دو مہینے کے برابر، گناہ بخشوانے کو اللہ سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اس میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی۔ اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب۔

* * * *

پھر سورۂ مائدہ میں ہے:۔

من اجل ذلك كتبنا على بني اسرآءيل انه من قتل نفسا بغير نفس او فساد في الارض فكانما قتل الناس جميعا ، ومن احياها فكانما احيا الناس جميعا ، ولقد جآءتهم رسلنا بالبينت ، ثم ان كثيرا منهم بعد ذلك في الارض لمسرفون۔

اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو، اور لا چکے ہیں ان کے پاس رسول ہمارے کھلے ہوئے حکم، پھر بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی ملک میں دست درازی کرتے ہیں۔

سورۂ اسرٰی میں ہے:۔

ولا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق ، ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لوليه سلطانا فلا يسرف في القتل

اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر، اور جو مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو زور۔ اور حد سے نہ نکل جائے قتل کرنے میں، اس کو

اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۔ مدد ملتی ہے۔

اللہ نے ان تمام آیات میں حدیں بیان کی ہیں، کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ ان سے آگے بڑھ جائے، ان میں سے بعض آیتیں قتل عمد کے بارے میں ہیں اور بعض غلطی سے قتل کے متعلق، اس میں کچھ شک نہیں کہ عبیداللہ نے ہرمزان اور اس کے ایک یا دو ساتھیوں کو غلطی سے قتل نہیں کیا بلکہ عمداً کیا، خاص ارادے سے کیا۔ اور اگر ان سے تلوار نہ لے لی جاتی تو شاید وہ اوروں کو بھی قتل کر دیتے۔ حضرت عثمان رض کے مخالفین نے ان سے کہا، نصِ قرآنی کے ماتحت قتل کی حد جاری کرنا واجب ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا، کل ان کے باپ مارے گئے آج میں ان کو قتل کر دوں؛ کہا جاتا ہے کہ خود مہاجرین نے حضرت عثمانؓ سے یہی کہا۔ بہرحال اہم بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رض نے عبیداللہ کو معاف کر دیا اور معترضین کو جس میں حضرت علی رض بھی شامل ہیں، یہ جواب دیا کہ ہرمزان اور اس کے ساتھیوں کا کوئی ولی نہیں، اس لیے میں ان کا ولی ہوں، جس کا کوئی ولی نہیں خلیفہ اس کا ولی ہوتا ہے اور اللہ نے ولی کو معافی کا مجاز بنایا ہے اور اس معافی پر ثواب بھی دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان رض نے اللہ کی اجازت سے معافی دی ہے اور یہ کہ انھوں نے بڑی مصلحت اور تدبر سے کام لیا۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی رض اور بہت سے مسلمان حضرت عثمان رض کو اس معافی کا حقدار قرار نہیں دیتے۔

بعد میں متکلمین نے اس بحث میں حصہ لیا۔ اہل سنت اور معتزلہ اس مسئلے میں حضرت عثمانؓ کے ہم نوا ہیں اور کہتے ہیں کہ اس معافی میں حضرت عثمان رض پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ مقتولوں کے ولی تھے اور ولی کو معاف کر دینے کا حق ہے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ معاف کر دینے میں ایک بڑی مصلحت بھی کارفرما ہو اور یہاں تو داخلی اور خارجی دونوں مصلحتیں، داخلی یعنی قریش اور مہاجرین کا لحاظ، جو کہتے تھے کہ کل تو ان کے باپ مارے گئے اور آج ان کو قتل کیا جارہا ہے، خارجی مصلحت بقول اہل سنت اور بقول معتزلہ، اگر حضرت عثمان رض عبیداللہ رض کو قتل کر دیتے تو مسلمانوں کے دشمن ان پر ہنستے اور کہتے، پہلے اپنے خلیفہ کو مارا، بعد میں اس کے بیٹے کو بھی قتل کر دیا۔ اس معاملے میں شیعہ حضرت علی رض اور ان کے ساتھیوں کے ہم نوا ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک ایسے مسئلے میں جس کو قرآن اپنی نص صریح میں واضح کر چکا ہو۔ حضرت عثمان رض کا اجتہاد کرنا مناسب نہ تھا اور دشمنوں کی ہنسی کا لحاظ بھی غیر مناسب ہے۔ اس لیے کہ وہ تو اس بات پر بھی بغلیں بجا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلیفہ نے اسلامی حدود میں سے ایک حد کو معطل کر دیا۔ حضرت علی رض کے ہم نوا یہ بھی کہتے ہیں کہ خود حضرت عمر رض نے وصیت

کردی تھی کہ اگر ان کے لڑکے پر ناحق قتل کا الزام ثابت ہو جائے تو اس پر قتل کی حد ضرور جاری کی جائے۔ پس جب خلیفہ نے ایک قطعی فیصلہ دے دیا تو حضرت عثمان رض کو اس کا توڑ دینا کسی طرح مناسب نہ تھا۔

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا نے اگر قرآن میں قاتل پر حد جاری کرنے کی تفصیل کی ہے تو اس نے معاف کر دینے کی رغبت اور دعوت بھی قرآن ہی میں دی ہے، پس معاف کر کے حضرت عثمان رض نے قرآن کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ پابندی کی ہے اور اللہ کی مرضی اور دعوت کے مطابق عمل کیا ہے، پھر یہ کہنا بھی بجا نہیں کہ حضرت عثمان رض نے فاروق اعظم رض کے فیصلے کو توڑ دیا اس لیے کہ حضرت عمر رض نے اگر یہ روایت صحیح ہے وصیت کی تھی کہ قتل ثابت ہو جائے تو ان کے بیٹے سے قصاص لیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے کوئی حکم نہیں دیا تھا بلکہ چاہا تھا کہ اللہ کی کتاب پر عمل ہو، اور اس معاملے میں حق و انصاف یہی ہے کہ امام قصاص کا حکم دے اور اگر معافی میں مصلحت دیکھے تو معاف کر دے، اگر حضرت عمر رض ایک قطعی فیصلہ فرما دیتے اور اس کے نفاذ سے پہلے وفات پا جاتے تب بھی بعد کے امام کا حق تھا کہ وہ معاف کر دے، اس لیے کہ معافی کا عمل توڑنا نہیں ہے بلکہ حکم کا تسلیم کرنا ہے اور اپنے اختیار کا ترک کرنا۔

پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سلسلے میں حضرت عثمان رض نے کوئی حد معطل کر دی، یا اللہ کے حکم سے سرتابی کی، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عبیداللہ کو تھوڑی بہت قید کی سزا نہ دے کر اور اپنے مال سے خون بہا ادا کر کے ایک بہت دور کی بات کی جس سے نہ عبیداللہ کی آزادی میں کوئی فرق آیا اور نہ ان پر کوئی مالی مصیبت آئی۔ بلکہ راویوں کا بیان ہے کہ عبیداللہ جب مدینہ میں قیام نہ کر سکے تو حضرت عثمان رض نے ان کو کوفہ بھجوا دیا اور ان کو ایک گھر اور زمین دی، یہ تمام باتیں اگر سچ ہیں تو یہ عفو اور حلم میں غلو کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کی بنا پر کچھ لوگ خیال کر سکتے ہیں کہ حضرت عثمان رض کے نزدیک مقتولوں کے خون کی کوئی اہمیت نہیں، اسی طرح کچھ لوگ محسوس کر سکتے ہیں کہ قریش کی خوشنودی اور مصلحت وقت کی رعایت حضرت عثمان رض نے حدود سے متجاوز ہو کر کی۔

حضرت عثمان رض کی دوسری بات جو لوگوں کو ناگوار ہوئی وہ یہ کہ انھوں نے منیٰ میں پوری نماز پڑھی حالانکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم شیخین رض اور خود حضرت عثمان رض نے برسوں قصر کیا، بلاشبہ مسلمان حیرت میں پڑ گئے۔ جب منیٰ میں حضرت عثمان رض نے قصر نہیں کیا، لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض حضرت عثمان رض کے پاس آئے اور کہا، کیا آپ نے یہاں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ دو رکعت نماز نہیں پڑھی! حضرت عثمان رض نے جواب دیا یقیناً، پھر عبدالرحمٰن رض نے پوچھا کیا حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کے ساتھ آپ نے یہاں دو رکعت نہیں پڑھی، حضرت عثمان رض نے جواب دیا یقیناً، پھر عبدالرحمٰن رض نے کہا اور کیا خود آپ نے یہاں لوگوں کو دو رکعت نہیں پڑھائی۔ حضرت عثمان رض نے جواب دیا یقیناً تب عبدالرحمٰن رض نے کہا، پھر آپ یہ نئی بات کیا کر رہے ہیں؛ حضرت عثمان رض نے کہا۔ میں نے مکہ میں اقامت کرلی ہے پھر طائف میں میری کچھ زمین ہے جہاں میں قیام کروں گا، میں نے خیال کیا کہ یمن کے دیہاتی کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ مقیم کی نماز دو رکعت ہوگئی ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رض نے جواب دیا آپ کو دیہاتیوں سے خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت اس وقت پڑھی جب اسلام پھیلا بھی نہ تھا اور اب تو اسلام کی بنیاد مضبوط ہو چکی ہے، اب رہی یہ بات کہ آپ نے مکہ میں اقامت کرلی ہے تو آپ کی بیوی مدینہ میں ہیں، اگر آپ چاہتے تو ان کو ساتھ رکھ سکتے تھے، اور ساتھ نہ لانے کا بھی آپ کو اختیار ہے، اور آپ کا یہ فرمانا کہ طائف میں آپ کی زمین ہے تو طائف کے اور آپ کے درمیان تین رات کی مسافت ہے۔ حضرت عثمان رض نے جواب میں کہا میں نے یہی مناسب جانا۔ راویوں کا بیان ہے کہ واپسی میں عبدالرحمٰن رض کی ملاقات راستے میں عبداللہ بن مسعود رض سے ہوئی۔ انھوں نے فرمایا۔ حضرت عثمان رض کو دیکھا آپ نے چار رکعتیں پڑھا دیں حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شیخین رض نے اور خود انھوں نے اس جگہ دو ہی رکعتیں پڑھی ہیں، مجھے یہ معلوم تھا، لیکن اختلاف سے بچنے کی خاطر میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چار ہی رکعتیں پڑھی ہیں، عبدالرحمٰن رض نے کہا میں بھی واقف تھا اور میں نے اپنے ساتھیوں سمیت دو ہی رکعتیں پڑھی ہیں، لیکن اب جیسا تم کہتے ہو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ صحابہ میں سے ممتاز افراد نے منیٰ میں پوری نماز پڑھنے پر حضرت عثمان رض سے اختلاف کیا اور بحث بھی کی اور جب دیکھا کہ وہ اپنی رائے بدلنے پر تیار نہیں تو تفریق کے خوف سے انھیں کا مسلک تسلیم کرلیا۔

ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس معاملے میں صحابہ رض کے اختلاف کی بنیاد ایک تو یہ ہے کہ حضرت عثمان رض کے عمل سے ایک سنت موروثہ کی مخالفت ہوتی تھی، دوسری اہم چیز مہاجرین کا یہ خیال کہ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو اپنے اور اپنے رفقاء کے لیے مقام سکونت مقرر کیا اور مکہ اور اس کے قرب وجوار کو دارالغربۃ قرار دیا۔ آپ کو ناگوار تھا کہ مکہ میں آپ یا آپکے صحابہ رض کچھ زیادہ قیام کریں تاکہ اس بات کا شبہ نہ کیا جائے کہ جو لوگ اس سرزمین سے ہجرت کرگئے وہ پھر یہاں آرہے ہیں یا آنے کی خواہش رکھتے ہیں، آپ کو یہ بات اس قدر ناپسند تھی کہ بعض مہاجر

صحابیوں کا مکہ میں انتقال کرنا بھی گوارا نہ تھا، اور خدا سے ان کے حق میں دعا کی کہ جس سرزمین کو چھوڑ کر چلے گئے وہاں موت نہ دے۔ مکہ میں سعد بن وقاص رض کے بیمار ہونے پر جس صحابی کو آپ نے مقرر کیا تھا اسکو حکم دیا تھا کہ اگر ان کی وفات ہو جائے تو مکہ میں دفن نہ کرنا، بلکہ مدینہ کے راستے میں جب حضرت عثمان رض نے منیٰ میں مقیم کی طرح چار رکعت پڑھائی تو انصار اور مہاجر سب کو اس حقیقت کا احساس ہوا اور ڈرے کہ حضرت عثمان رض نئی اور ان کے صحابہ کے خلاف کہیں مکہ کو دارالغربۃ سے نکال کر اقامت کی جگہ تو نہیں بنا دیں گے، لیکن پھر بھی انھوں نے حضرت عثمان رض کا طریقہ اختیار کیا اور نماز جیسے اہم رکن میں تفریق پیدا ہونے کے ڈر سے منیٰ میں قصر نہیں کیا۔

ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ حضرت عثمان رض نے اجتہاد سے کام لیا اور بے سمجھ دیہاتیوں کو غلط فہمی سے بچایا۔ اس اجتہاد میں وہ حق پر رہے ہوں یا خطا پر، لیکن ان کی نیت بھلائی کی تھی، اور صرف بھلائی کی، اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے مدینہ چھوڑ کر مکہ یا کسی اور جگہ جانا کسی طرح پسند نہیں کیا۔ جب فتنے کی آگ زیادہ بھڑکی تو آپ پر یہ بات پیش کی گئی کہ مکہ میں قیام فرمائیں جہاں کوئی بات مزاج کی ناگواری کے باعث نہ ہوگی۔ لیکن اللہ کے رسول کا پڑوس چھوڑنا آپ نے منظور نہیں کیا۔ حالانکہ ضرورت کا تقاضا تھا، کوئی امر حارج نہ تھا اور آپ مکہ میں خارجی امداد آنے تک پناہ لے سکتے تھے۔ اسی طرح امیر معاویہ رض کی پیش کش پر آپ شام جا سکتے تھے لیکن آپ کہیں نہیں گئے۔ پس واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے مکہ کو مقام سکونت بنانے کا ارادہ نہیں کیا اور منیٰ میں جو کچھ ہوا وہ اس سے زیادہ نہ تھا کہ آپ نے ایک نصیحت کی جسے مسلمانوں نے منظور کر لیا اور اپنی نمازیں پوری کر لیں۔ اگرچہ حضرت عثمان رض کی دلیل سے وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے۔

حضرت عثمان رض کے مخالفوں کا ایک دینی اعتراض یہ بھی ہے کہ آپ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ لی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں اور گھوڑوں سے زکوٰۃ معاف کر دی تھی اور شیخین رض کے عہد میں بھی معاف رہی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت متواتر نہیں اور رواۃ کا اس پر اتفاق نہیں۔ دوسری بات یہ کہ حضرت عثمان رض نے زکوٰۃ پر کچھ کم نہیں کیا بلکہ اضافہ کر دیا۔ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رض کے زمانے میں گھوڑوں کی بہت کمی تھی۔ اور مسلمانوں کی فوج میں گھوڑے سواروں کی ضرورت تھی۔ اس وقت مسلمان اللہ کے دشمنوں اور اللہ اپنے مخالفوں کے ڈرانے کے لیے قوت جمع کرنے اور گھوڑے باندھنے کی اپنے بس بھر تیاری کر رہے تھے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور شیخین نے اس کی زکوٰۃ

معاف کردی لیکن فتوحات کے بعد جب دنیا قدموں پر گرنے لگی، مال ودولت کی کثرت ہوئی اور مسلمانوں میں گھوڑوں کی حیثیت مال تجارت کی سی ہوگئی تو حضرت عثمان رضہ نے تمام نفع بخش مال کی طرح اس میں بھی زکوٰۃ کا حکم نافذ کردیا۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضہ نے مخصوص چراگاہیں بنائیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہوا، پانی اور چارہ تمام انسانوں کے لیے مباح کیا ہے۔ اس معاملے میں راویوں کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے صدقات کے اونٹوں اور اپنے اور بنی امیہ کے اونٹوں اور گھوڑوں کے لیے خاص چراگاہیں بنوائی تھیں۔ بعض کچھ کہتے ہیں اور خود حضرت عثمان رضہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے صرف صدقات کے اونٹوں کے لیے چراگاہیں مخصوص کی تھیں، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ صدقات کے لیے چراگاہیں بنائیں۔ حضرت عثمان رضہ نے اپنے اس عمل کی توجیہ میں کہا کہ وہ چاہتے تھے کہ حکومت اور رعایا میں چراگاہ سے متعلق کوئی جھگڑا نہ ہو۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ انھوں نے عافیت اور احتیاط کی راہ نکالی۔ اس پر بھی جب انھوں نے مسلمانوں کی کشاکش دیکھی تو اس میں تشدد سے کام نہیں لیا۔ اور خدا سے مغفرت مانگتے ہوئے درگذر کیا پس یہ کوئی گرفت کی بات نہیں۔

اب جب زکوٰۃ اور صدقات کے اونٹوں کی بات نکل آئی ہے تو ہم اس اعتراض کا تذکرہ بھی کردینا چاہتے ہیں جو حضرت عثمان رضہ کے مخالفین کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضہ نے صدقات کی رقمیں جنگ پر، اور دوسرے رفاہ عام کے کاموں پر خرچ کی ہیں، اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ صدقات کے مالوں کے مصارف مقرر ہیں، اللہ نے تفصیل کرتے ہوئے آیت نازل کی:۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ٥	خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے۔ اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے ان مصارف میں مال خیرات یعنی زکوٰۃ کو خرچ کیا جائے اور نیز قید غلامی سے غلاموں کی گردنوں کے چھڑانے میں اور مسافروں کے زاد راہ میں یہ حقوق اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ہیں اور اللہ جاننے والا اور صاحب تدبیر ہے۔

٭

٭ ٭

٭ ٭ ٭

اللہ نے ان مصارف کی جس حصر کے ساتھ تفصیل کی ہے اور فریضۃ من اللہ کا جو اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے پیش نظر امام کو حق نہیں کہ وہ صدقات کو ان مصارف کے علاوہ کہیں خرچ کرے۔

اس اعتراض کا جواب اہل سنت اور معتزلہ متکلمین نے دیا ہے کہ حضرت عثمان رضہ نے ایسا اسی وقت کیا ہے جب انھوں نے دیکھا کہ بیت المال میں گنجائش ہے اور یہ کہ جنگی ضروریات کا تقاضا ہے پس انھوں نے صدقات کی مدوں سے قرض لیا اور جنگ پر خرچ کیا اور اس پختہ ارادے سے کیا، کہ بیت المال میں وسعت ہوتے ہی یہ قرض ادا کر دیں گے اور امام کو اس کا حق ہے کہ وہ ایک مصرف سے دوسرے مصرف کے لیے قرض لے۔ قرض ادا کرنے کا پختہ ارادہ رکھنے کے بعد امام کے لیے ایسا کرنے میں نہ دین کی مخالفت ہے اور نہ کسی سنتِ موروثہ میں ردو بدل، متکلمین کے اس جواب پر ہم کہنا چاہتے ہیں کہ دینی حیثیت سے اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن ایک مصرف سے دوسرے مصرف کے لیے قرض لینا ہی قباحت ہے جو مالی تدبیر میں کسی خرابی کا پتہ دیتی ہے جو اشارہ کرتی ہے کہ جنگ پر اور مصالحِ عامہ پر بے روک ٹوک اور غیر محتاط مصارف ہو رہے ہیں، غیر مستحق لوگوں کو بخشش کے طور پر عطیات دیئے جا رہے ہیں آئندہ کسی مقام پر ہم بہت جلد اس مسئلہ پر بحث کریں گے۔

حضرت عثمان رضہ پر مخالفین کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے لوگوں کو ایک قرآن مجید پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر بھی اکتفا نہیں کیا کہ دوسرے لکھے ہوئے صفحات کا پڑھنا پڑھانا ممنوع قرار دیا جائے بلکہ بات ہی ختم کر دی اور ایک مصحف کے علاوہ جس قدر قرآنی آیات کے لکھے ہوئے صفحات تھے، سب کو جلا ڈالنے کا حکم دے دیا۔

معترضین کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

نزل القرآن علی سبعۃ احرف	قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا۔ سب کے سب
کلّھا کاف شاف۔	کافی اور شافی ہیں۔

ایسی حالت میں ایک مصحف کے سوا باقی کا پڑھنا ممنوع قرار دینا، ایک کے علاوہ سب کو جلا دینا ان نصوص کی قرأت روک دینا ہے، جنھیں اللہ نے نازل کیا ہے، ان صفحات کو جلا دینا ہے جن میں وہ قرآن لکھا تھا جو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا۔ اور امام کے لیے مناسب نہیں کہ وہ قرآن کا ایک حرف بھی بیکار کرے۔ یا ایک نص بھی جلا دے۔

لوگوں کو ایک مصحف پر متحد کر دینے کا مسئلہ اس قدر آسان نہیں ہے جتنا حضرت عثمان رضہ کے مخالف اور حامی خیال کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلی ہوئی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ آپ

فرماتے ہیں نزل القرآن علی سبعۃ احرف لیکن مسلمان آج تک اس حدیث کے مطلب بیان کرنے پر متفق نہیں ہو سکے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ احرف سے مراد وہ معانی اور مطالب ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید نے وعدہ وعید امر ونہی اور وعظ وقصص کے ماتحت کیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ احرف سے مراد تصوف کی راہیں ہیں۔ ایک جماعت خیال کرتی ہے کہ احرف کا مطلب وہ الفاظ ہیں جو زبانوں کے اختلافات کی بنا پر باہم مختلف ہیں۔ بہرحال مسلمان متفق نہیں ہو سکے کہ اس حدیث کا ٹھیک مفہوم کیا ہے تو جب تک حضرت عثمان رضہ کے حامی اور مخالف کسی ایک مفہوم پر متفق نہ ہو جائیں۔ اس حدیث کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ روایات سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان خود عہدِ نبویؐ میں قرآن کی قرارت میں مختلف تھے اور یہ اختلاف صرف لہجوں میں نہ تھا بلکہ الفاظ میں بھی تھا لیکن معانی میں اختلاف نہ تھا پھر ان اختلاف کرنے والوں نے بات دربارِ نبوتؐ میں پیش کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبھی قرارتوں کی اجازت دے دی۔ اس لیے کہ معانی میں کچھ اختلاف نہ تھا، صرف الفاظ میں کچھ ہیر پھیر تھا۔ قرآن مجید صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظم رضہ کے عہد میں جمع کیا گیا۔ حضرت عثمان رضہ کے پاس صوبوں اور سرحدوں سے شکایتیں پہنچیں کہ مسلمان قرآن مجید پڑھنے میں اختلاف کرتے ہیں، اور آپس میں جھگڑا کرتے ہیں، بعض لوگ اپنے قرآن کو دوسروں کے مصحف پر ترجیح دیتے ہیں اور نوبت تفریق تک پہنچ چکی ہے۔ حذیفہ الیمان رضہ نے حضرت عثمان رضہ کو لکھا "قبل اس کے کہ قرآن کے بارے میں پھوٹ پڑ جائے، آپ امتِ محمدؐ کی خبر لیجئے۔"

پس اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک قرآن کر دینا، اختلافات کا خاتمہ کر دینا اور مسلمانوں کو ایک حرف یا ایک زبان میں قرآن پڑھنے پر آمادہ کر لینا حضرت عثمان رضہ کا وہ کارنامہ ہے جو اپنے اندر غیر معمولی جرأت رکھتا ہے اور جرأت سے کہیں زیادہ اس میں مسلمانوں کی خیرخواہی اور ان کے ساتھ اخلاص ہے، اگر حضرت عثمان رضہ مسلمانوں کو باہم مختلف الفاظ رکھنے والی زبانوں میں کئی کئی طرح قرارت کرتے رہنے دیتے تو یقیناً یہ ایک نااتفاقی اور تفریق کا سرچشمہ ہوتا اور قطعاً الفاظ کا یہ اختلاف فتوحات کے بعد جب کہ عجمی عرب ہو رہے تھے اور دیہات کے عرب قرآن سیکھ رہے تھے معانی کے خوفناک اختلاف تک پہنچا دیتا۔

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اور معتزلہ حضرت عثمان رضہ کی اس عظیم الشان خدمت کے اعتراف کرنے اور اس میں آپ کا شرف اور امتیاز ماننے میں متردد نہیں ہوئے، حضرت عثمان رضہ نے قرآن ایک کر کے مسلمانوں کو تفریق سے بچا لیا اور ان کو ایک ایسی چیز پر جمع کر دیا۔ جس میں وہ اختلاف نہیں کر سکتے اور

جہاں تک ہم کو معلوم ہے ، حضرت عثمان رض کے اس عمل پر حضرت علی رض یا شوریٰ کے کسی رکن کو کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ علی رض تو فرماتے ہیں کہ اگر عثمان رض کی جگہ میں ہوتا تو قرآن کے بارے میں مسلمانوں کو اسی بات پر آمادہ کرتا جس پر انھوں نے کیا ۔ پس اس معاملے میں مذہبی حیثیت سے حضرت عثمان رض پر کوئی اعتراض نہیں ، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصحف کی کتابت کا کام آپ نے صحابہ رض میں سے چند افراد کے حوالے کر دیا ۔ اور ان قاریوں کو نظر انداز کر دیا ، جنھوں نے قرآن خود نبی ؐ سے سنا اور سیکھا تھا اور شہروں میں بہت سے لوگوں کو اس کی تعلیم دی تھی ، مناسب تھا کہ ان سب قاریوں کو جمع کرتے اور کتابتِ مصحف کا کام ان کے ذمے کرتے ۔ یہیں سے ہم کو عبداللہ بن مسعود رض کی ناراضگی کا پتہ چلتا ہے ۔ وہ قرآن کے سب سے بڑے حافظ تھے وہ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے میں نے ستر سورتیں حاصل کی تھیں ۔ جب زید بن ثابت رض سنِ تمیز کو بھی نہیں پہنچے تھے ۔ ایسی حالت میں حضرت عثمان رض کا زید بن ثابت رض اور ان کے ساتھیوں کو موقع دینا اور عبداللہ بن مسعود رض وغیرہ کو نظر انداز کر دینا ہم کو آسانی کے ساتھ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ اس سے اعتراض اور کشیدگی کے جذبات پیدا ہوتے ۔

شاید قرآنی صفحات کا جلا دینا بعض مسلمانوں کی ناگواری اور کوفت کا باعث ہوا اور اختلافات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینے کی عثمانی تدبیر ان کو پسند نہ ہو ۔ مسلمان اس زمانے میں اگر تمدنی طور پر کچھ آگے ہوتے تو حضرت عثمان رض کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ جلائے جانے والے صفحات کو عوام بلکہ خواص سے بھی دور رکھ کر ضائع ہونے سے بچا لیتے لیکن وہ تہذیب کی اس منزل میں نہ تھے کہ کتب خانوں کی تنظیم اور آثار کی حفاظت کا سامان کرتے اور جب مذہبی اور سیاسی حیثیت سے حضرت عثمان رض کا یہ عمل کوئی قصور نہیں تو دین کی کسی بات کے ضائع ہونے کا کوئی غم نہیں ۔ ہاں اس کا افسوس کر سکتے ہیں کہ اہل علم اور محققین کے لیے عربی زبان اور اس کے لہجوں کی تحقیقات کے بعض مواقع جاتے رہے لیکن جو کچھ ہوا اس کی حیثیت لسانی تحقیقات اور لہجوں پر بحث و نظر سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے ۔

حضرت عثمان رض کی ایک اور بات ہے جس پر ان کے مخالفوں کو اعتراض ہے جس میں عذرداری کی گنجائش ہم کو نظر نہیں آتی ، حضرت عثمان رض نے اپنے چچا حکم بن العاص اور اُن کے متعلقین کو مدینہ واپس بلا لیا ۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہایت سختی کے ساتھ مدینے سے نکال دیا تھا ، حکم بن العاص کا مکان عہد جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں تھا ۔ حکم اپنے شریف پڑوسی کو بُری سے بُری اذیت پہنچاتا تھا ۔ یہی حکم تھا جس نے حضرت عثمان رض کو اسلام لانے کی سزا میں رسی سے باندھ دیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے باپ دادا کے مذہب پر واپس نہ آجائیں ان کو اسی طرح

رکھوں گا لیکن پھر مایوس ہوکر آپ کو کھول دیا۔ حکم فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوکر مدینہ آیا۔ لیکن اس کا اسلام موت سے بچنے کی ایک ترکیب تھی۔ ثبوت یہ کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیفیں پہنچاتا تھا، چنانچہ آپ کے پیچھے پیچھے جاتا، آنکھوں سے اشارے کرتا، تمسخر کے ساتھ آپ جیسی حرکتیں کرتا۔ ایک دن وہ آپ کے کسی حجرے میں دفعتہً آگیا۔ آپ غصے میں باہر نکل آئے اور اس کو پہچان کر فرمایا۔ اس بزدل کے لیے میری کون مدد کرے گا! اس کے بعد آپ نے اس کو مدینہ سے نکال دیا اور فرمایا وہ کبھی میرا پڑوسی نہیں رہ سکتا۔ حضرت عثمان رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم کی واپسی کے لیے سفارش کی لیکن آپ نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ پھر حضرت ابوبکر رضؓ سے درخواست کی، انھوں نے مسترد کردی پھر حضرت عمر رضؓ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، حضرت عمر رضؓ نے نہ صرف یہ کہ انکار کردیا بلکہ حضرت عثمانؓ کو ڈانٹا، اور متنبہ کیا کہ آئندہ وہ حکم کے بارے میں گفتگو نہ کریں، پھر جب وہ خود خلیفہ ہوئے تو حکم کو مدینہ واپس بلالیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کو برا معلوم ہوا اور ممتاز صحابہ نے حضرت عثمان رضؓ کے پاس جاکر اعتراضات کیے، انھوں نے جواب دیا کہ اس سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت ہوئی تھی۔ حضرت کا جواب امید افزا تھا لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی کہ آپ وفات پاگئے۔ حضرت عثمان رضؓ کے حامی معتزلہ اور اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ کی رائے میں حکم کی جلاوطنی دائمی سزا نہ تھی۔ اس لیے کہ جیسے جیسے دن گذرتا ہے جلاوطن کے حالات میں اصلاح ہوتی جاتی ہے تب اس کو معاف کردینا چاہیئے اور موقع دینا چاہیئے کہ وہ اپنی سرزمین میں واپس آجائے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کو معلوم ہوچکا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم کی واپسی پر راضی ہیں، لیکن صدیق اکبر رضؓ اور فاروق اعظم رضؓ نے اس بات کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ یہ تنہا حضرت عثمان رضؓ کا کہنا تھا اس کے لیے کوئی شاہد نہ تھا لیکن جب ان کو خلافت ملی تو انھوں نے اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کردیا اور خلیفہ کو یہ حق ہے کہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرے۔

لیکن حضرت عثمان رضؓ کے معترضین کہتے ہیں کہ عہد جاہلیت میں حکم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو سلوک تھا اور بناوٹی مسلمان ہونے کے بعد اس نے آپ کے ساتھ جو طرز عمل رکھا، پھر آپ کا یہ فرمانا کہ اس بزدل کے لیے میری مدد کون کرے گا! وہ مدینہ میں میرے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتا۔ یہ سب باتیں حضرت عثمان رضؓ کو روکتی ہیں کہ وہ حکم کو مدینہ واپس بلائیں، خلیفہ کے لیے اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرنا اس وقت مناسب نہیں ہے۔ جب ایسا شبہ موجود ہے کہ اس کے حکم میں رشتہ داری کی رعایت ہے۔ اس لیے کہ حکم حضرت عثمان رضؓ کے چچا ہیں، صرف یہی شبہ کافی تھا کہ حضرت عثمان رضؓ حکم کو

مدینہ بلانے سے باز رہتے۔ پھر اگر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کہ "مدینہ میں میرے ساتھ ہرگز نہیں رہ سکتا" کا اضافہ کرلیں تو نبیؐ کی حرمت کا ادنیٰ تقاضا تھا کہ حضرت عثمان رض حکم کو مدینہ بلاکر وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی نہ بنا دیتے جبکہ آپ زندگی میں اس کے انکاری تھے۔

حضرت عثمان رض نے حکم اور ان کے لڑکوں کے ساتھ بعد میں جو کچھ کیا اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کو مدینہ بلانے کا مقصد یہ تھا کہ انھیں مواقع کے لیے ترجیح دیں، ان کی وجہ سے دوسروں پر برتری حاصل ہو۔ سیاسی، انتظامی اور مالی معاملات میں ان سے مدد لی جائے۔ چنانچہ آپ نے حکم کو بہت سا مال دیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی قبر پر ایک خیمہ بنا دیا۔ علاوہ ازیں حارث بن حکم کو مدینہ کے بازار پر مقرر کردیا۔ جس نے اپنی ذات پر اور دوسروں پر بڑی زیادتی کی۔ اس نے ایسی روش اختیار کی جس کو راست بازی اور تقویٰ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ البتہ اس میں حرص و طمع اور بہت زیادہ دولت جمع کرنے کی خواہش تھی۔

پھر حضرت عثمان رض نے اسی پر بس نہیں کیا، حارث کو بھی بہت زیادہ مال دیا جیسا کہ آگے آپ پڑھیں گے، پھر مروان بن الحکم پر خاص عنایت کی نظر کی، اس کو عطیات دیئے، مقرب بنایا، اپنا وزیر اور مشیر رکھا۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رض نے حکم اور اس کے لڑکوں کو محض ہمدردی اور عنایت کی بنا پر نہیں بلایا تھا۔ بلکہ اس لیے بلایا تھا کہ وہ آپ کے دست و بازو بن سکیں۔

یہ ہیں وہ تمام باتیں جن کو معترضین حضرت عثمان رض کی مذہبی حیثیت کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن سے حضرت عثمان رض پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ حکم بن العاص اور ان کے لڑکوں کی بات ہی ایک ایسا اعتراض ہے جس کے جواب میں دشواری ہے لیکن یہ بات بہرحال حضرت عثمان رض کے دین کو مجروح نہیں کرتی، انھوں نے ایک سنت کی مخالفت کی اور اس کا غلط یا صحیح ایک مطلب بتایا، لیکن انھوں نے دین کے کسی اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نہ دین کے کسی رکن کو گرایا اور پھر وہ مرد مجتہد ہیں، ان سے خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے اور ہر خلیفہ صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض جیسی راہ نہیں چل سکتا، خواہ اس نے لوگوں سے عہد کیا ہو کہ وہ زندگی میں شیخین رض کا پابند رہے گا۔

ہمارا یقین ہے کہ اگر حضرت عثمان رض اپنے واقعات کے ساتھ اسی حد پر ٹھہر جاتے تو مسلمان ان کے ساتھ خیرخواہی اور سخت نکتہ چینی کی حد سے آگے نہ بڑھتے اور معاملات کی ذمہ داری ان کے سر

ڈال کر خدا کے حوالے کر دیتے جو ان سے نرم یا گرم جیسا چاہتا حساب لیتا۔
لیکن حضرت عثمان رض اور ان کے عمال اس حد سے آگے بڑھے اور ایسی باتیں کیں جن سے لوگوں کے حقوق میں، ان کے مصالح میں اور ان کی آزادی میں مداخلت ہوئی اور یہ ایک بڑے فتنے کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

تقرری اور برطرفی

گورنروں کے تقرر اور برطرفی میں، اور انتظامی امور میں حضرت عثمان رض کے مسلک پر مسلمانوں کو بڑا اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کے معاملات کی لگام چند ایسے نوجوانوں کے ہاتھوں میں دے دی جن میں نہ صلاحیت تھی نہ مقدرت، اور جو نہ دین کے خیرخواہ تھے نہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخلص، حکومت کے عہدوں سے صحابہ رض کو برطرف کر دیا، حضرت عمر رض کی وصیت پر توجہ نہیں کی اور لوگوں کی گردنوں پر ابو معیط اور بنی امیہ کو سوار کر دیا، لوگوں نے بیزاری اور ناراضی کا اظہار کیا لیکن آپ نے کچھ اثر نہیں لیا، بالآخر ان حاکموں کا فسق اور بے راہ روی کھل گئی پھر بھی آپ نے ان کو برطرف نہیں کیا۔ اور کیا تو اس وقت جب کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔
آپ نے کوفہ پر سعید بن ابی وقاص رض کی جگہ ولید کا تقرر کیا، بصرہ میں ابو موسیٰ اشعری رض کی جگہ عبداللہ ابن عامر کو دی۔ مصر میں عمرو بن العاص رض کی جگہ عبداللہ بن ابی سرح کو حاکم بنایا اور پورا ملک شام امیر معاویہ رض کے حوالے کر دیا۔
ان تمام معاملات پر ہم نے اپنی رائے پیش کر دی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف معتزلہ اور اہل سنت حضرت عثمان رض کی طرف سے جواب دہی میں بے جا تکلفات سے کام لے رہے ہیں اور دوسری طرف مخالفین اعتراض کی راہ سے آگے بڑھ کر بدنام کرنے کی حد میں جا رہے ہیں۔ حضرت عثمان رض کے حامیوں کا یہ کہنا معقول نہیں کہ وہ بے قصور ہیں، ان کو مقرر ہونے والے گورنروں کے اندرونی حالات کا پتہ نہ تھا، بظاہر حالت اچھی تھی، اس لیے تقرر میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ ولید بن عقبہ کے حالات روز روشن تھے۔ حضرت عثمان رض جانتے تھے کہ ولید کے بارے میں آیت اتری ہے، قرآن اس کو فاسق کے نام سے یاد کرتا ہے۔ حضرت عمر رض نے یہ سمجھ کر کہ اب اس کی

حالت ٹھیک ہو گئی ہو گی۔ اس کو بنی تغلب کے صدقات کی وصولی پر مقرر کیا لیکن جیسے ہی آپ کو پتہ چلا کہ وہ بدستور اپنی جاہلیت میں ملوّث ہے۔ آپ نے برطرف کر دیا، خود ولید کو بھی اپنی حالت کا ٹھیک اندازہ تھا۔ چنانچہ جب وہ سعد بن ابی وقاص رض کے پاس کوفہ پہنچا تو روایتوں میں ہے کہ سعدؓ نے اس سے پوچھا۔ ملاقاتی بن کر آئے ہو یا حاکم؟ ولید نے کہا حاکم بن کر۔ سعدؓ نے کہا معلوم نہیں کہ میں کچھ احمق ہو گیا یا تم عقل مند بن گئے۔ ولید نے کہا۔ نہ تم احمق ہوئے نہ میں عقلمند بنا۔ قوم کے ہاتھ میں اختیار آیا اور اس نے چُن لیا۔ سعدؓ نے کہا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ پس ولید جانتا تھا کہ اس کو کوفے کی گورنری اس لیے نہیں ملی کہ اس کی کیفیت بدل گئی ہے۔ وہ خراب تھا اچھا ہو گیا ہے بلکہ اس لیے کہ قوم مختار تھی اس نے موقع دے دیا۔ اسی طرح حضرت عثمان رض بخوبی جانتے تھے کہ عبداللہ بن عامر ۲۵ سال کا نیا نوجوان ہے۔ مہاجر اور انصار میں دوسرے عرب قبائل میں ایسے افراد موجود تھے جو عبداللہ سے زیادہ معمّر، عبداللہ سے زیادہ تجربہ کار اور اس سے بہت پہلے کے مسلمان تھے۔

اسی طرح حضرت عثمان رض خوب جانتے تھے کہ عبداللہ بن ابی سرح کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اس کے خون کا اعلان کیا تھا۔ پس ان لوگوں کے حالات کچھ چھپے ڈھکے نہ تھے اور حضرت عثمان رض جیسوں پر تو بالکل عیاں تھے۔ پھر معتزلہ اور اہلِ سنت کا یہ کہنا بھی معقولیت نہیں رکھتا کہ گورنروں کی آلودگی اور خرابی کا پتہ چلتے ہی حضرت عثمانؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ اس لیے کہ انھوں نے ولید کو اسی وقت برطرف کیا جب برطرفی کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ ہمارا یہ خیال نہیں کہ حضرت عثمان رض نے حد جاری کرنے میں ذرا بھی تاخیر کی۔ لیکن اس کا ہم کو یقین ہے کہ ولید کو انھوں نے اسی وقت معزول کیا جب اس کی برائی طشت از بام ہو گئی۔ گواہوں نے اس کی شراب نوشی کی گواہی دے دی، کوفہ والے چلّا اٹھے۔ انصار اور مہاجرین نے برطرفی پر شدت کے ساتھ اصرار کیا، ولید کے بعد سعید کو بھی خوشی سے برطرف نہیں کیا بلکہ مجبور ہو کر کوفہ والوں نے سعید کو شہر میں داخل ہونے نہیں دیا اور حضرت عثمان رض کو لکھا کہ بغاوت منظور کیجیے یا پھر ابو موسیٰ اشعری رض کو والی مقرر کیجیے، اسی طرح عبداللہ بن ابی سرح کو بھی خوشی سے معزول نہیں کیا بلکہ مصریوں نے بغاوت کی دھمکی دی، انصار اور مہاجرین نے بھی معزولی پر اصرار کیا۔ حضرت علی رض نے اس پر قتل کے الزام کی تحقیق کا مطالبہ کیا۔ تب جا کر کہیں حضرت عثمان رض نے اس کو برطرف کیا، اور محمد بن ابوبکرؓ کے لیے فرمان لکھا۔ ان باتوں میں تو شک کی گنجائش نہیں، البتہ وہ خط کی بات مشکوک ہے جو بعد میں لکھا گیا اور جس میں مصریوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پس یہ بات صحیح نہیں کہ ان کو گورنروں کے حالات کا علم نہ تھا اور نہ یہ صحیح ہے کہ خرابی کی اطلاع پاتے ہی حضرت عثمان رضؓ نے ان کو معزول کردیا۔

اور مخالفین کا یہ کہنا کہ آپ کے گورنر حکومت کرنے کی قابلیت اور مقدرت نہیں رکھتے تھے، کھلی ہوئی زیادتی ہے اس لیے کہ ان کی اہلیت اور مقدرت میں کچھ شک نہیں۔ فتوحات میں ان کی کارکردگی، ان کی ہمت اور حوصلہ اس کا ثبوت ہے لیکن یہ قابلیت اور قدرت اس حکومت کے لیے تھی جس کی بنیاد قوت پر تھی، شوکت پر تھی، جبر اور برتری پر تھی۔ اسلامی فرائض یعنی عدل، انصاف، اخوت اور مساوات پر نہ تھی۔ اس پابندئ عہد پر نہ تھی جو حضرت عثمان رضؓ نے کیا تھا کہ وہ سنتِ شیخین رضؓ کی سیرت سے ایک قدم بھی نہیں ہٹیں گے۔

پس حضرت عثمان رضؓ کے تقرر اور برطرفی کو ان کے عہد و پیمان سے کوئی نسبت نہیں اور بلاشبہ جن لوگوں نے ان کے حاکموں کو تنگ کیا، ان کے خلاف بغاوت کی اور ان پر اعتراض کرتے رہے وہ خطاکار نہ تھے۔

مالی پالیسی

حضرت عثمان رضؓ کی مالی پالیسی ان کے پورے دورِ خلافت میں زیادہ تر قابلِ اعتراض رہی، بہت سے ان کے معاصرین نے، پھر راویوں اور مورخوں نے اس سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ بعد میں متکلمین نے اس کو اپنے اختلافات کا موضوع بنایا۔ معتزلہ اور اہلِ سنت نے اس کی حمایت کی، شیعہ اور خوارج نے مخالفت کی، مختصراً حضرت عثمان رضؓ کی مالی پالیسی کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ خلیفہ جہاں بھی مصلحت سمجھے عوام کا مال خرچ کرسکتا ہے اور جب منصبِ خلافت کے ماتحت وہ مسلمانوں کے معاملات کی تدبیر کے لیے وقف ہوچکا ہے تو اپنی ذات کے لیے، گھر والوں کے لیے اور قرابت داروں کے لیے عوام کے مال میں سے بقدر کفالت لے سکتا ہے۔ مورخین نے ٹھیک طور پر اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ حضرت عثمان رضؓ خلیفہ ہونے سے قبل بڑے سخی، بڑے روادار اور بڑے فیاض تھے۔ غیر معمولی دولت کے مالک تھے اور زبردست نفع بخش کاروبار کرتے تھے، ان کی دولت ان کے تمام مصارف کے لیے گنجائش رکھتی تھی۔ پھر جب آپ خلیفہ ہوگئے تو اس منصب نے

تجارت کرنے اور نفع کمانے سے روک دیا، اور یہ ضروری تھا کہ خلافت سے پہلے جو آپ کے مصارف تھے وہ علیٰ حالہ باقی رہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس خیال کے تھے کہ خلافت کو خلیفہ کی مالی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس کا ذاتی مال ضرورتوں کو پورا نہیں کر رہا ہے تو عوام کا مال اس کو پورا کردے اس لیے کہ اس کی دولت میں کمی اور دولت کی نفع بخشی میں رکاوٹ اسی لیے ہے کہ وہ اپنا سارا وقت عوام کی دولت کے انتظام میں صرف کر رہا ہے۔

حضرت عثمان رض کی طرح خلافت سے پہلے صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کے پاس دولت اور ثروت نہ تھی، ان میں سے کسی ایک نے بھی بیر رومہ نہیں خریدا۔ زمین خرید کر مسجد نبوی میں توسیع نہیں کی۔ اس لیے نہیں کہ بخل سے کام لیا بلکہ اس لیے کہ وہ دولت مند ہی نہ تھے، پھر یہ دونوں خلیفہ حضرت عثمان رض کی طرح اپنی ذات پر، گھر والوں پر، اور متعلقین پر فراخی اور فیاضی سے خرچ نہیں کرتے تھے اس لیے کہ ان کی دولت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ پس خلافت کی ذمہ داری لینے کے بعد ان دونوں حضرات کی روش میں اگر کچھ تبدیلی ہوئی تو وہ یہ کہ یہ اور بھی سخت گیر اور محتاط ہوگئے، لیکن حضرت عثمان رض خلافت کے بعد بھی اپنی پہلی روش پر قائم رہے۔ غالباً تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب ذاتی سرمایہ کم ہوگیا تو انھوں نے مسلمانوں کے مال سے اتنی مقدار لینا اپنے لیے مباح کرلیا، جتنی تجارتی مشغولیت، نفع میں پس انداز کرسکتی۔ شروع شروع معاملہ اسی طرح رہا اس کے بعد اس میں اضافہ ہوا اور پھر اقتدار نے آپ کا رخ زیادہ سخت اور فیاضی کی طرف پھیر دیا۔

حضرت عثمان رض کے مالی مسلک کی وضاحت میں ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اور وہ یہ کہ غالباً حضرت عثمان رض اس خیال کے تھے کہ مسلمانوں کو ان کی نگرانی کا بھی حق نہیں ہے۔ سزا دینا تو الگ رہا، وہ سمجھتے تھے کہ جو عہد و پیمان انھوں نے کیا ہے اس کی جواب دہی عوام کے سامنے نہیں بلکہ خدا کے سامنے کرنی ہے۔ اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ جب لوگوں نے ان سے معزول ہونے کا اہم مطالبہ کیا تو وہ مطمئن رہے اور مطالبہ کرنے والوں سے اور دوسروں سے فرمایا "جو خلعت خدائے عز و جل نے مجھے پہنادی ہے میں اس کو اتارنے والا نہیں ہوں اور یہ کہ آگے بڑھ کر کوئی میری گردن اڑا دے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس بات سے کہ میں خدائے عز و جل کا پہنایا ہوا لباس اتار دوں"۔

پس خلافت حضرت عثمان رض کی نظر میں ایسی ذمہ داری نہ تھی جس کو اپنی خواہش سے یا لوگوں کے کہنے سے واپس کردیں، ان کے نزدیک خلافت اللہ کا پہنایا ہوا لباس ہے۔ جس کو اتارنے کا نہ خود

ان کو حق ہے اور نہ کسی دوسرے کو، یہ تو صرف اللہ کے اختیار کی بات ہے وہی اس کو زندگی کا لباس اتارنے کے دن اتار سکتا ہے۔

حضرت عثمان رض کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے شیخین رض کو دیکھا، جب سے دونوں نے خلافت کی ذمہ داری لی، کسی نے ان کو ان کی زندگی تک علیحدہ نہیں کیا، اسی طرح ان کو بھی جب تک ان کی زندگی ہے کوئی خلافت سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ اگر خلافت اور اس سے حاصل ہونے والے اقتدار کے بارے میں حضرت عثمان رض کا یہی نظریہ ہے۔ تو پھر حیرت کی بات نہیں اگر وہ ان لوگوں کو تنگ کریں جو ان سے اقتدار کے لیے برسر پرخاش تھے۔ جو ان کو انتظامات میں، سیاسیات میں اور مالیات میں بعض تصرفات سے روکنا چاہتے تھے، اس لیے کہ وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں، لوگوں کے سامنے نہیں۔ حضرت عثمان رض کی یہ رائے کسی تصنّع کی بنا پر نہیں اور نہ معترضین سے بچنے کی خاطر ہے بلکہ سچی نیت اور خالص بصیرت کے ماتحت وہ ایسا سمجھتے تھے۔ غالباً ان کے زمانے کے بہت سے مسلمان بھی خلافت اور اس کے اقتدار کے متعلق یہی خیال رکھتے تھے۔ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ صحابہ میں ایسے حضرات تھے جو خلیفہ سے اختلاف اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ خواہ وہ اعتدال سے دور اور راہ سے ہٹ گیا ہو۔ یہ لوگ اللہ کی اس آیت کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں اور اس کی تاویل پسند نہیں کرتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ	اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی، اور
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ	اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے
مِنكُمْ۔	اولی الامر کی۔

یہ لوگ، اگر خلیفہ کی طرف سے کوئی زیادتی ہو جائے، تو اس کو برداشت کرنا اس لیے اچھا سمجھتے تھے کہ اس پر ان کو آخرت میں ثواب ملے گا اور اس لیے بھی کہ خلیفہ کے مقابلہ میں کہیں کسی گناہ کی زد میں نہ آ جائیں اور پھر اس میں ان کے لیے کوئی حرج کی بات نہ تھی کہ دنیا میں زیادتی برداشت کریں اور آخرت میں ثواب کے مستحق بنیں اور خلیفہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہو اور خدا کو اس کا حساب دے۔

حضرت ابوذر رض کا یہی مسلک تھا کہ وہ حضرت عثمان رض کی زیادتی کو ناپسند کرتے ہوئے بھی ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رض بھی اسی مسلک پر تھے۔ جب ذاتی معاملے میں حضرت عثمان رض نے آپ کے ساتھ زیادتی کی اور دین کے معاملے میں جب منٰی میں آپ نے پوری نماز پڑھی، حالانکہ آپ کو حضرت عثمان رض سے اتفاق نہ تھا۔

غرض حضرت عثمان رض مالیات میں اور جنگ میں بدستور اپنا انتظام اور اپنی سیاست چلاتے رہے

ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اجتہاد کرنا ان کا حق ہے اور اس اجتہاد کی جواب وہی خدا کے سامنے کرنی ہے اور یہ کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت اور خیر خواہی کریں اور مشورے بھی دیں، ان کا جی چاہا تو مان بھی لیں گے جیسا کہ بعض مواقع پر ہوا اور نہ جی چاہا تو مسترد کر دیں گے اور اس کی بھی متعدد مثالیں ہیں۔ حکومت اور اقتدار کا یہ تصور ایک نیا تصور ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے خیال میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں سے قطع نظر کر کے اقتدار کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ فاروق اعظمؓ کا رویہ تو اس قدر سخت تھا کہ خود مسلمان گراں محسوس کرتے تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ روم کی ملکہ نے آپ کی زوجہ محترمہؓ، حضرت علیؓ کی صاحبزادی اُمّ کلثومؓ کے لیے جواہر کا ایک ہار تحفے میں بھیجا۔ اس سے قبل ام کلثومؓ عرب کے بعض تحفے ملکہ کو بھیج چکی تھیں۔ اتفاق کی بات کہ ڈاکیا نے تحفہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں دیا۔ حضرت عمرؓ نہیں چاہتے تھے کہ ہار ام کلثوم کو دیا جائے۔ چنانچہ الصّلوٰۃ جامعۃؓ کہہ کر سب لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور ہار کے بارے میں سوال کیا، سب نے متفقہ کہا کہ یہ ام کلثوم کی چیز ہے اور ان تک پہنچا دینی چاہیئے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں حرج محسوس کیا اس لیے کہ وہ ہار مسلمانوں کی ڈاک میں آیا تھا۔ چنانچہ اس کو بیت المال میں رکھنے کا حکم دیا اور بیوی کو ان کے بھیجے ہوئے تحفے کا خرچ دلوایا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنی ذات کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ جو طرز عمل اختیار فرماتے تھے وہ لوگوں پر بڑا گراں تھا۔ حد یہ ہے کہ عورتیں اور لڑکیاں ان سے شادی کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ اور بعضوں نے تو ان کا پیغام تک رد کر دیا۔ کہاں یہ طرز عمل اور کہاں وہ طریقۂ کار کہ حضرت عثمانؓ نے بیت المال کے بعض جواہرات سے گھر کے بعض لوگوں کے لیے زیور بنا دیا اور جب اسکے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا "ہم اس مال میں سے اپنی ضرورت کے مطابق ضرور لے لیں گے، کوئی ناراض ہو تو ہوا کرے"۔

بڑی ناگواری اور افسوس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت کے متعلق حضرت عثمانؓ کا نقطۂ نظر وہی ہے جو زیاد نے اپنے مشہور خطبے میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "لوگو! اب ہم تمھارے حاکم اور حامی بن گئے ہیں۔ اس اقتدار کی بدولت جو خدا نے ہم کو دیا ہے، ہم تم پر حکمرانی کرتے ہیں اور اس ٹیکس کے عوض جس کی وصولی کا خدا نے ہم کو حقدار بنایا ہے ہم تمھاری حفاظت کرتے ہیں"۔ اس کے پیش نظر تعجب کی بات نہیں۔ اگر ہم روایتوں میں حضرت عثمانؓ کا یہ قول پڑھتے ہیں "یہ ابو بکرؓ اور عمرؓ اپنی جانوں پر اور اپنے متعلقین پر زیادتی کر کے اللہ سے قربت حاصل کرتے تھے اور میں عزیزوں سے صلہ رحمی کر کے اللہ سے قربت حاصل کرتا ہوں"۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اجتہاد کیا اور

اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے زیادتی کرنے والے بنے۔ حضرت عثمان رضؓ نے اجتہاد کیا۔ رشتہ داروں کو نوازا۔ اپنی ذات پر بھی کچھ سختی نہیں کی۔ کیا اب بھی ہم کو ضرورت رہ جاتی ہے کہ ہم اس روایت کی صحت پر بحث کریں جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ نے مروان بن الحکم کو افریقہ کے مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ یا خمس کا پانچواں حصہ دیا۔ یا خمس کی جو قیمت اس کی طرف باقی رہ گئی تھی، اس کو بخش دی، یا جس میں مذکور ہے آپ نے اپنے چچا حکم اور ان کے لڑکے حارث کو تین لاکھ دیا اور عبداللہ ابن خالد بن سعید اموی کو تین لاکھ پیش کیا اور ان دو آدمیوں کو جو عبداللہ بن خالد کے ساتھ آئے تھے ایک ایک لاکھ دیا، یہاں تک کہ بیت المال کے خزانچی عبداللہ بن ارقم رضؓ نے رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے، انھیں عبداللہ بن ارقم رضؓ کو حضرت عثمان رضؓ نے استعفٰی کے بعد تین لاکھ کی رقم پیش کی لیکن انھوں نے زہد و تقوٰی کے پیش نظر لینا منظور نہیں کیا۔ حضرت عثمان رضؓ نے زبیر بن العوام رضؓ کو ۶ لاکھ، طلحہ بن عبیداللہ رضؓ کو ایک لاکھ، سعید بن العاص کو ایک لاکھ کا عطیہ دیا اور اپنی تین یا چار لڑکیوں کا بعض قریشیوں سے عقد کیا تو ہر ایک کو ایک لاکھ دینار دیا۔

پس حضرت عثمان رضؓ خیال کرتے تھے کہ ان کو ان عطیات کے دینے کا حق ہے اور خزانچی ان کی عدول حکمی یا ان سے بحث کا مجاز نہیں اور جب سخاوت کا یہ عالم ان کو گوارا تھا تو بیت المال سے قرض لے لینا بھی گوارا کیا کہ جب میسر ہو گا ادا کر دیں گے، پھر کھلی بات ہے کہ ان کے گورنروں نے بھی یہی مسلک اختیار کیا، عطیات دیئے، قرض لیے۔ بعضوں نے قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیا، اسی سلسلے میں عبداللہ بن مسعود رضؓ کو کوفہ میں اپنے عہدے سے استعفٰی دینا پڑا جس طرح عبداللہ بن ارقم رضؓ کو مدینہ میں مستعفی ہونا پڑا۔ خلیفہ اور اس کے گورنر عوام کے مال کا اگر اس طرح آزادانہ استعمال شروع کر دیں تو مقام حیرت نہیں کہ بروقت فوج کو مال کی تنگی ہو، خلیفہ مجبور ہو کر صدقات کی مدوں میں سے رقمیں لے کر جنگ پر خرچ کرے جس سے اس کے بارے میں ناراضی اور مخالفت پیدا ہو جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور ان تمام باتوں سے اگر کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو وہ یہ کہ حضرت عثمان رضؓ کی مالی پالیسی زیادہ منظم اور محتاط نہ تھی۔

پھر جب خلیفہ اور اس کے حاکم عوام کے مال میں اس طرح اپنے ہاتھ آزاد کر دیں تو تعجب کیا کہ یہی ہاتھ صدقات کی رقموں کی طرف بڑھیں۔ جنگ کے اخراجات کے لیے نہیں بلکہ عطیات اور صلہ رحمی کی خاطر، جیسا کہ روایتوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ نے حارث ابن حکم کو بنی قضاعہ کے صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا۔ جب وہ رقم لے کر آئے تو انھوں نے وہ سب رقم ان کو بخش دی۔ اس سے بھی

بڑھ کر یہ کہ جنگ و امن کی یہ ضروریات خلیفہ اور گورنروں کی یہ فیاضیاں اور یہ عطیات شاید بیت المال ہی کو محتاج بنا دیں اور نتیجہ یہ نکلے کہ زکوٰۃ جزیہ اور خراج کی رقموں کی وصولی میں رعایا پر بے جا تشدد اور جبر سے کام لینا پڑے اور اس کا اندازہ ان روایتوں سے ہوتا ہے جن میں عبداللہ بن سعد رض کی مصر پر زیادتی کا ذکر ہے۔ جن میں عمرو بن العاص رض نے حضرت عثمان رض کو جواب دیا ہے کہ مصر کی اونٹنی نے دودھ تو زیادہ دیا لیکن اس کے بچے سب مر گئے۔ جن میں بتایا گیا ہے کہ صدقات کی وصولی کرنیوالوں نے دیہاتیوں پر ظلم و زیادتی سے کام لیا اور تمام حضرت عثمان رض کا لگا دیا۔ حضرت عثمان رض نے یہ سب کچھ سنا اور کچھ اقدام نہیں کیا۔ علاوہ ازیں حضرت عثمان رض کی سخاوت مالِ منقول تک محدود نہ تھی وہ غیر منقولہ جائدادیں بھی عطیہ فرماتے تھے۔ چنانچہ اعتراض کرتے ہوئے لوگوں نے کہا ہے کہ انھوں نے بنی امیہ کو بڑی بڑی زمینیں عطیہ کی ہیں۔ معتزلہ اور اہل سنت ان عطیات کے بارے میں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے یہ کام سواد کی زمینوں کی درستی اور ان کو زراعت کے قابل بنانے کے خیال سے کی ہے اور آپ کا یہ عمل مسلمانوں کی ایک خیر خواہی ہے۔ شیعوں نے جواب سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ زمینوں کے عطیات کی حضرت عثمان رض نے خود یہ توجیہ نہیں کی ہے، شیعہ تو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ پورے قریش میں بنی امیہ کچھ زمین کی درستی کے اسپشلسٹ نہیں تھے اور نہ سارے عرب میں قریش ہی پڑی ہوئی زمینوں کی کاشت کے بڑے ماہر تھے اور نہ تمام مسلمانوں کو چھوڑ کر صرف عربوں کو اس میں خاص مہارت حاصل تھی۔ بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس نظریے کا نتیجہ ہے جو خلیفہ اور اس کے اقتدار کے متعلق حضرت عثمان رض نے قائم کر رکھا تھا اور ان اختیارات کے اثرات ہیں جن پر حضرت عثمان رض اور ان کے عمال مطمئن تھے۔

اس سے پہلے ہم نے اس اقتصادی انقلاب کا تذکرہ کر دیا ہے جو حضرت عثمان رض اس طرح لانا چاہتے تھے کہ عربی بلاد کے باشندے غنیمت میں ملی ہوئی اپنی صوبوں اور شہروں کی زمینوں کو فروخت کر دیں اور اس کے بدلے میں جزیرۃ العرب کی کوئی زمین لے لیں۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اس سے اسلام میں بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیریں پیدا ہو گئیں اب اگر اس حقیقت کو بھی سامنے کر لیں کہ خلیفہ اور گورنروں نے بنی امیہ اور قریش پر سخاوت کی بارش برسائی۔ جس نے اکثر قریشیوں کو شہروں میں زمینوں کا مالک بنا دیا تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رض کی مالی پالیسی کے دو ہی نتیجے نکل سکتے تھے اور دونوں بُرے، ایک تو عوام کے مال کا بے جا اور غلط استعمال جس سے مالیات میں ابتری پیدا ہوتی ہے اور رعایا پر ظلم ہوتا ہے۔ دوسرا سرمایہ داروں کے ایسے

طبقے کی پیدائش جس کے حرص و طمع کی کوئی حد ہی نہیں ہے جو جائداویں بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ جو مزدوروں کو خریدتا ہے۔ جو امتیاز اس کے اندر نہیں، اپنے کو اس کا مالک تصور کرتا ہے، پھر اقتدار کے حصول کے لیے مقابلہ کے میدان میں آتا ہے اور ترقی کرتا ہوا امارت اور خلافت تک کا خواہاں بنتا ہے بالآخر معاملہ فتنہ و فساد کے اس مرحلے تک پہنچا ہے جہاں مسلمانوں کی بات بگڑ جاتی ہے۔ حضرت عثمان رض کی جان جاتی ہے اور حکومت بنی امیہ سے نکل کر بنی عباس کے خاندان میں چلی جاتی ہے۔

ایک فطری بات ہے کہ ایسی سخاوت کے ساتھ بیت المال سب لوگوں کے لیے کسی طرح گنجائش نہیں رکھ سکتا تھا۔ پھر یہ بھی فطری بات ہے کہ کچھ نہ پانے والوں کے دلوں میں پانے والوں کی طرف سے اور دینے والوں کی طرف سے میل پیدا ہو۔ اور اس طرح خلیفہ اور حاکموں سے ان کے تعلقات کشیدہ ہوں۔ پھر یہ تمام باتیں ان کو غور و فکر کی دعوت دیں۔ اور وہ شیخین رض اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور طریقے پر نگاہ ڈالیں اور ان پر واضح ہو جائے کہ حضرت عثمان رض کا طور طریقہ ایک تو سنتِ موروثہ کے خلاف ہے اور دوسرے لوگوں پر ظلم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ باہر کے شہریوں نے محاصرہ سے پہلے جب بغاوت کی تو حضرت عثمان رض سے مطالبہ کیا کہ وہ مال غنیمت کے مصارف کے بارے میں نظر ثانی کریں اور سن رسیدہ صحابہ کے علاوہ انھیں لوگوں کو دیں جنھوں نے اس کے لیے جہاد کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس معاملے میں حضرت عثمانؓ کو حد سے باہر دیکھا۔ جس سے ان کو روکا بلکہ ایک جدید مسلک اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ جو حضرت عمر رض کے مسلک سے بھی الگ تھا۔ مال غنیمت کے متعلق حضرت عمر رض کا معمول سب کو معلوم ہے۔ وہ اللہ کا حکم جاری فرماتے تھے یعنی مال غنیمت کا پانچواں حصہ رکھ لیتے تھے باقی چار خمس غنیمت لانے والوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ پھر اس خمس میں جزیہ اور خراج کی رقمیں ملا دیتے تھے اور یہ کل رقمیں رفاہ عام پر خرچ کرتے تھے اور اس کے بعد مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے وظیفے مقرر کرتے تھے دوسرے مسلمانوں کی طرح فوج بھی غنیمت کے حصوں کے علاوہ وظیفوں میں حصہ پاتی تھی۔ پس جب شہریوں نے بیت المال کی جمع شدہ رقم میں خلیفہ اور اس کے حاکموں کی زیادتی دیکھی تو انھوں نے مطالبہ کیا کہ عوام کے مال میں سے عطیات صرف فوجی مجاہدین کے لیے خاص ہوں خواہ بالفعل وہ لڑائی پر ہوں کہ نہ ہوں۔ اگر لڑائی پر ہوں تو یہ عطیات ان کا معاوضہ ہوں گے اگر معذور ہیں تو آج کل کی اصطلاح کے مطابق یہ ان کی پنشن ہو گی۔ سن رسیدہ اور معمر صحابہ سب کے سب پنشن کے حقدار ہیں اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ غزوات میں شرکت کی، لیکن ان کے علاوہ جو مسلمان ہیں جنھوں نے

جہاد نہیں کیا، معرکوں میں شریک نہیں رہے ان کا ان عطیات میں کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس طرح حضرت عثمان رض کی مالی سیاست نے باغیوں کو مجبور کردیا کہ وہ حضرت عثمان رض کے مسلک میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہوں اور جب حضرت عثمان رض حضرت عمر رض کی راہ سے اس قدر ہٹے کہ سرمایہ داروں کا طبقہ پیدا کردیا تو باغیوں کے لیے حرج نہ تھا کہ وہ ان کا اور ان کے گورنروں کا ہاتھ پکڑتے خواہ اس میں حضرت عمر رض کے مسلک سے کچھ اختلاف ہی ہوتا۔ اس لیے کہ جب ایثار کی راہ چھوڑ کر مطلب ہی کا راستہ چلنا ہے تو کیوں نہ کم ازکم ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں مطلب کے ساتھ ساتھ عدل وانصاف کی کچھ نہ کچھ تو رعایت ہوتی ہو اور سرمایہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو جاتا ہو جن کے ہاتھوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر یہ دولت پیدا کی ہے۔ پھر سب سے زیادہ اہم نکتہ جو باغیوں کے مطالبے میں ہے وہ یہ کہ حضرت عثمان رض کی پیدا کردہ سرمایہ داری میں جس قدر عمومیت اور عدل سما سکے اس کی گنجائش نکال جائے، انھوں نے دیکھا کہ قریش کے نوجوان اور مدینہ کے لوگ زیادہ تر عطیات کے سہارے بے کاری کی زندگی جی رہے ہیں انکو عطیوں کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس لیے انھوں نے کہا ان میں سے جو مالدار ہے بیت المال میں اس کا کوئی حق نہیں، اور جو مفلس ہے اس کو کام کرکے اپنی روزی کمانی چاہیئے، عوام کا مال بیکاروں اور نکموں پر خرچ کرنا کوئی بھی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت عثمان رض نے باغیوں کے اس مطالبے کو تسلیم کیا اور خطبہ دیتے ہوئے لوگوں سے کہا: جس کے پاس کھیت ہو اس کو کاشت میں لگ جانا چاہیئے اور جس کے پاس کوئی دھندا ہو اس کو اس کے ذریعے اپنی روزی کمانا چاہیئے۔ ہمارے پاس مجاہدوں اور بزرگ صحابہ رض کے سوا کسی کے لیے عطیہ نہیں ہے:

لیکن حضرت عثمان رض اپنے اس پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ فتنہ اور فساد ان کی راہ میں حائل ہوگیا، اگر حضرت عثمان رض عوام کے مال میں حضرت عمر رض کے طریقے پر عمل کرتے اور اخراجات میں حق اور انصاف ملحوظ رکھتے تو اپنے آپ کو اور مسلمانوں کو شر عظیم سے بچا لیتے اور اسلام انسانیت کے لیے ایک ایسا باصلاحیت سیاسی اور سماجی نظام پیدا کرسکتا جو اس کو بہت سی آویزشوں اور خرابیوں سے بچا لیتا جن میں وہ الجھ کر مبتلا ہوگئی، لیکن زندگی کے موثرات اور اسباب حضرت عثمان رض سے زیادہ قوی تھے، اور کون جانتا ہے کہ اگر موت جلدی نہ کرتی تو حضرت عمر رض کا بھی بس چلتا یا نہیں؟۔

حضرت عثمان رض اور مخالفین

مخالفوں اور معترضوں کے ساتھ حضرت عثمان رض کا برتاؤ بھی مسلمانوں کی برہمی اور بیزاری کا ایک سبب ہے۔ اس معاملے میں حضرت عثمان رض کی روش حضرت عمر رض سے بڑا فرق رکھتی ہے۔ حضرت عمر رض نے اپنے گورنروں کو جس قدر تاکید اس کی فرمائی کہ وہ لوگوں کو اپنا غلام نہ بنائیں، ان کو ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا ہے، اتنی کسی بات کی نہیں کی، انھوں نے اپنے حاکموں کو رعایا پر جبر و زیادتی کرنے سے، مارنے پیٹنے سے جس سختی کے ساتھ روکا، کسی اور بات سے نہیں روکا۔ چنانچہ وہ مقررہ حد کے اندر ہی مارنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنے گورنروں کو اگر انھوں نے ناحق مارا ہے یا حد سے زیادہ مارا ہے ہرگز معاف نہیں کرتے تھے۔ لیکن حضرت عثمان رض حد سے بڑھ گئے اور اپنے گورنروں کو رعایا پر تشدد کرنے کا، مارنے پیٹنے کا، جلاوطن کرنے کا اور قید کرنے کا موقع دیا اور خود انھوں نے دو جلیل القدر صحابی رض کو مارا یا مارنے کا حکم دیا۔ عمار بن یاسر رض کو اتنا مارا کہ وہ فتق کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ عبداللہ بن مسعود رض کو مسجد نبوی سے اس بری طرح نکلوایا کہ ان کی بعض پسلیاں ٹوٹ گئیں، اہل سنت اور معتزلہ خواہ کتنی ہی جواب دہی کریں لیکن حضرت عثمان رض بہرحال حدود سے متجاوز ہیں، مذکورہ بالا دونوں صحابیوں نے حضرت عثمان رض پر جیسی بھی تلخ تنقید کی ہو اور جیسے بھی اعتراضات ان پر کیے ہوں، لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ان پر مقدمہ چلایا گیا ہو، ان کے خلاف ثبوت بہم پہنچائے گئے ہوں۔ ان کو اپنی مدافعت میں صفائی کا موقع دیا گیا ہو۔ حضرت عثمان رض نے ان کے بارے میں اپنے حاکموں کی سن لی، اپنے مقربوں کا کہا مان لیا اور بلا دلیل ان کو سزائیں دیں، ان کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ معتزلہ اور اہل سنت مدافعت میں کہتے ہیں کہ امام کو سزا دینے کا حق ہے۔ قطعاً امام حقدار ہے لیکن اس میں فرد جرم کی، شہادت کی اور صفائی کے بیان کی شرط ہے اور ہم نہیں جانتے کہ عمار بن یاسر رض اور عبداللہ بن مسعود رض کو حضرت عثمان رض نے عدالت میں پیش کیا، خود حضرت عثمان رض نے ابوذر رض کو تنگ کیا، جلاوطن کیا یا جلاوطن ہونے پر مجبور کیا اور محض اس لیے کہ ان کو حضرت عثمان رض کی وہ مالی پالیسی پسند نہ تھی جو انھوں نے عوام کے مال کے بارے میں اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اس نظام اجتماعی کے مخالف تھے جس نے دولت مندوں کا طبقہ پیدا کیا اور جس نے ان کو چاندی سونا اور بے حد مال جمع کرنے کا موقع دیا۔ پھر حضرت عثمان رض نے اپنے حاکموں کو اجازت دی کہ وہ مخالفت میں آواز اٹھانے

والوں کو ان کے شہروں سے نکال باہر کریں، چنانچہ انھوں نے ایک جماعت کو در بدر پھرایا، سعید نے امیر معاویہ رض کے پاس بھیجا، امیر معاویہ رض نے سعید کے پاس واپس کیا، پھر سعید نے ان کو عبدالرحمن بن خالد کے حوالے کیا اور یہ سب کچھ بلا مقدمہ چلائے، بلا شہادتیں پیش کیے اور بلا صفائی کا موقع دیئے، حضرت عثمان رض نے عبداللہ بن عامر کو اجازت دی کہ عامر بن عبدالقیس کو شام جلاوطن کردے، امیر معاویہؓ نے یہ معلوم کرتے ہی کہ آنے والا مظلوم ہے اور اس کے خلاف دروغ بیانی کی گئی ہے، چاہا کہ اس کو فوراً بصرہ واپس کردیں لیکن عامر نے خود منظور نہیں کیا۔ عبداللہ بن ابی سرح کی جرأت دیکھیئے اس نے اپنی شکایت کرنے والوں میں سے ایک کو اس قدر مارا کہ وہ مر ہی گیا، تب مہاجر، انصار اور خود ازواج مطہرات مجبور کی گئیں کہ حضرت عثمان رض سے مصریوں کے ساتھ انصاف کرنے پر اصرار کریں، چنانچہ آپ نے اس کا ارادہ بھی کرلیا لیکن نہ کرسکے۔

یہ انتہائی سخت گیر پالیسی جو خلیفہ اور اس کے حاکموں نے لوگوں کے امن و آزادی پر اور لوگوں کی جانوں پر مسلط کردی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کی سیرت سے اس کو کوئی نسبت نہیں، بعض نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کردی تھی اور کہا تھا اعدل یا محمد فانک لم تعدل[۱۵]۔ ایک بار کہا، دوبار کہا اور جب تیسری بار کہا تو حضرت نے صرف یہ کہا، افسوس تجھ پر اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ معترض کی خبر لیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے روک دیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عثمان رض کے زمانے میں ایسے حالات پیدا کردیئے جو پہلے نہ تھے پس حضرت عثمان رض نے حالات کے مطابق قدم اٹھایا۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسی زیاد نے عراق والوں سے کہی تھی۔ وہ کہتا ہے تم نے ایسے حالات پیدا کردیئے جو پہلے نہ تھے۔ ہم نے بھی ہر جرم کے لیے نئی سزا پیدا کرلی۔ حیرت کی بات ہے کہ حضرت عثمان رض اور ان کے گورنروں کی سیاست ہم کو زیاد کی سیاست کی یاد ایک سے زیادہ مرتبہ دلاتی ہے۔

اب جبکہ ہم واقعات اور واقعات پر متکلمین کے خیالات پیش کرچکے ہیں ہم کو موقع ہے کہ فتنے پر براہ راست نظر ڈالیں اور اس کی ابتدا سے لے کر آخری مرحلے تک پہنچیں جہاں یہ سانحۂ خونیں پیش آتا ہے اور خلیفہ دھوکے نہیں، جبر اور زبردستی سے قتل کردیا جاتا ہے۔

---

[۱۵] محمدؐ! انصاف کرو آپ نے انصاف نہیں کیا۔

معاصرین کی رائے میں تبدیلی

تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کا بڑی خوشی اور اطمینان کے ساتھ استقبال کیا۔ اس لیے کہ انھوں نے حضرت عمر رضؓ کی پیدا کردہ شدت اور تنگی میں سہولت اور وسعت پیدا کردی۔ ناظرین اس سے قبل پڑھ چکے ہیں کہ خلیفہ ہوتے ہی آپ نے لوگوں کے وظیفوں میں اضافہ کردیا اور ان کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کیا، پھر عطیات کی عنایت کرکے انھیں وہ خوشحالی اور فراخی بخشی جو حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں نصیب نہ تھی اور قریش نے تو خاص طور پر ایسی آزادی محسوس کی جو اس سے پہلے ان کو حاصل نہ تھی اس لیے کہ حضرت عثمان رضؓ فاروق اعظم رضؓ کی طرح حرہ کی گھاٹی پر قریش کی گردن پکڑے کھڑے نہیں رہے کہ ان کو دوزخ کی آگ میں ٹوٹے پڑنے سے روکے رکھیں بلکہ درمیان سے ہٹ گئے اور قوموں کو شہروں اور صوبوں میں جہاں چاہے پھیلنے دیا۔ مورخین کا قریب قریب متفقہ بیان ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال امن اور عافیت سے گذرے، اس کے بعد جیسے ہی دوسرا دور شروع ہوا، دشواریاں اور مشکلات سر اٹھانے لگیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چھ سال تک تو مسلمان حضرت عثمان رضؓ سے خوش رہے۔ اس کے بعد چار سال تک گرانی کا دور رہا اور دسویں سال کے بعد سے تنگ آجانے کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ شروع شروع میں لوگوں نے نرمی برتی، پھر کچھ تیزی آگئی اور اس کے بعد تشدد کا دور آیا جو بڑھتے بڑھتے ناگواری کے آخری مرحلے تک پہنچ گیا اور خلیفہ کی جان تک لے لی گئی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شروع کے دس برس میں حضرت عثمان رضؓ کو کسی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ مخالفت تو خلافت کے پہلے ہی دن عبیداللہ بن عمر رضؓ کے قضیے کے ساتھ وجود میں آگئی۔ لیکن مقصد یہ ہے کہ خطرناک مخالفت آخر کے دو سال میں سامنے آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب سے بئر اریس میں حضرت عثمان رضؓ کے ہاتھ سے اللہ کے رسولؐ کی انگوٹھی گر پڑی، لوگوں کے دلوں میں برا خیال بڑھتا گیا۔ یہ انگوٹھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تھی، صدیق اکبر رضؓ اور فاروق اعظم رضؓ کو وراثت میں ملی تھی۔ وہ حکومت کے تمام فرمانوں پر اس کو لگاتے تھے اور اس میں خیر و برکت پاتے تھے اور اس کو ایک اہم ورثہ خیال کرتے تھے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو لگاتے اس حیثیت سے لگاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں، آپ ہی کا طریقہ جاری کرتے ہیں، آپ ہی کی راہ پر چلتے ہیں، آپ ہی کی مہر سے

دستخط کرتے ہیں، حضرت عثمان رض کو یہ انگوٹھی حضرت عمر رض سے ملی اور حضرت عمر رض کو حضرت ابوبکر رض سے اور حضرت ابوبکر رض کو خلیفہ ہونے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے ملی۔ جب یہ حضرت عثمان رض کے ہاتھ سے کنوئیں میں گر گئی۔ مسلمانوں نے اس کے نکالنے کی بڑی کوشش کی، بہت ڈھونڈا لیکن کنوئیں میں پانی کم ہونے کے باوجود کسی کو نہ ملی۔ اس لیے مسلمانوں کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ اور بدشگونی کے خیالات دلوں میں آنے لگے۔ خود حضرت عثمان رض کو بڑا قلق ہوا، پھر آپ نے اسی انگوٹھی کی طرح ایک نئی انگشتری بنوائی اور اس پر پہلے کی طرح "محمد رسول اللہ" کا نقش بنوایا۔ لیکن یہ نئی انگوٹھی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رض کی انگلیوں نے نہیں چھُوا، ایک بناوٹی انگوٹھی تھی، جس سے کوئی روایت وابستہ نہیں جسے اب تک کسی کام میں نہیں استعمال کیا گیا۔ کہنا چاہیئے کہ اس انگوٹھی کے استعمال سے حضرت عثمان رض نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رض وہ پہلے دلیر ہیں جنھوں نے حضرت عثمان رض کے حکم میں مداخلت کی اور لوگوں کا حوصلہ بڑھایا۔ ہوا یہ کہ بعض وصول کرنے والے صدقات کے اونٹ لائے۔ حضرت عثمان رض نے یہ اونٹ حکم کے بعض عزیزوں کو بخش دیا۔ جب عبدالرحمٰن بن عوف رض کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے کچھ صحابہ رض کو بلایا اور ان کو بھیج کر وہ اونٹ واپس منگوا لیے اور لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ حضرت عثمان رض گھر میں تھے اور کچھ نہیں کیا اور نہ کہا، خود عبدالرحمٰن رض اور ان کے ساتھیوں سے کچھ بھی نہیں کہا۔ عبدالرحمٰن رض اور ان کے ساتھیوں کی یہ حرکت حقیقت میں بڑی خطرناک تھی، کیونکہ یہ خلیفہ کے حکم میں تبدیلی کے مترادف تھی، لیکن حضرت عثمان رض کا خاموش رہنا اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا یعنی غلطی کا اعتراف اور شان میں کمی۔

حضرت عثمان کے خلاف جُرأت

اس کے بعد لوگ حضرت عثمان رض کے مسلک میں بجا طور پر یا غلطی سے جو بات بھی ناپسند کرتے اس کا اظہار کرنے لگے۔ بعضوں نے تو اس میں بھی حرج نہیں سمجھا کہ لوگوں کے سامنے حضرت عثمان رض کی موجودگی میں ان کی مخالفت کریں اور کچھ لوگ نافرمانی کی بھی جرأت کرنے لگے۔ ابوذر رض کو حضرت عثمان رض نے دولت مندوں کی مذمت سے روکا۔ لیکن انھوں نے یہ حکم نہیں مانا اور کہہ دیا "عثمان رض کو ناراض کر کے خدا کو راضی کرنا میرے نزدیک اچھا ہے اس سے کہ عثمان رض کی مرضی کے لیے خدا کو ناراض کروں"

ولید بن عقبہ کا معاملہ بھی خلافت کے رعب وادب کے خلاف تھا۔ یہ بات کچھ خلیفہ کے شایانِ شان نہ تھی کہ اس کے ایک گورنر پر شراب پینے کا الزام ثابت ہو جائے اور وہ اس پر حد جاری کرنے اور اس کو برطرف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر اِدھر اُدھر لوگ آپس میں رائے زنی کرتے ہوئے کہیں کہ حضرت عثمان رض نے سعید کو ہٹا کر ولید کا تقرر کر کے غلطی کی، ایک تو وہ ان کا رشتہ دار تھا اور دوسرے گورنری کے قابل بھی نہ تھا۔

اس کے بعد شہروں میں مخالفت کی تحریک زور پکڑنے لگی جس کی صدائے بازگشت مدینے تک پہنچی۔ اور مدینے میں مخالفت کی خبریں شہروں میں پھیلیں جس سے مخالفین کو طاقت ملی اور حضرت عثمان رض مجبور ہوئے کہ مدینے میں معترضوں کو ڈرائیں دھمکائیں اور شہروں میں اخراج اور جلاوطنی کے احکام جاری کریں، ڈرانے دھمکانے میں بعض اوقات حضرت عثمان رض آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ ۳۴ھ میں حضرت عثمان رض کے ہاتھوں لوگوں کو جو کچھ پہنچا اس سے زیادہ بُرا سلوک شاید ہی کسی نے کسی کے ساتھ کیا ہو، صحابہ رض یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور سنتے تھے اور بجز زید بن ثابت رض، ابواسید ساعدی رض، کعب بن مالک رض اور حسان بن ثابت رض کی چھوٹی سی جماعت کے کوئی نہ منع کرتا تھا اور نہ مدافعت کرتا تھا۔ ہاں مدینہ کے صحابہ رض نے مختلف سرحدوں پر پھیلے ہوئے صحابیوں رض کو خطوط لکھے کہ مدینہ آکر خلافت کے بگڑے ہوئے کاموں کو ٹھیک کرو۔ تم جہاد کی خاطر گھروں سے نکلے ہو لیکن جہاد تمھارے پیچھے ہے۔ تم دین کی بقا اور حفاظت کے لیے مدینہ واپس آجاؤ۔ اقتدار دین کے لیے ایک شرِ عظیم بن چکا ہے۔ لوگ جگہ جگہ جمع ہو کر ہونے والے واقعات اور پیش آنیوالے مصائب کا تذکرہ کرنے لگے۔ حضرت عثمان رض پر اعتراضات کی اور الزامات کی بھرمار ہوئی اور لوگوں نے حضرت علی رض کو مجبور کیا کہ وہ حضرت عثمان رض کے پاس جائیں اور ان سے گفتگو کریں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت علی رض گئے اور حضرت عثمان رض سے کہا۔ مجھے لوگوں نے بھیجا ہے اور آپ کے متعلق بہت سی باتیں کہی ہیں۔ واللہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ سے کیا کہوں! میں تو کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس سے آپ واقف نہ ہوں۔ نہ آپ کو کوئی ایسی بات بتا سکتا ہوں جس کو آپ نہ جانتے ہوں۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہے آپ یقیناً اس سے واقف ہیں۔ کسی بات میں ہم مسبوق نہیں کہ اس کی اطلاع آپ کو دیں نہ ہم سے کوئی چیز خلوت میں خاص کردی گئی جو آپ کو پہنچا دیں، آپ کو چھوڑ کر ہم میں کوئی بات نہیں۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ان کی باتیں سنیں، ان کی صحبت میں رہے۔ ان کی دامادی کا شرف پایا۔ ابن ابی قحافہ (ابوبکر رض) کسی عمل حق میں آپ سے آگے نہیں، ابن خطاب (عمر رض) کسی بھلائی میں آپ سے بہتر نہیں

رشتہ داری کے اعتبار سے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی میں جو درجہ آپ کو حاصل ہے وہ دونوں کو نہیں۔ اور نہ وہ کسی بات میں آپ سے آگے ہیں۔ پس اپنے معاملے میں آپ خدا کو سامنے رکھیے، واللہ! کہ آپ کو کچھ دکھلانے اور بتانے کی ضرورت نہیں، راستہ روشن ہے اور صاف۔ دین کے آثار برقرار ہیں۔ عثمانؓ! جان لو ہدایت اور اخلاق میں سب سے زیادہ صاحبِ فضل خدا کے نزدیک وہ عادل خلیفہ ہے جس نے جانی بوجھی سنت کو برقرار رکھا، اور چھوڑی ہوئی بدعت کو مٹایا۔ بخدا تمام باتیں صاف صاف ہیں سنتوں اور بدعتوں کے نشانات جدا جدا ہیں خدا کے نزدیک سب سے برا آدمی ظالم امام ہے جو خود گمراہ ہے اور دوسروں کی گمراہی کا باعث، وہ سنت کو مٹاتا اور بدعتِ متروک کو زندہ کرتا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا۔ "قیامت کے دن ظالم امام کو بے یار و مددگار لایا جائے گا اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور وہ چکی کی طرح اس میں چکر لگائے گا۔ پھر وہ جہنم کی گہرائی میں پھینک دیا جائے گا" میں آپ کو اللہ سے اس کی قوت اور انتقام سے ڈراتا ہوں۔ اس کا عذاب شدید دردناک ہے، خبردار کہیں اس امت کے مقتول امام نہ بن جانا۔ اس لیے کہ کہا جاتا ہے کہ اس امت میں سے ایک امام قتل کیا جائے گا جو قوم پر قیامت تک قتل و قتال کا دروازہ کھول دے گا۔ معاملات مشتبہ کر کے لوگوں کو جماعتوں میں منتشر کر دے گا، باطل کی بلندی کی وجہ سے لوگ حق کو نہ دیکھ سکیں گے اور حیران و سرگرداں رہیں گے۔[1]

معلوم نہیں حضرت علی رضؓ کی یہ گفتگو انھیں الفاظ میں حضرت عثمان رضؓ تک پہنچی یا اس کے قریب المعنیٰ الفاظ میں، لیکن اصل مقصد تو یہ ہے کہ مدینہ میں حضرت عثمان رضؓ کی مخالفت اِدھر اُدھر کی انفرادی حد سے آگے بڑھ چکی تھی اور باقاعدہ منظم شکل میں مقررہ مقصد کے ماتحت براہ راست حضرت عثمان رضؓ تک پہنچ چکی تھی۔ اور اب انتظار تھا کہ دربارِ خلافت سے کیا جواب ملتا ہے۔ پس کہنا چاہیے کہ مخالفت کی تحریک آج کل کی ہماری اصطلاح میں منفی مقاومت سے ترقی کر کے ایجابی بن چکی تھی۔ حضرت عثمان رضؓ نے حزبِ مخالف کے نمائندے کی باتیں سنیں اور جواباً کہا جو کچھ آپ کہتے ہیں بخدا مخالفین بھی یہی کہتے ہوں گے۔ اگر میری جگہ آپ ہوتے تو قسم خدا کی میں آپ پر کڑی نکتہ چینی نہ کرتا۔ نہ آپ کو مخالفین کے حوالے کرتا۔ آپ میں عیوب نکالتا اور نہ آپ کی نگاہ میں یہ کوئی بری بات ہوتی کہ میں نے صلہ رحمی کی، غریبی اور محتاجی دور کی، بے کسوں کو پناہ دی، ان لوگوں کو والی بنایا جو عمرؓ کے گورنروں کے مشابہ تھے۔ قسم سے کہو علیؓ! کیا تم کو معلوم ہے کہ مغیرہ بن شعبہ میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

---

[1] تاریخ طبری واقعات ۳۴ھ

حضرت علی رضؓ	جی ہاں
حضرت عثمان رضؓ	اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ عمرؓ نے ان کو والی بنایا تھا۔
حضرت علی رضؓ	جی ہاں جانتا ہوں۔
حضرت عثمان رضؓ	پھر مجھ کو الزام کیوں دیتے ہو، اگر میں نے ابن عامر کو قرابت کے پیش نظر والی بنا دیا۔
حضرت علی رضؓ	میں آپ کو بتاؤں؛ عمرؓ بن خطاب جس کو بھی والی بناتے اس کے کان پر سوار رہتے، ایک حرف بھی اس کے خلاف سن پاتے تو اسی وقت طلب کرتے اور بات ٹھکانے تک پہنچا دیتے اور آپ ایسا نہیں کرتے آپ اپنے رشتہ داروں کے لیے نرم ہیں، ان سے دبتے ہیں۔
حضرت عثمان رضؓ	وہ آپ کے رشتہ دار ہیں۔
حضرت علی رضؓ	میری زندگی کی قسم! ان سے میرا رشتہ بہت زیادہ قریب کا ہے۔ لیکن آپ کی نظر عنایت دوسروں پر ہے۔
حضرت عثمان رضؓ	آپ جانتے ہیں کہ عمرؓ اپنے پورے دور خلافت میں معاویہؓ کو حاکم بنائے رہے تو میں نے بھی ان کو حاکم رکھا۔
حضرت علی رضؓ	قسم سے کہیئے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ عمرؓ کا غلام یرفا جتنا ان سے ڈرتا تھا، معاویہؓ اس سے کہیں زیادہ عمرؓ سے ڈرتے تھے۔
حضرت عثمان رضؓ	ہاں ٹھیک ہے۔
حضرت علی رضؓ	اور آپ کا یہ حال ہے کہ معاویہؓ آپ سے بلا مشورہ کیے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ خلیفہ کا حکم ہے، اور یہ آپ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی معاویہؓ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔[1]

یہ مختصر سا مکالمہ، مخالفت کی تحریک کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتا ہے اور اس کے تمام گوشوں کو واضح کر دیتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں لوگوں کو حضرت عثمان رضؓ کی کس کس بات پر اعتراض تھا اور حضرت عثمان رضؓ کے پاس اعتراضوں کا جواب کیا تھا۔ حضرت عثمان رضؓ پر اعتراض یہ ہے کہ وہ عطیات اور عہدے میں اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے حاکموں سے جو انھیں کے رشتہ دار ہیں

---

[1] تاریخ طبری واقعات ۳۴ھ

دیتے ہیں۔ حضرت عثمان رض کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے رشتہ داروں کی امداد، مفلسوں کی خدمت اور بے بسوں کی دست گیری کے علاوہ کچھ نہیں کیا اور یہ کہ گورنروں کے تقرر میں حضرت عمر رض کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ حضرت عمر رض نے مغیرہ بن شعبہ کو حاکم بنایا تھا۔ حالانکہ ان میں کوئی خاص بات نہ تھی اور معاویہ رض کو آخر تک باقی رکھا تھا۔ حضرت علی رض کا جواب یہ ہے کہ عمر رض اپنے گورنروں پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ غلطی پر مواخذہ کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضرت عمر رض کے غلام یرفا سے کہیں زیادہ خود معاویہ رض حضرت عمر رض سے ڈرتے تھے، پھر دونوں آدمی کسی بات پر متفق نہ ہو سکے اور گفتگو بلا نتیجہ ختم ہو گئی، ہاں حضرت عثمان رض نے حضرت علی رض پر اپنے غصے کا اظہار کر دیا۔ ان کو اپنا عیب جو، معترض اور دشمن کے حوالے کرنے والا کہہ دیا حالانکہ باہمی رشتہ داری کا تقاضا تھا کہ وہ رعایت سے کام لیتے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رض نے ضروری سمجھا کہ اجتماعی طور پر اس مخالفت کا مقابلہ کریں اور لوگوں کو ڈرائیں دھمکائیں، چنانچہ باہر نکلے اور مسجد میں جاکر منبر نبویؐ سے خطبہ دیا۔ اما بعد! ہر چیز اور ہر کام کے لیے ایک آفت اور ایک مصیبت ہوتی ہے۔ اس امت کی آفت اور اس نعمت کی مصیبت عیب لگانے والے اور طعن و تشنیع کرنے والے ہیں، وہ دلوں میں تمھارے خلاف جذبات رکھ کر بتاؤ ایسا کرتے ہیں جس سے تم خوش ہو سکو، شتر مرغ کی طرح پہلی آواز کے پیچھے ہو لیتے ہیں، دور کا گھاٹ پسند کرتے ہیں، گدلے پانی پر اترتے ہیں اور ناگواری سے پیتے ہیں، ان کا کوئی پیش رو نہیں۔ معاملات نے ان کو عاجز کر دیا ہے۔ روزی پیدا کرنا ان پر دشوار ہو گیا ہے، اے لوگو! تم کو ابن خطاب رض کے لیے جو باتیں منظور تھیں انھیں کو میرے لیے عیب اور اعتراض جانتے ہو۔ انھوں نے تم کو ٹھوکر لگائی، ہاتھ سے مارا، زبان سے ذلیل کیا اور تم خوشی ناخوشی برداشت کرتے رہے اور میں نے تمھارے ساتھ نرمی برتی۔ اپنے کاندھے پر بٹھایا۔ اپنا ہاتھ۔ اپنی زبان تم سے روکی تو تم مجھ پر یہ جرأت دکھاتے ہو۔ خدا کی قسم! میری اجتماعی قوت زیادہ ہے۔ میرے حامی مجھ سے بالکل قریب ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں، اگر میں ان کو آواز دے دوں تو ابھی دوڑ پڑیں۔ میں نے تمھارے لیے مقابل تیار کر رکھے ہیں، ان کو زیادہ دیا ہے، اپنا دانت میں نے تم پر تیز کیا ہے۔ تم مجھ میں ایسی برائیاں نکالتے ہو جو مجھ میں نہیں ہیں۔ ایسی باتیں میرے متعلق کہتے ہو جو میں نے زبان سے نہیں نکالیں پس اپنی زبانیں روک لو۔ طعن و تشنیع چھوڑ دو۔ اپنے حاکموں کو عیب لگانے سے باز آجاؤ۔ میں نے تم سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور ہاں یہ تو بتاؤ تمھارا کیا حق مارا گیا۔ تقسیم کے بعد مال میں سے کچھ بچ رہا تو کیا اس بچے ہوئے مال میں بھی مجھے کچھ کرنے کا اختیار نہیں تو پھر میں خلیفہ کیا، مروان بن الحکم نے کچھ کہنا چاہا لیکن حضرت عثمان رض نے ڈانٹ کر بٹھا دیا اور کہا، معاملہ میرا اور میرے ساتھیوں کا ہے، تم کو درمیان میں بولنے کی کیا ضرورت؟ میں نے تم کو

پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بیچ میں تم کچھ نہ کہنا۔[1]

حضرت عثمان رضؓ کے پورے دور خلافت میں یہ ان کا سب سے زیادہ تیز گرم اور سخت خطبہ ہے۔ خود ان کو بھی اس کی تیزی کا احساس تھا اور انھوں نے اپنی نرم طبیعت کے مناسب معذرت کی اور کہا "تم مجھ میں ایسی برائیاں اور باتیں نکالتے ہو جو مجھ میں نہیں اور جو میں نے زبان سے نہیں نکالیں" ابھی خطبہ پورا ہوا بھی نہیں تھا کہ نرمی کی اس حد پر آگئے جو آپ کی سیرت کا حصہ ہے اور مروان سے کہہ دیا کہ بات میری اور میرے ساتھیوں کی ہے یعنی وہ اپنے مخالفوں سے نہیں بلکہ دوستوں سے باتیں کر رہے ہیں اور اس لیے تیزی اور سختی دکھا رہے ہیں۔ کہ ان کے دوستوں نے بھی ان کے ساتھ شدت سے کام لیا ہے اور ان کو آپے سے باہر کر دیا۔ حلیم الطبع انسان غصہ ہوتا ہے لیکن فوراً ہی چشم پوشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو اس کی عادت ہے۔

حضرت عثمان رضؓ کا اپنے دوستوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ عیب لگانے والوں کی سنتے ہیں جو زبان سے تو خوش کرنے والی باتیں کرتے لیکن دل میں تکلیف پہنچانے والے خیالات مخفی رکھتے تھے جو خلیفہ کے بارے میں غلط اور گمراہ کن باتیں پھیلاتے اور ایسی امیدیں دلاتے جن کے بر آنے کی کوئی صورت نہ تھی حضرت عثمان رضؓ اپنی اس گفتگو میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ حزب مخالف کے اعضاء ہیں اور آپ کے خلاف جسارت کرتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں تاکہ اپنی دیرینہ آرزو جس کے بہت عرصہ سے منتظر ہیں پوری کریں۔ لازمی طور پر یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق حضرت عثمان رضؓ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے لیے خلافت کا منصب چاہتے ہیں، ان کے علاوہ عمار بن یاسر رضؓ جیسے اور دوسرے بعض مہاجر اور انصار بھی ہو سکتے ہیں جو حضرت عثمان رضؓ سے کھلا اختلاف رکھتے تھے۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضؓ اپنے دوستوں سے فرماتے ہیں کہ میری جن باتوں پر آج اعتراض ہے، کل وہی عمر رضؓ کرتے تھے تو کوئی اعتراض نہ تھا اس لیے کہ انھوں نے سختی سے کام لیا اور لوگ ڈر گئے اور میں نے نرمی برتی اس لیے میرے اوپر لوگ دلیر ہو گئے ہیں، اس کے بعد مخالفین کو دھمکاتے ہوئے فرماتے ہیں، میرے ساتھ لوگوں کی طاقت ہے۔ میرے حامی میرے قریب ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں اور حکم کے منتظر ہیں، اس میں شک نہیں اس دھمکی میں حضرت عثمان رضؓ اپنے ان حریفوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو قوت اور شوکت میں ان کے برابر نہیں، واقعہ یہ ہے کہ بنی امیہ عدداً بھی زیادہ تھے اور قریش کے تمام قبیلوں سے زیادہ حضرت عثمان رضؓ کے حامی اور مددگار بھی۔ آگے چل کر پھر حضرت عثمان رضؓ اپنے دوستوں کو مخاطب کرتے ہیں

---

[1] تاریخ طبری واقعات ۳۴ھ

اور کہتے ہیں، تم کو غصہ میری کس بات پر ہے! میں نے تمہارا حق پورا پورا ادا کیا، ابوبکرؓ اور عمرؓ جو کچھ دیتے تھے میں نے اس میں کوئی کمی نہیں کی۔ بیت المال کے سلسلے میں فرمایا۔ بچے ہوئے مال میں کیا مجھے اتنا کرنے کا بھی اختیار نہیں؛ پھر میں خلیفہ کس بات کا؛ حضرت عثمان رض کا مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے بیت المال سے مسلمانوں کا حق ادا کر دیا تو باقی ماندہ مال میں ان کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ منصب خلافت ان کو اس کا حقدار بناتا ہے، کسی اور کو اس میں برا ماننے کی یا اس میں داخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس کہنا چاہیے کہ حضرت عثمان رض اور ان کے مخالفین کے مقابلے کا پہلا مرحلہ طے ہوگیا۔ معترضوں نے مخالفت کی، اپنی مخالفت کو منظم کیا، خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کر دیا۔ خلیفہ نے اعتراض کا جواب دیا پھر مجمع عام میں خطبہ دیا ڈرایا دھمکایا اور سخت تاکید کی آخر میں نرمی کا بھی اظہار کیا لیکن اپنی جگہ جمے رہے ایک انچ بھی نہیں ہٹے۔ مخالفین بھی اپنی جگہ قائم رہے اور ٹس سے مس نہیں ہوئے لیکن گرد و پیش کے حالات حضرت عثمان رض اور ان کے مخالفین سے زیادہ شدید تھے۔ مخالفت اپنی جگہ باقی رہی۔ مخالفین کو صوبوں سے خبریں ملیں کہ شہروں میں مخالفت کی تحریک مدینہ سے کہیں زیادہ زوروں پر ہے۔ حضرت عثمانؓ نے فاروق اعظم رض کی اتباع کی اور اپنی خلافت کے پورے دور میں لوگوں کے ساتھ حج کیا۔ صرف پہلے سال بیمار ہونے کی وجہ سے اور آخری سال محصور ہونے کی وجہ سے حج میں شرکت نہیں کر سکے آپ ہر سال حج کے موقع پر اپنے گورنروں سے ملتے، ان سے حالات سنتے اور انھیں ہدایتیں فرماتے۔ جب ۳۴ھ میں آپ نے اپنے حاکموں سے ملاقات کی تو ان کو مشورہ کی غرض سے اکٹھا کیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے عمرو بن العاص کو بھی بلایا تھا۔ لیکن مجھے اس میں شک ہے اس لیے کہ ۳۴ھ میں عمرو بن العاص آپ کے گورنر نہ تھے۔ پھر یہ کہ جب سے آپ نے ان کو مصر سے معزول کر دیا وہ آپ کے خیر خواہ نہ تھے۔

عمرو بن العاص رض کا نام راویوں نے اس مشورے میں اس لیے منتخب کر دیا کہ انھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف جو چالاکی اور چالبازی کی باتیں کی ہیں۔ اس پر خامہ فرسائی کر سکیں۔ غالب گمان تو یہ ہے کہ اس مجلسِ مشورہ میں یہی چار گورنر جو اہم صوبوں پر حکومت کرتے تھے شریک ہوئے۔ یعنی امیر معاویہ رض عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عبداللہ بن عامر، اور سعید بن العاص؛ جب یہ لوگ جمع ہوئے تو حضرت عثمانؓ نے کہا۔ ہر امام کے وزراء ہوتے ہیں، آپ لوگ میرے وزیر ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ لوگ مجھ سے کس طرح کھنچے ہوئے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ میں اپنے گورنروں کو برطرف کر دوں۔ اب آپ حضرات مجھے مشورہ دیجیے کہ میں اس سر اٹھانے والے فتنے کے بارے میں کیا کروں؟ امیر معاویہ رض نے کہا کہ

گورنروں کو ان کے صوبوں میں واپس بھیج دیجیئے، ان کی قابلیت اور مقدرت کے پیش نظر ان پر اعتماد کیجیے کہ وہ تدبر کے ساتھ اپنے اپنے صوبوں کو سنبھالیں۔ امام کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کو چُن لیا ہے۔ سعید بن عامر نے مشورہ دیا کہ حزبِ مخالف کے لیڈروں اور فتنہ وفساد کے بانیوں کو قتل کر دیا جائے۔ عبداللہ بن سعد رضہ نے رائے دی کہ لوگوں کو بیت المال کی راہ سے رضامند کیا جائے ان کو عطیات دیئے جائیں اور ان پر قبضہ رکھا جائے۔ عبداللہ بن عامر نے اپنا یہ خیال پیش کیا کہ لوگوں کو جہاد پر بھیج دیا جائے۔ جنگ ان کو سرحدوں پر کافی عرصے تک مشغول رکھے گی۔ حضرت عثمان رضہ نے اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ آپ نے گورنروں کو واپس کر دیا اور ان کو تاکید کر دی کہ وہ اللہ کے حقوق میں شدت برتیں اور اپنا طرزِ عمل ٹھیک رکھیں اور رعایا پر پوری نگرانی رکھتے ہوئے ان کو جہاد پر بھیجیں اور جس کی طرف سے بھی کسی ٹیڑھ کا پتہ چلے اور ان کا وظیفہ بند کر دیں، اس کے بعد حضرت عثمان رضہ مدینہ واپس آئے، امیر معاویہ رضہ بھی شام جاتے ہوئے راستے میں ہم سفر رہے۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عثمان رضہ نے ایک دوسری مجلس شوریٰ طلب کی جس میں امیر معاویہ رضہ کے علاوہ چند جلیل القدر صحابہ رضہ نے بھی شرکت کی۔ مثلاً حضرت علی رضہ، طلحہ رضہ، زبیر رضہ اور سعد رضہ، امیر معاویہ رضہ نے بات کا آغاز کیا، حاضرین کو معمر خلیفہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فتنہ اور نفاق سے بچنے کی تاکید کی، اس تاکید میں دھمکی کا رنگ بھی تھا۔ حضرت علی رضہ نے امیر معاویہ رضہ کو ڈانٹا، بہر حال دونوں میں جواب ہوا وہ تلخی سے خالی نہ تھا۔

اس کے بعد حضرت عثمان رضہ نے بڑے سکون اور نرمی سے باتیں کیں اور کہا میں قوم کے مشورہ پر ہوں، وہ مجھے جہاں لے جائے گی جاؤں گا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضہ سے کہا گیا کہ آپ نے فلاں فلاں کو عطیات دیئے ہیں وہ واپس منگوائیے۔ حضرت عثمان رضہ نے واپسی کا وعدہ کیا اور سب خوش اور متفق ہو کر مجلس سے اٹھے۔ بلاشبہ حزبِ مخالف کو تھوڑی سی کامیابی ہوئی۔ حضرت عثمان رضہ نے ان کے لیڈروں سے گفتگو کی اور ان کے بعض مطالبات بھی مان لیے، اس کے بعد امیر معاویہ رضہ نے ایک مرتبہ پھر مہاجرین کو بوڑھے خلیفہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور دھمکی کے اشارے بھی، عام طور پر خیال کیا جانے لگا کہ آنے والا ۳۵ھ لوگوں کے لیے ایک گونہ سکون اور اطمینان کا سال ہوگا، لیکن کوفہ والوں نے بغاوت کر دی اور جیسا کہ آپ نے پڑھا انھوں نے سعید کو واپس کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ان کا والی ابوموسیٰ اشعری رضہ کو بنایا جائے۔ حضرت عثمان رضہ ان کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہ سب سے پہلا فتنہ تھا جو کوفے نے دوسرے شہروں کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کیا۔ چنانچہ بہت جلد دوسرے شہروں نے اس کی اتباع کی اور باغیوں کو معلوم ہوگیا کہ مقصد حاصل کرنے کے لیے بغاوت ہی ایک

سیدھا راستہ ہے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد مصری کوفہ والوں کی راہ چل پڑے اور ۳۵ھ کے رجب میں انھوں نے ایک بڑا وفد مرتب کیا اور اس اعلان کے ساتھ کہ یہ لوگ عمرہ کی غرض سے جارہے ہیں ان کو مدینہ بھیجا۔ لیکن مدینہ آنے کے بعد ان لوگوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ حضرت عثمان رضؓ سے ان کے اور ان کے گورنروں کے مسلک کے بارے میں گفتگو اور بحث کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر راویوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ ان کی ملاقات حضرت عثمان رضؓ سے ایک گاؤں میں ہوئی جو مدینہ کے قریب تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے قرآن مجید کو حکم بنا کر سوال وجواب کیا، حضرت عثمان رضؓ نے ان کو مطمئن کردیا۔ اور وہ راضی ہوگئے اسی طرح ان لوگوں نے حضرت عثمان رضؓ کو بھی مطمئن کردیا اور انھوں نے معذرت کی اور درگذر کا وعدہ کیا، اور بعض راوی کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضؓ نے ان لوگوں کے پاس مہاجر اور انصار کی ایک جماعت بھیجی جس میں حضرت علی رضؓ اور محمد بن مسلمہ انصاری رضؓ تھے۔ حضرت عثمان رضؓ نے ان دونوں آدمیوں سے عہد کیا کہ وہ جس شرط پر بھی آنے والوں کو راضی کریں گے، انھیں منظور ہے چنانچہ یہ سفیران لوگوں کے پاس آئے ان کو وعظ ونصیحت کرکے راضی کیا۔ اور ان میں سے کچھ لوگوں کو لے کر حضرت عثمان رضؓ کے پاس آئے تاکہ اپنے عہد پیمان کو مزید اطمینان دلادیں۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضؓ نکلے اور لوگوں کو خطبہ دیا جس میں مصری وفد کی تعریف کی، اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور خدا سے مغفرت چاہی پھر رونے لگے اور اس قدر روئے کہ ان کے لیے لوگوں کے دل رقت سے بھر گئے، اور مصری ہنسی خوشی واپس چلے گئے۔

راویوں کا بیان ہے کہ اس خطبے کے آخر میں حضرت عثمان رضؓ نے کہا تھا" اب اگر مصیبت آئے تو تم میں کے اچھے آدمی میرے پاس آجائیں جو زیادتی بھی مجھے معلوم ہوگی میں اس کو دور کروں گا اور جو ضرورت بھی مجھ پر پیش کی جائے گی میں اسے پورا کروں گا" لیکن ابھی وہ گھر پہنچے ہی تھے کہ مروان آپ کے پاس گیا اور آپ کے خیالات میں تبدیلی پیدا کردی۔ چنانچہ جب آپ گھر سے نکلے تو لوگوں کو بری طرح جواب دیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت عثمان رضؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرکے لوگوں کو اپنا لیا تھا۔ ان کی رضامندی اور وعدے کے پیش نظر لوگ متفق ہوگئے تھے کہ آپ کی اطاعت اور محبت کریں اور آپ سے بھلائی اور خیر کی امیدیں رکھیں لیکن دن گذرتے رہے اور حضرت عثمان رضؓ نے کچھ نہ کیا، نہ کہنے کے مطابق کوئی تبدیلی کی، نہ کسی گورنر کو برطرف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی سال شوال کا مہینہ آتے ہی مصریوں نے دوسری بار خروج کیا۔ اس مرتبہ ان کی تعداد کم سے کم بتانے والوں کے خیال سے چھ سو تھی، اور زیادہ سے زیادہ بتلانے والے ایک ہزار بتلاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں کوفہ اور بصرہ سے بھی لوگ نکلے اور

سب کے سب مدینہ کے باہر پہنچے اور حضرت عثمان رض کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی۔ حضرت عثمان رض نے حضرت علی رض اور محمد بن مسلمہ رض کو بھیجنے کا ارادہ کیا۔ حضرت علی رض نے انکار کر دیا اور محمد بن مسلمہ رض نے کہا کہ میں اللہ کو ایک سال میں دو بار جھٹلا نہیں سکتا۔ لیکن پھر بھی مدینہ والوں نے منظور نہیں کیا کہ کچھ لوگ زبردستی گھس آئیں۔ چنانچہ وہ ان کے مقابلے کے لیے نکل آئے، اب مصر، کوفہ اور بصرہ کے وفود نے دیکھا کہ علی رض، طلحہ رض اور زبیر رض نے پڑاؤ ڈال دیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کی جماعت ہے جو زبردستی داخلے کے خلاف ہے اور دار الہجرۃ کی حفاظت کرنا چاہتی ہے تب وہ سب کے سب واپس ہونے لگے، ان لوگوں نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ اپنے شہروں کو واپس جا رہے ہیں، اس کے بعد مدینہ والوں نے یقین کر لیا کہ شہر سے خطرہ دور ہو گیا اور حملہ آور الٹے پاؤں چلے گئے چنانچہ سکون و اطمینان کی زندگی از سر نو شروع کر دی۔ لیکن یکایک مدینے کی گلیاں تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھیں اور لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ اب ان کو معلوم ہوا کہ اپنے شہروں کو واپسی کا مظاہرہ ایک دھوکا تھا جو ان کو دیا گیا۔ اور جب ان آنے والوں نے دیکھا کہ شہر میں امن و سکون ہے تو وہ بلا روک ٹوک داخل ہو گئے، اور ایک پکارنے والے نے بلند آواز سے اعلان کیا جو کوئی اپنے گھر میں بیٹھا رہا اس کو امان ہے جو ہمیں تکلیف پہنچانے سے باز رہا اس کو امان ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رض کے گھر کا محاصرہ کیا گیا یہیں سے اس خط کا قصہ شروع ہوتا ہے جس کے متعلق راویوں نے لکھا ہے کہ واپسی میں اس کو مصریوں نے پکڑا اور اس کے بعد وہ مدینہ کی طرف لوٹ پڑے۔ میرے خیال میں یہ قصہ سرے سے من گھڑت ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی دلیل خود راویوں کا یہ قول ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مصریوں سے سوال کیا کہ کوفہ اور بصرہ والوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم کو یہ خط ملا ہے حالانکہ ان میں سے ہر ایک اپنے راستے پر الگ تھا۔ مصری لاجواب تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں؟ آخر میں انھوں نے کہا اس کا جو مطلب تمھارا جی چاہے نکالو۔ اب ہم کو اس شخص کی ضرورت نہیں اور یہ بات نہ معقول ہے اور نہ قابلِ قبول کہ حضرت عثمان رض اس قسم کی چال کریں کہ ایک جماعت سے ایک طرف رضامندی کا اظہار کریں اور دوسری طرف اپنے خفیہ قاصد کے ذریعے گورنر کو حکم دیں کہ جب وہ جماعت شہر پہنچے تو اسکی اچھی طرح خبر لے۔ پھر یہ بات بھی معقول نہیں ہے اور نہ قابل قبول ہے کہ مروان خلیفہ کے خلاف ایسی جرأت کر سکتا ہو کہ خود ایک خط لکھے پھر اس پر خلیفہ کی مہر لگائے اور خلیفہ ہی کے ایک غلام کے ہاتھ اسی کے اونٹ پر سوار کر دے۔ یہ تمام باتیں ایک سطحی دل لگی قرار دی جا سکتی ہیں - ان کو واقعہ نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت حال بالکل معمولی ہے،..... باہر شہر اور صوبے کے لوگوں سے

خلیفہ نے ایک وعدہ کیا۔ اس وعدے پر مطمئن ہو کر وہ چلے گئے۔ بعد میں ثابت ہوا کہ خلیفہ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ تب وہ باغی بن کر اور یہ طے کر کے آئے کہ اس کام سے فرصت پا کر ہی واپس ہوں گے۔ اور جب مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ مقابلے کے لیے صحابہ رضہ تیار ہیں۔ یہ لڑائی ان کو گوارا نہ تھی، اس لیے واپسی کی چال چلی، لیکن تھوڑی دور جا کر جب ان کو یقین ہو گیا کہ اب یہ بزرگ اور ممتاز صحابہ رضہ ہتھیار اتار کر گھروں میں جا بیٹھے ہیں تو واپس آئے اور بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے مدینہ میں داخل ہو گئے۔

یہ لوگ صحابہ رضہ کو نہ قتل کرنا چاہتے تھے نہ ان سے جنگ، اور نہ یہ چاہتے تھے کہ مدینہ کے قرب وجوار میں ایسا کوئی معرکہ ہو جو اُحد اور احزاب کے معرکوں کی یاد تازہ کر دے۔ وہ صرف خلیفہ کا محاصرہ کرنا چاہتے تھے، ان کو اس بات کی جلدی تھی کہ خلیفہ کو معزول کر دیں یا قتل، چنانچہ انھوں نے اپنا مقصد پا لیا، مدینے میں داخل ہو گئے اور خلیفہ کا محاصرہ کر لیا۔

میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ خود مدینہ میں ان باغیوں کے حامی اور مددگار تھے۔ جنھوں نے ان کو بلایا، ان کی حوصلہ افزائی کی اور صحابہ رضہ کے ارادے سے مطلع کیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مدینہ کی فضا میں امن اور سکون ہے۔ پھر جب محاصرہ ہوا تو یہ بھی شریک ہو گئے۔ ابتدا میں محاصرہ بہت ہلکا تھا۔ یعنی مدینہ میں داخلہ اور حضرت عثمان رضہ کے مکان کا احاطہ، خلیفہ کو اپنے گھر میں جانے اور گھر سے نکلنے کی آزادی تھی وہ لوگوں کو نمازیں پڑھاتے تھے۔ خود یہی باغی ان کے پیچھے نمازیں ادا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو خطبہ دے کر وعظ ونصیحت کرتے اور ان کی رہنمائی فرماتے تھے، اسی دوران میں مصالحت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور سفیر کبھی حضرت عثمان رضہ کی خدمت میں اور کبھی باغیوں کے ہاں جاتے تھے باغی چاہتے تھے کہ حضرت عثمان رضہ خود سے برطرف ہو جائیں اور حضرت عثمان رضہ وہ عبا جو خدائے عزوجل نے ان کو پہنائی تھی اتارنے پر تیار نہ تھے۔ پھر یک بیک معاملے میں پیچیدگی بڑھ گئی۔ باغیوں کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضہ نے صوبے کے حاکموں کو لکھا ہے کہ وہ ان کی مدد کریں اور باغیوں کو مدینہ سے نکالنے کے لیے فوجی امداد بھیجیں۔ اس کا علم ہونا تھا کہ محاصرے کی کیفیت بدل گئی اور اس کے ساتھ حضرت عثمان رضہ کے ساتھ باغیوں کا طرزِ عمل بھی بدل گیا۔

حضرت عثمانؓ پر باغیوں کی زیادتی

معمول کے مطابق ایک دن حضرت عثمان رضؓ گھر سے نکلے اور مسجد میں نماز پڑھا کر منبر پر بیٹھے اور وعظ و نصیحت شروع کر دی۔ وعظ کے دوران میں آپؓ نے کہا اے دشمنو! خدا سے ڈرو خدا سے، واللہ مدینہ کے لوگ جانتے ہیں کہ تم حدیث نبویؐ کے مطابق ملعون ہو۔ پس نیکیوں کے ذریعے اپنی خطاؤں کا خاتمہ کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ برائیوں کو نیکیوں سے مٹاتا ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس پر محمد بن مسلمہؓ اٹھے اور کہا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں پھر حکیم بن جبلہ کھڑے ہوئے اور ان کو بٹھا دیا۔ اس کے بعد زیاد بن ثابت کھڑے ہوئے اور کہا۔ مجھ سے قرآن طلب کرو لیکن محمد بن قتیرہ نے ان کو بٹھا دیا۔ محمد بن مسلمہؓ اس بات کی شہادت دینا چاہتے تھے کہ اللہ نیکیوں ہی کی وجہ سے برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے اور زید بن ثابت چاہتے تھے کہ یہ بات قرآن مجید سے ثابت کریں اور لوگوں کے سامنے ان الحسنات یذھبن السیئات کی آیت تلاوت کریں۔ لیکن ان دونوں کو لوگوں نے بٹھا دیا پھر جبلہ بن عمرو ساعدی کھڑا ہوا جو انصار میں سے ایک شخص تھا اور کہنے لگا۔ عثمانؓ! تم منبر سے نیچے اترو۔ ہم ایک عبا پہنا کر تم کو ایک بوڑھے اونٹ پر سوار کریں گے اور جس طرح تم نے بزرگوں کو شہر بدر کیا ہے ہم تم کو جبل دخان میں بھیج دیں گے۔ حضرت عثمان رضؓ نے کہا، بُرا ہو تیرا اور تیری تجویز کا۔ یہ جبلہ حضرت عثمان رضؓ کو چھیڑا کرتا تھا اور قتل کی دھمکی دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اگر آپ نے خلافت نہیں چھوڑی تو میں آپ کی گردن میں زنجیر ڈال کر کھجلی والی اونٹنی پر بٹھاؤں گا اور جبل دخان پر لے جا کر چھوڑ دوں گا۔ مزید برآں یہ شخص آپ کے گورنروں کے بارے میں اور خاص طور پر مروان اور حکم کے خاندان کے بارے میں آپ کو سخت و سست کہا کرتا تھا اور جب کوئی اس سلسلے میں اس سے گفتگو کرتا اور یہ جواب دینا چاہتا تو کہا کرتا تھا کہ کل جب میں خدا سے ملوں گا تو واللہ میں اس سے کہوں گا.....

انا اطعنا سادتنا وکبرائنا فاضلونا السبیل[1]

حضرت عثمان رضؓ جبلہ کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ جہجاہ بن سعید غفاریؓ جو ابوذرؓ کے خاندان کے ہیں اور بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے صحابی ہیں، کود کر منبر تک پہنچ گئے اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے خطبے کا عصا لے لیا اور اپنی ران پر مار کر اس کو توڑ دیا۔ یہ وہی عصا تھا جسے ہاتھ میں

---

[1] ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اتباع کی انھوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین خطبہ دیا کرتے تھے۔ راویوں کا بیان ہے کہ اسی دن ان کے پاؤں میں آکلہ کی بیماری پیدا ہوگئی۔ حضرت عثمان رض نے بعد میں عصا کو جوڑنے کا حکم دیا پھر لوگوں نے گڑبڑ کی اور ایک دوسرے پر کنکر پھینکنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک پتھر حضرت عثمان رض کو اس طرح لگا کہ گر پڑے اور بیہوشی کی حالت میں گھر پہنچائے گئے۔ اس کے بعد قتل ہو کر ہی گھر سے نکلنا نصیب ہوا۔

محاصرے میں شدت اور پانی روک دینا

اس دن کے بعد سے حقیقت میں باغیوں کی روش بری ہوگئی۔ انھوں نے حضرت عثمان رض کو مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے سے بھی روکا اور ان کی جگہ اپنے ایک آدمی غافقی کو مقرر کیا جو مصریوں کا سردار تھا، کبھی کبھی طلحہ بن عبید اللہ رض اور بعض اوقات حضرت علی رض نماز پڑھاتے تھے اس کے بعد باغیوں نے حضرت عثمان رض پر پانی روک دیا۔ تا آنکہ آپ رض اور آپ رض کے گھر کے لوگ پیاس کی شدت محسوس کرنے لگے، ایک دن کھڑکی سے سر باہر نکال کر آپ نے لوگوں کو یاد دلایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انھوں نے بئر رومہ خریدا اور مسلمانوں کے لیے عام کر دیا۔ نبی نے اس کے صلے میں ان سے جنت کا وعدہ کیا آج ان پر اسی کنویں کا پانی حرام کیا جا رہا ہے اور مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ کھاری پانی سے افطار کریں، اسی طرح آپ نے انکو یاد دلایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انھوں نے زمین خرید کر مسجد کی تنگی دور کر دی اور اس کے عوض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جنت کا وعدہ کیا آج وہ پہلے مسلمان ہیں جن کو اسی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ سے اور امہات المؤمنین رض سے چاہا کہ اگر ہو سکے تو میٹھا پانی بھیج دیں۔ حضرت علی رض نے تدبیر کر کے پانی پہنچا دیا اور باغیوں کے پاس پہنچ کر ان کو ڈانٹا کہ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ نہ مومنوں کا طریقہ ہے نہ کافروں کا، رومی اور ایرانی بھی اپنے قیدیوں کو کھلاتے پلاتے تھے، ام المؤمنین رض ام حبیبہ رض بنت ابی سفیان رض تھوڑا سا پانی لے کر آئیں تو باغیوں نے ان کے خچر کے منہ پر مارا اور اس کے کمر کا پٹکا کاٹ دیا۔ ام المؤمنین رض گرنے کے قریب ہوگئیں لیکن کچھ لوگ پہنچ گئے انھوں نے پٹکا دیا اور گھر تک پہنچایا، حالانکہ ام المؤمنین نے باغیوں کو بتا دیا تھا کہ وہ حضرت عثمان رض سے بنی امیہ کے کچھ یتیموں کے بارے میں باتیں کرنے جا رہی ہیں اور اس سلسلے میں بنی امیہ کی وصیتیں حضرت عثمان رض کے پاس ہیں۔ لیکن باغیوں نے ان کی ایک نہ سُنی اور نہ کسی بات کی تصدیق کی۔ محاصرے کی شدت کے بعد اکثر صحابہ رض خانہ نشین ہوگئے اور لوگ بھی اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ اگر کوئی نکلتا بھی تو تلوار لے کر نکلتا۔ اس کے بعد تو مصیبت بڑھ گئی، خونریزی عام ہوئی حضرت عثمان رض بار بار کھڑکی سے سر باہر نکال کر باغیوں کو نصیحت کرتے، فتنہ فساد سے بچنے کی تاکید

کرتے، اللہ کی آیات اور رسولؐ کی احادیث ان کو یاد دلاتے لیکن وہ لوگ کچھ نہ سنتے تھے اور نہ کچھ توجہ کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات نہایت سخت جوابات دیتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے حامیوں کی تیاری

بنی امیہ کے کچھ دلیر اور لڑنے والے افراد اکٹھے ہوئے اور ان کے ساتھ مہاجروں کی جوان اولاد بھی شریک ہوگئی، یہ لوگ ایک ساتھ ہوکر حضرت عثمان رضؓ کے گھر میں داخل ہوگئے۔ اور حفاظت کرنے لگے، ان میں عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت علی رضؓ کے دونوں صاحبزادے حسنؓ اور حسینؓ اور محمد بن طلحہؓ تھے۔ حضرت عثمان رضؓ نے ان میں عبداللہ بن زبیرؓ کو امیر بنایا تھا اور حکم دیا تھا کہ لڑائی نہ کرنا اور اس ارادے پر پختہ طور پر قائم رہنا۔ معاملات نے بڑی نازک صورت اختیار کرلی، حتیٰ کہ لوگوں کو حضرت عثمان رضؓ کے پاس جانے سے اور گھر والوں کو باہر نکلنے سے روکا گیا۔

امداد آنے کی خبر

کچھ دنوں یہی حالت رہی، پھر یہ خبر آئی کہ عراق کی امداد مدینے سے قریب آچکی ہے اور شام کی امداد وادیٔ قریٰ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد راویوں کے بیان میں شدید اختلاف ہے، حضرت عثمان رضؓ کے حامی راوی کہتے ہیں، باغیوں کو خطرہ ہوا کہ اگر امداد مدینہ پہنچ گئی تو وہ ان کی راہ میں حائل ہوگی، اس لیے انھوں نے محمد بن ابوبکر رضؓ کی قیادت میں اپنے چند آدمیوں کو اندر گھسا دیا، یہ لوگ عمرو بن حزم کے مکان سے جو حضرت عثمان رضؓ کے گھر سے متصل تھا اور جس کے بیچ میں چھوٹا سا دروازہ تھا، حضرت عثمان رضؓ تک پہنچ گئے اور انکو قتل کردیا۔ لیکن مخالف راویوں کا بیان ہے کہ ابتدا گھر والوں ہی سے ہوئی اور وہ باغیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ حضرت عثمان رضؓ کھڑکی سے سر نکالے ہوئے تھے کہ باغیوں میں سے ایک شخص نیار بن عیاض اسلمی نے جو سن رسیدہ صحابی تھے۔ حضرت عثمان رضؓ کو بلایا اور نصیحت کی کہ وہ از خود خلافت سے برطرف ہوجائیں۔ اسی اثناء میں نیار بن عیاض کو ایک تیر یا ایک پتھر گھر میں سے لگا جس سے وہ مرگئے۔ اب باغیوں نے حضرت عثمان رضؓ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے آدمی کے قاتل کو ہمارے حوالے کرو۔ تاکہ ہم اس سے قصاص لیں، حضرت عثمان رضؓ نے جواب دیا کہ مجھے کیا معلوم کہ قاتل کون ہے؟ یا یہ کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جو میری طرف سے مدافعت کر رہا ہے اور تم میری جان کے خواہاں ہو، کیوں تمھارے حوالے کروں؟

باغیوں کا گھر میں گھسنا اور قتل کرنا

اس کے بعد ایک ہی سخت رات درمیان میں رہی صبح ہوتے ہی باغیوں نے گھر پر حملہ کردیا۔ اور

دروازے میں آگ لگانے لگے، تب گھر کے لوگ مقابلہ کرنے کے لیے گھر سے نکلے اور لڑائی میں شدت پیدا ہوگئی، عبداللہ بن زبیر رض کو بہت زیادہ زخم آئے۔ مروان بن الحکم تو اس طرح گرا کہ لوگوں نے مرجانے کا شبہ کیا، بہت سے لوگوں کی جانیں گئیں۔ اور باغی گھر میں گھس آئے، اسی درمیان میں عمرو بن حزم نے اپنا دروازہ کھول دیا، پھر اس کے اندر کے چھوٹے دروازے سے حضرت عثمان رض تک پہنچے اور ان کو قتل کر دیا۔

غالب گمان یہ ہے کہ باغیوں نے یہ سنکر کہ بہت جلد مدینہ میں امداد آنے والی ہے، چاہا کہ کمک آنے سے پہلے کام پورا کر دیں، ادھر مروان بن الحکم نے بھی مزید انتظار نہیں کیا۔ اس لیے کہ باغیوں کی طرح اس کو بھی امداد کی خبریں مل چکی تھیں، پس اس نے بھی لڑائی شروع کرنے میں عجلت سے کام لیا اور خیال کیا کہ وہ محاصرہ اٹھا دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور امداد آنے تک مقابلہ جاری رکھ سکے گا۔ پھر یہ اس کو اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ معاویہ رض اور ابن عامر کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ ان کی فوجوں نے آکر محاصرہ اٹھایا اور انھیں زندگی بخشی۔ پس وہ چاہتا تھا کہ باہر کی امداد ایسی حالت میں آئے کہ وہ اور اس کے بنی امیہ کے ساتھی میدان میں برسرپیکار ہوں اور دادِ شجاعت دے رہے ہوں، اسی لیے وہ اور اس کے ساتھی مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے اور رجز پڑھتے ہوئے نکلے۔ حضرت عثمان رض صبر کرنے اور لڑائی سے باز رہنے کی تاکید فرما رہے تھے، لیکن یہ لوگ ان کی نہ کچھ سنتے تھے اور نہ ان کی باتوں کا کچھ جواب دیتے تھے۔ تب حضرت عثمان رض نے ان لوگوں کو تلوار رکھ دینے کی قسم دی جن سے اطاعت کی امید تھی۔ چنانچہ آپ کے حامیوں کی ایک جماعت نے تلوار رکھ دی لیکن بنی امیہ باز نہ آئے، باہمی خونریزی کی حالت تھی۔ لوگ حضرت عثمان رض کے گھر میں گھس رہے تھے اور گھر والے منتشر ہو رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک نکلنے والے نے آواز دی کہ ہم نے ابنِ عفان کو قتل کر دیا، اس کے بعد گھر کے تمام دروازے کھل گئے، گھر اور بیت المال لوٹ لیا گیا۔ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمانوں پر مصیبت کا سیلابِ عظیم آگیا۔

کیا حضرت عثمان رض آخر وقت میں معزول ہونے پر تیار ہو گئے تھے؟

تاہم یہ پتہ چلتا ہے کہ آخر میں حضرت عثمان رض کنارہ کشی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ راویوں کا بیان ہے کہ سعد بن ابی وقاص رض حضرت عثمان رض کے پاس آئے اور ان سے کچھ سنکر فوراً واپس ہوئے اور مسجد میں جا کر حضرت علی رض سے ملے اور کہا ابوالحسن رض! آئیے میں آپ کو ایسی خبر دیتا ہوں جیسی کسی نے کسی کو نہیں دی، آپ کے خلیفہ راضی ہو چکے ہیں۔ پس

چلیئے۔ ان کی امداد میں پہل کیجیئے، ابھی یہ لوگ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ حضرت عثمان رض کے قتل کی اطلاع آگئی۔

میں یقین کرتا ہوں کہ حضرت عثمان رض نے سعدؓ کو بلا کر چاہا کہ ان کے ذریعے حضرت علی رض کو درمیان میں ڈال کر قتل وقتال روک دیں۔ اور خلافت کا منصب شوریٰ کے افراد اور دوسرے ارباب حل وعقد کے سپرد کر دیں کہ وہ جس کو چاہیں دیں۔ لیکن یہ پیغام بہت بعد از وقت تھا، اور اللہ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

امیر معاویہؓ کی دو تجویزیں

۳۴ھ کے آخری دنوں میں حضرت عثمانؓ سے رخصت ہونے سے قبل امیر معاویہؓ نے آپ کے سامنے دو تجویزیں رکھی تھیں اور آپ نے دونوں کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا۔ پہلی تجویز میں وہ حضرت عثمانؓ سے کہتے ہیں، کہ آپ میرے ساتھ شام چلیئے، وہاں آپ کے لیے امن اور کامیابی ہے لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت چھوڑنا اور دارالہجرت سے نکل کر کسی اور گھر جانا آپ نے گوارا نہیں کیا۔ غالباً حضرت عثمانؓ کے دلی خیالات کچھ اور تھے۔ جس کا اظہار معاویہؓ سے مناسب نہیں جانا۔ آپ خیال کرتے تھے کہ اگر مدینہ کی رہائش ترک کر دی تو دارالخلافہ اس شہر سے منتقل ہو جائے گا جس میں اسلام دشمنانِ اسلام پر غالب آیا، جس میں نبیؐ اور بعد میں شیخینؓ نے اسلام کی رفعت کا جھنڈا بلند کیا۔ حضرت عثمان رض اس نئی بات کو سخت ناپسند خیال فرماتے تھے۔ اور ان کے نزدیک اس سے زیادہ ناگواری کی کوئی بات نہ تھی کہ صحابہؓ اور عام مسلمان ان سے یہ کہتے کہ آپ نے اسلام کی حکومت نبیؐ اور صاحبینؓ کے مقرر کردہ مقام سے ہٹا کر ایک اجنبی جگہ میں منتقل کر دی پھر یہ کہ حضرت عثمانؓ اگر یہ منظور کر لیتے تو ان کی حیثیت امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں ایک قیدی کی ہو جاتی اور معاویہ ابن ابی سفیانؓ کا قیدی رہنے سے کہیں زیادہ پسندیدہ بات آپ کے لیے یہ تھی کہ اپنے ان ساتھیوں کے قیدی بنے رہیں جن کے ساتھ آپ نے ہجرت کی، جن لوگوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی اور آپؓ کے ساتھ اور نبیؐ کے ساتھ غزوات میں شریک رہے اور جو آپؓ کے ساتھ نبیؐ کے ارشادات پر گوش برآواز تھے، اگرچہ معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کی آپؓ سے رشتہ داری تھی اور ان کے ساتھ رہنے میں سلامتی تھی اور عزت وشوکت بھی۔

دوسری تجویز امیر معاویہؓ نے آپ کے سامنے یہ پیش کی تھی کہ میں شامی فوج کا ایک دستہ بھیج دیتا

ہوں جو مدینہ میں رہ کر آپ پر ہونے والی زیادتیوں کی مدافعت کرے گا۔ حضرت عثمان رضہ نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا اور کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضہ کو فوجیوں کے پڑوس سے تنگ کرنا نہیں چاہتا۔ حضرت عثمان رضہ کے دلی خیالات جس کا اظہار معاویہؓ کے سامنے ضروری نہیں سمجھا غالباً یہ تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صاحبینؓ کی راہ سے اپنے کو ہٹا ہوا رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قوت اور غلبہ کی بنا پر اپنی حکومت منوائیں۔ اور دار الہجرۃ کو معاویہؓ کے مجوزہ تسلط کا محکوم بنائیں اور اس طرح اسلام میں اس المناک حادثے کا سبب بنیں۔ کہ مہاجرین۔ انصار، مسجد نبوی اور مدینہ منورہ سب کے سب معاویہ رضہ کی بھیجی ہوئی شامی فوج کے آگے سرنگوں ہوں، پھر فوج بھی ایسی جس نے نہ نبیؐ کو دیکھا نہ نبیؐ سے کچھ سنا، نہ صاحبینؓ کی زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ حضرت عثمان رضہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ پہلے مسلمان بنیں جس نے خلافت کو سلطنت بنا دیا، جس نے خلافت کی رحمت اور چشم پوشی کو سلطنت کے قہر اور خوف میں تبدیل کر دیا اور اگر آپ یہ منظور کر لیتے تو ایک جابر اور ڈکٹیٹر ہوتے جو فوج کے بل بوتے پر نبیؐ کے صحابہؓ پر حکومت کرتا، ایسی فوج جو آپ کے حامیوں کی حمایت کرتی، آپ گھر میں ہوتے تو گھر کی حفاظت کرتی اور جب آپ گھر سے نکلتے تو آپ کو اپنی حفاظت میں رکھتی۔ مدینہ کے راستوں پر چلتے ہوئے آپ کی نگرانی کرتی۔ منبر پر جب خطبہ کے لیے کھڑے ہوتے تو ہر طرف سے آپ کو اپنے احاطے میں رکھتی، بھلا ان باتوں کا نبیؐ کی سیرت سے، شیخینؓ کی سیرت سے کیا جوڑ؟ حضرت عثمان رضہ تو مدینہ کی گلیوں میں اکیلے بلا کسی حفاظت کے چلتے تھے، قوم کے جھگڑوں پر گذرتے، ان سے کچھ فرماتے، کچھ ان کی سنتے، مسجد میں آرام فرماتے تو چادر میں لپٹے ہوئے چادر ہی کا تکیہ بنا کر، جمعہ کے دن منبر پر بیٹھتے تو لوگوں سے ایک شفیق باپ ایک نیک بھائی یا ایک مخلص دوست کی طرح خطاب فرماتے۔ ان کی خیر و عافیت اور حالات و ضروریات دریافت فرماتے مریضوں کی بیمار پرسی کرتے۔ اور بازار کے بھاؤ بھی پوچھتے۔ پھر اذان کے بعد خطبہ دیتے اور جو کچھ فرمانا چاہتے فرماتے، پھر تشریف رکھتے اور لوگوں سے خیریت مزاج، ان کی ضروریات اور بازار کی حالت دریافت کرتے اور جب دوسری اذان ہو جاتی تو نماز پڑھاتے۔ ان حالات کے پیش نظر کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ سب چھوڑ کر شام چلے جاتے، نہ منبر نبویؐ پر خطبہ دے سکتے، نہ مسجد نبویؐ میں نماز پڑھا سکتے اور کیا حال ہوتا آپ کا، اگر مدینہ میں ایسی حالت میں قیام گوارا فرماتے کہ شامی فوج آپ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ان سے بچاتی جو آپ کے ساتھ اور نبیؐ کے ساتھ تمام معرکوں اور غزوات میں شریک رہے۔ بس حضرت عثمان رضہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ معاویہؓ کی درخواست منظور فرما لیتے اور مدینہ چھوڑ دیتے یا شامی فوج کا مدینے میں قیام گوارا کر لیتے۔ چنانچہ معاویہؓ نے جب آپ کے انکار پر کہا، تو پھر آپ سے جنگ ہوگی اور آپ کی

جان جائے گی" آپ نے فرمایا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

پس خلافت کا آغاز کرتے ہوئے حضرت عثمان رض کی خواہش تھی کہ وہ صدیق اکبر رض اور فاروق اعظم رض کے نقش قدم پر چلیں اور ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہوں اور بڑی حد تک انھوں نے ایسا ہی کیا، چنانچہ نہ شان و شوکت دکھائی نہ اقتدار و برتری کا مظاہرہ کیا۔ ہاں ان تک وہ کمزوری پہنچی جو لوگوں تک بدنیتی کی راہ سے نہیں بلکہ کریمانہ اخلاق، خیر خواہی اور شوق خدمت کے راستے سے پہنچی ہے۔

پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ حضرت عثمان رض نے جب عنانِ خلافت ہاتھ میں لی تو وہ ستر سال کے معمر تھے اور غیر معمولی فیاض، دریا دل، شدید حیادار، نیک طبیعت، نرم دل، لوگوں سے حسن ظن اور رشتہ داروں سے انتہائی ہمدردی رکھنے والے۔ اب اگر کسی شخص میں یہ تمام اوصاف جمع ہوجائیں اور پھر اس کے قریبی رشتہ دار اقتدار کی پوری استعداد اور حرص و طمع کا بے پناہ حوصلہ رکھتے ہوں تو بلاشبہ یہ تمام چیزیں اس فتنے کا باعث ہوسکتی ہیں جو حضرت عثمان رض کو پیش آیا، پھر ان اوصاف پر مزید اگر یہ تصور بھی پیش نظر رکھا جائے کہ صحابہ کبار کی ایک جماعت کا دل دنیا کی طرف مائل ہوا اور وہ اس کی طرف پورے شوق اور رغبت کے ساتھ جھک پڑے اور دنیاوی اسباب کے حصول میں بیش از بیش حصہ لیا اور جمع بھی کیا، پھر اس چیز نے ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ وہ خلافت کے استحقاق میں حضرت عثمان رض سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ خلافت کا بار اٹھانے اور اس کا نظم سنبھالنے کی زیادہ قدرت رکھتے ہیں، اس لیے کہ ابھی وہ عمر کی اس منزل میں نہیں ہیں جہاں حضرت عثمان رض پہنچ چکے ہیں، تو بلاشبہ یہ تمام باتیں حضرت عثمانؓ کی راہ میں انتہائی مشکلات پیدا کردیتی ہیں اور انھیں مسلسل دشواریوں میں اس طرح پھنسا دیتی ہیں کہ اگر کسی الجھاؤ سے نجات ملی بھی تو اس لیے کہ اس سے زیادہ پیچیدہ الجھاؤ سامنے موجود ہے۔

پھر ان تمام مشکلات پر ایک مزید اضافہ یہ کرلیجیے کہ مہاجر اور انصار کے یہ بڑے بوڑھے اب تک جو زندگی جیتے رہے، اگر وہ نری بدوی نہ تھی تو شہری سے کہیں زیادہ دیہاتی زندگی کے قریب تھی اور اب جو آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک زبردست حکومت کی آغوش میں پایا جس کی حدیں دور دراز تک پھیلی تھیں جس کے معاملات پیچیدہ اور الجھے ہوئے تھے۔ جس کے چلانے کے لیے کوئی وقتی اور ہنگامی سیاست کافی نہ تھی بلکہ ایک مستقل بنیادی اور متمدن سیاست کی ضرورت تھی۔ ایسی سیاست جس کے اصول موروثی، جس کی روایات مقررہ ہوں۔ ان تمام نقطوں کو جب مرتب فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی کے وہ حالات اور موثرات جو حضرت عثمان رض کو اس وقت گھیرے ہوئے تھے، ان کی قوت خود حضرت عثمان رض اور ان کے ساتھیوں سے کہیں زیادہ تھی، کوئی صاحب یہ کہنے کی جرأت نہ کریں کہ حضرت عمر رض

کے سامنے بھی تو یہی حالات تھے، پھر وہ کس طرح ان پر غالب آگئے، اس لیے کہ فاروق اعظم رض ان یکتا اور یگانہ افراد میں ہیں جو انسانیت کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوتے ہیں، ایسے افراد بعد میں آنیوالوں کو تھکا دیتے ہیں اور سخت مشکلات میں مبتلا کردیتے ہیں، اگر احتیاط دامنگیر نہ ہوتی تو میں کہتا کہ حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں پر جو کچھ گذری ان کی تمام ذمہ داری اس جوہر کمال پر ہے جو فاروق اعظم رض کو ملا۔ اور جس سے آپ کے تمام ساتھی محروم تھے، انھیں میں ایک حضرت عثمان رض بھی تھے۔

دوٓ راستے

بہرحال ان حوادث اور انقلابات نے جن کی پہلی منزل حضرت عثمان رض کا خون تھا مسلمانوں کو دوٓ صاف اور سیدھے راستے پر کھڑا کردیا، ایک تو وہ جو پہلے سے قوموں کا چلا ہوا ہے۔ یعنی سلطنت اور ملک گیری کا راستہ جس کی بنیاد تدبر، استقلال، قوت اور شوکت پر ہے جو دنیادی مشکلات کا حل دنیا کے اسباب سے کرنا جانتا ہے، چنانچہ وہ ترقی کرتا ہے، طاقتور بنتا ہے، پھُولتا پھلتا ہے، پھر اس پر کمزوری طاری ہوتی ہے، اضمحلال اور افسردگی کا دور آتا ہے تاکہ دوسری حالت پیدا ہو، دوسری حکومت بنے اور دوسرے عوام سامنے آئیں، اور دوسرا وہ راستہ جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہموار کیا، جس کے نشانات شیخین رض نے نصب کیے، جس کی بنیاد حکومت کی قوت نہیں بلکہ عدل اور محبت کی طاقت ہوتی ہے جو قوت کو ایک ذریعہ اور وسیلہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، اس راہ کو ذاتی مفاد سے، تحکم اور جبر سے، کوئی نسبت نہیں۔ یہ دنیا کی مشکلات کا حل دنیا کے ذرائع سے کرنا نہیں جانتا بلکہ دنیا کی مشکلات کا حل دین سے کرتا ہے، اس کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہے، بھلائی سے رغبت اور برائی سے نفرت پر ہے، اخلاص و ایثار پر اور خود غرضی سے توبہ پر ہے، اس کے لیے سب سے پہلی معتبر چیز سینوں کی صفائی اور دلوں کی پاکیزگی ہے، یہ ساری دنیا کو صرف آخرت کا ذریعہ تصور نہیں کرتا بلکہ آخرت کے ساتھ ساتھ ایک نئی دنیا بھی اس کے پیش نظر ہے جو زمانے کی ترقی کے ساتھ طہارت اور پاکیزگی میں ترقی کرتی جاتی ہے۔

حضرت عثمان رض کے بعد مسلمانوں نے اپنے آپ کو انھیں دو راستوں پر کھڑا ہوا پایا، ان کی اکثریت نے پہلا راستہ اختیار کیا اور آزمائش میں ڈالے گئے اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح آج تک مبتلائے آزمائش

ہیں، کچھ تھوڑے سے لوگوں نے دوسرا راستہ چلنے کا ارادہ کیا لیکن وہ بہرحال انسان ہی تھے، ابھی وہ تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ انکی جانوں کے لیے امتحان کا موکہ پیش آیا اور اکثریت نے ان پر غلبہ پا لیا۔

آج مسلمان آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ پہلا راستہ معمور ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور دوسرا راستہ ہے تو صاف اور کھلا ہوا۔ لیکن وہ خالی ہے۔ اس پر چلنے کی مقدرت صرف اولوالعزم کو ہے۔ لیکن اب لوگوں میں اولوالعزم کہاں؟

ایک سوال جس کا جواب ضروری ہے

یہاں پہنچ کر ایک سوال سامنے آتا ہے جس کا قدما نے اطمینان بخش جواب نہیں دیا بلکہ اکثروں نے تو جواب دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی، لیکن ہمیں جواب تو بہرحال معلوم کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان رض کے گورنروں نے امداد بھیجنے میں کیوں اتنی دیر کی کہ باغی محاصرہ کر سکے اور کیئے رہے تا آنکہ ان کی جان تک لے لی، کہا جاتا ہے کہ محاصرہ مسلسل چالیس دن تک باقی رہا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس وقت آمدرفت کی آسانی نہ تھی اور نہ مسافت قریب تھی لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شہروں میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ خبریں پھیل جایا کرتی تھیں۔ عبداللہ بن سعد کو معلوم تھا کہ مصری حضرت عثمان رض کے خلاف خروج کر چکے ہیں، اس نے امیر معاویہ رض کو اس کی خبر کر دی تھی، خود حضرت عثمان رض کو بھی خط لکھ دیا تھا، ابوموسیٰ اشعری رض کوفیوں کے نکلنے سے واقف تھے اور عبداللہ بن سعد کی طرح یہ بھی جانتے تھے کہ یہ کہاں اور کیوں جاتے ہیں اب عبداللہ بن عامر کا بھی اندازہ کر لیجئے کہ وہ بصرہ سے نکلنے والوں سے بے خبر نہ تھے۔ پس یہ معلوم ہوتے ہی کہ ان کے شہر سے لوگ خلیفہ کی بغاوت کرنے جا رہے ہیں، کیوں یہ گورنر فوراً دوڑ نہ پڑے اور پھر جب خلیفہ نے امداد کے لیے ان کو خطوط لکھے، کیوں نہ یہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کیوں اتنی دیر کی کہ ان کے پہنچنے سے پہلے مصیبت آگئی اور خلیفہ کی جان گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عثمان رض نے اپنے گورنروں کو اس بات کا عادی بنا دیا تھا کہ ہر سال حج کے موقع پر حاضری دیں اور ملاقات کریں۔ پھر کیوں اس سال یہ سب کے سب اپنے شہروں میں ٹھہرے رہے اور حج کے لیے نہیں نکلے۔ حتیٰ کہ محصور اور بے بس خلیفہ کو حج کے لیے ابن عباس رض کو مقرر کرنا پڑا۔ ان سب باتوں سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بقول مؤرخین ابن عباس رض نے حج کے لیے آنے والے تمام مسلمانوں کو حضرت عثمان رض کا ایک خط پیش کیا جس میں انھوں نے اپنا معاملہ اور اپنی صفائی پیش کی ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ابن عباس رض نے یہ خط موقع پر لوگوں کو پڑھ کر سنایا، پھر یہ

کیا بات ہے کہ یہ خط جس کو طبری نے بہ تمام وکمال نقل کیا ہے، عام لوگوں نے سُنا اور ادھر ادھر ہو گئے. گویا کچھ ہوا ہی نہیں. ان میں سے ایک بھی خلیفہ کی امداد کے لیے کھڑا نہیں ہوا اور ان کی کوئی جماعت بھی مدینہ نہیں گئی کہ وہاں ہونے والے واقعات کا بچشم خود معائنہ کرتی اور ہاں یہ کہ کا گورنر کس طرح اطمینان کا سانس لیتا رہا، خلیفہ کی نصرت کے لیے لوگوں کو دعوت نہیں دی. اگر وہ مکہ والوں ہی کو بلا لیتا. اور دیہات کے کچھ لوگوں کو جمع کرکے ایک فوج ترتیب دے لیتا تو یقیناً باغیوں کو مصروف رکھ سکتا. یہاں تک کہ شہروں سے منظم فوجی مدد آجاتی. پس کیا معاملہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوسکی، نہ ان گورنروں میں سے کسی میں حرکت پیدا ہوئی اور نہ حاجیوں نے خلیفہ کی امداد کے لیے کسی بیتابی کا اظہار کیا، تو کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ پوری امت نے خلیفہ سے ہاتھ اٹھا لیا، رعایا برداشتہ خاطر ہوئی. گورنروں نے کچھ کا کچھ سوچا اور قصداً ٹال مٹول سے کام لیا اور سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں لگے رہے اور خلیفہ کو مدینہ والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ مدینہ والوں کی اکثریت باغیوں کے ساتھ ہے. صحابہ رض کی ایک مختصری جماعت حضرت عثمان رض کی ماننے والی ہے اور وہ بھی کرتی کچھ نہیں، زبان سے زیادتیوں کی برائی کرتی ہے. اگر صحابہ رض کی یہ جماعت باغیوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کا مقابلہ کرتی اور ان کے منہ پر خاک ڈالتی تو بقول بعض قدماء یہ باغی ناکام و نامراد واپس چلے جاتے، تو پھر حضرت عثمان رض کی یہی بات ٹھیک ہے کہ لوگ اب ان کی زندگی سے اکتا گئے ہیں: غالب گمان یہ ہے کہ لوگوں پر صرف ان کا بڑھاپا گراں تھا بلکہ ان کی سیاست کی عمر بھی ایک بوجھ بن گئی تھی. جو نہ خلافت کی سیاست تھی نہ ملک گیری کی، بلکہ ایک چیز تھی بین بین.

حضرت عُثمان رض کی زندگی کے آخری دِن

جس رات حضرت عثمان رض کے گھر سے تیر یا پتھر پھینکا گیا اور نیار بن عیاض اسلمی مارے گئے، اس کی صبح آپ روزے سے تھے آپ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے کہ آج ان کی زندگی کا آخری دن ہے آج ان کی جان لے لی جائے گی، حاضرین نے کہا، امیرالمؤمنین! اللہ دشمنوں کے لیے کافی ہے. تب آپ نے کہا اگر تم میری آرزو اور خوش فہمی نہ سمجھو تو میں ایک عجیب بات کہوں، لوگوں نے کہا ہم ایسا نہیں سمجھیں گے، آپؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ان کے ساتھ ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی تھے

آپؐ نے فرمایا عثمانؓ! آج رات تم ہمارے یہاں افطار کرنا۔

گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ تین صورتوں کے سوا کسی حالت میں بھی ایک مسلمان کا خون حلال نہیں۔ ایمان کے بعد کفر۔ پاکبازی کے بعد زنا۔ بلا عوض کسی کا قتل، قسم خدا کی کہ میں نے زنا کا ارتکاب نہ جاہلیت میں کیا نہ اسلام میں۔ اور جب سے خدا نے ہدایت دی، مجھے اپنے دین بدلنے کا خیال تک نہیں آیا، اور نہ میں نے کسی کو قتل کیا، پھر کس بنیاد پہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں[1]۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا، اگر مجھے قتل کر دیا تو کبھی متفقہ نماز نہیں پڑھ سکیں گے اور نہ کبھی ایک صف ہو کر دشمن سے مقابلہ کر سکیں گے، اس کے بعد آپ حاضرین کو قتل و قتال سے بچنے کی ہدایت فرماتے رہے اور حاضرین کا اصرار تھا کہ دشمنوں سے ضرور مقابلہ کرنا چاہیئے آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک ذمہ داری سونپی ہے۔ میں صبر کے ساتھ اس پر قائم رہوں گا تا آنکہ اس معرکے میں گرا دیا جاؤں۔ جو میرے لیے مقدر ہے۔ آپ اسی طرح اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرتے رہے۔ اتنے میں باغی گھس آئے اور آپ کا کام تمام کر دیا۔

آپ کے قاتلوں کے متعلق زبردست اختلاف ہے لیکن اس میں شک اور انکار کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ آپ کا خون قاتلوں کے لیے کسی طرح بھی حلال نہ تھا اس لیے کہ آپ جس مسلک کے پابند تھے۔ اس میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال ہے آپ کے ساتھیوں کی بے راہ روی دانستہ ہو سکتی ہے اور نادانستہ بھی، پس آپ کے معترضین اور مخالفین کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش اس کی تھی کہ وہ بغاوت کرتے اور امت کو بغاوت پر آمادہ کرتے، اگر کامیاب ہو جاتے تو صوبوں کے لیے مسلمانوں میں سے نمائندے مقرر کر لیتے۔ اب یہ نمائندوں کا فرض تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ سے بحث و مباحثہ اور گفت و شنید کرتے، کچھ ان کی سنتے کچھ اپنی سناتے، اس کے بعد اگر ان کا باقی رکھنا مناسب خیال کرتے تو باقی رکھتے ورنہ معزول کر کے ان کی جگہ دوسرا امام مقرر کر لیتے اور حضرت عثمانؓ کا معاملہ نئے امام کے حوالے کر دیتے جو ان سے ان کی جانوں اور مالوں کے بارے میں اگر کوئی قضیہ تھا تو باز پرس کرتا لیکن وہ باغی جن کو مسلمانوں کی وکالت حاصل نہیں ہے۔ اس کا حق نہیں رکھتے کہ خلیفہ کو معزول کر دیں اور یہاں، تو معزول کرنے کی بھی بات نہیں ہے انھوں نے تو خلیفہ کا خون ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ عام مسلمانوں کی طرح خلیفہ کا خون حرام تھا بلکہ اس میں خلافت کی حرمت کا اضافہ بھی تھا۔

---

[1] طبقات ابن سعد مطبوعہ لیڈن تیسرا حصہ پہلی قسم ص ۴۹۔

لوگ ان باغیوں کی طرف سے بہت سے عذر پیش کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ مصر، شام اور عراق کے گورنروں کے خوف کی وجہ سے خلیفہ کو معزول نہیں کرسکتے تھے۔ اور نہ مزید انتظار، اور اگر وہ قتل نہ کردیتے تو حضرت عثمان رضہ یا ان کے حاکم خود ان کو قتل کردیتے۔ لیکن یہ عذر بھی ان کو اجازت نہیں دیتا کہ اللہ کا حرام کیا ہوا خون حلال سمجھیں اور خلافت کے اقتدار کو اس طرح ذلیل کریں۔

شاید باغیوں کے لیے اور خود حضرت عثمان رضہ کے لیے اور ان تمام افراد کے لیے جن کے ہاتھ اس قضیے میں خون سے رنگین ہیں۔ صفائی کا ایک ہی بیان ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس وقت کے حالات، اور زندگی سے محیط موثرات سب کے بس سے باہر تھے اور اللہ نے مقدر کیا تھا کہ اس فتنہ میں مبتلا کرکے ان کے دین اور ان کی دنیا دونوں کا امتحان لے گا۔ حضرت علی رضہ نے کوفہ والوں سے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا عثمان رضہ نے اپنی رائے پر غلط اصرار کیا اور تم نے بے صبری کا مظاہرہ کیا، اس فتنہ عظیم کی یہی بہترین تفسیر ہے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ مجھے فضل بن دکین نے خبر دی کہ ان کو ابان بن عبداللہ بجلی سے اور ان کو نعیم بن ابی ہند سے اور ان کو ربعی بن حراش سے معلوم ہوا۔ وہ فرماتے ہیں۔ میں حضرت علی رضہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ابن طلحہ آئے اور حضرت علی رضہ کو سلام کیا، حضرت علی رضہ نے مرحبا کہا تو اس نے جواباً کہا امیرالمؤمنین مجھے مرحبا کہتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے میرے والد کو قتل کیا ہے اور میرا مال لے لیا ہے۔ آپ نے کہا تمھارا مال بیت المال میں رکھا ہوا ہے۔ کل آکر تم وہاں سے لے لو، رہی تمھاری یہ بات کہ میں نے تمھارے باپ کو قتل کیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ میں اور تمھارے باپ ان لوگوں میں ہوں جن کے لیے اللہ کا ارشاد ہے:۔

ونزعنا ما في صدورهم من غلٍ اخوانا على سررٍ متقابلين۔

اس پر ہمدان کے ایک یک چشم آدمی نے کہا، اللہ اس سے بھی زیادہ انصاف کرنے والا ہے۔ حضرت علی رضہ اس طرح چلائے کہ مکان ہل گیا اور فرمایا اگر ہم نہیں تو اس آیت کے مصداق اور کون ہوں گے!۔

امداد کے لیے حضرت عثمان رضہ کا صوبوں کے نام خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اما بعد! اللہ عزوجل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا، آپ نے اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچائے، پھر اللہ نے آپ کو بلا لیا اور آپ اپنا فرض ادا کرکے

ہم میں وہ کتاب چھوڑ گئے جس میں حلال و حرام ہے اور جس میں ان باتوں کا بیان ہے، جن کو اللہ نے مقدر کیا ہے اور جاری کیا ہے. خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض. پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ، اور عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اس کے بعد مجھے بلا بتائے اور بلا پوچھے امت کی ایک جماعت کے سامنے شوریٰ میں داخل کر دیا گیا، اس کے بعد شوریٰ والے اپنی اور لوگوں کی موجودگی میں میری طلب کے بغیر مجھ پر متفق ہوئے اور میں متبع اور مقتدی کی طرح ان میں پسندیدہ اور ناقابل اعتراض کام کرتا رہا. میں نے جدت اور تکلف سے کام نہیں لیا اور نہ اپنی تابعداری چاہی لیکن جب معاملات تکمیل کو پہنچے اور اہل شر ناکام رہے تو گذری ہوئی باتوں پر کینے اور حسد کا اظہار کرنے لگے ۔ حالانکہ وہ باتیں قرآنی احکام کے مطابق ہیں اور ان میں کوئی ظلم و زیادتی نہیں، وہ ایک بات کا مطالبہ کرتے ہیں پھر بلا کسی دلیل اور سبب کے دوسری بات کا اعلان کرتے ہیں، انھوں نے مجھ پر اور مدینے کی ایک جماعت پر من مانے الزامات لگائے، پس میں صبر کرتا رہا اور برسوں دیکھتا رہا اور کچھ نہیں کیا، پھر اللہ عزوجل پر ان کی جرأت اور بڑھی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حرم کے پڑوس میں سرزمین ہجرت میں لوگوں کو ہمارے خلاف ابھارا اور دیہاتیوں کو جمع کیا، پس یہ لوگ غزوۂ احزاب کے دن کی جماعتوں کی طرح ہیں، یا ان لوگوں کی طرح جنھوں نے معرکۂ احد میں ہمارا مقابلہ کیا، البتہ یہ لوگ ظاہر کچھ اور کرتے ہیں، اب جو ہمارا ساتھ دے سکتا ہو دے۔

حاجیوں کے نام حضرت عثمانؓ کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے عثمانؓ امیر المومنین کی طرف سے تمام مسلمانوں کے نام سلام علیکم! میں تم سے اس خدا کی تعریف بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔

امابعد! میں تمھیں اس خدائے بزرگ و برتر کی یاد دلاتا ہوں جس نے تم پر انعام کیا۔ تم کو اسلام سکھایا اور گمراہی سے بچایا، کفر سے نکالا، تم کو نشانیاں بتائیں، رزق میں وسعت بخشی، دشمن پر غالب کیا، اپنی نعمتوں سے ڈھانک لیا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:۔

وان تعدوا نعمة الله لاتحصوها
ان الانسان لظلوم كفار - يا يها
الذين امنوا اتقوا الله حق تقته
ولا تموتن الا وانتم مسلمون
واعتصموا بحبل الله جميعا ولا
تفرقوا واذكروا نعمة الله عليكم
اذ كنتم اعداءً فالف بين قلوبكم
فاصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم
على شفا حفرة من النار فانقذكم
منها كذلك يبين الله لكم
اياته لعلكم تهتدون - ولتكن
منكم امة يدعون الى الخير و
يامرون بالمعروف وينهون عن
المنكر واولئك هم المفلحون۔
ولا تكونوا كالذين تفرقوا و
اختلفوا من بعد ما جاءهم البينات
واولئك لهم عذاب عظيم ـــ
واذكروا نعمة الله عليكم و
ميثاقه الذي واثقكم به اذ
قلتم سمعنا واطعنا۔ يايها الذين
امنوا ان جاءكم فاسق بنبا
فتبينوا ان تصيبوا قوما بجهالة
فتصبحوا على ما فعلتم ندمين ـــ
واعلموا ان فيكم رسول الله لو
يطيعكم في كثير من الامر

اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو، بیشک
آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکرا۔ اے ایمان
والو ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہیئے اس سے
ڈرنا اور نہ مریو مگر مسلمان۔ اور مضبوط پکڑو
رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو اور
یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جبکہ تھے
تم آپس میں دشمن، پھر الفت دی تمہارے
دلوں میں اب ہوگئے اس کے فضل سے بھائی۔
اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے پھر
تم کو اس سے نجات دی اسی طرح کھولتا ہے اللہ
تم پر آیتیں تاکہ تم راہ پاؤ۔ اور چاہیئے کہ رہے
تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی
طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں
برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔ اور مت
ہو ان کی طرح جو متفرق ہوگئے اور اختلاف
کرنے لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو حکم
صاف اور ان کو بڑا عذاب ہے ـــ اور
یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر اور عہد اس کا
جو تم سے ٹھہرایا تھا۔ جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے
سنا اور مانا۔ اے ایمان والو اگر آئے تمہارے
پاس کوئی گنہگار خبر لے کر تو تحقیق کر لو، کہیں
جا نہ پڑو کسی قوم پر نادانی سے، پھر کل کو اپنے
کیے پر لگو پچھتانے ـــ اور جان لو کہ تم میں
رسول ہے اللہ کا، اگر وہ تمہاری بات مان لیا
کرے بہت کاموں میں تو تم پر مشکل پڑے

لعنتم ولکن اللہ حبب الیکم	پر اللہ نے محبت ڈال دی تمہارے دل میں ایمان
الایمان وزینہ فی قلوبکم و	کی اور کھپا دیا اس کو تمہارے دلوں میں اور
کرہ الیکم الکفر والفسوق و	نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور
العصیان اولئک ھم الراشدون	نافرمانی کی، وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر اللہ کے
فضلاً من اللہ ونعمۃ ۔ واللہ	فضل سے اور احسان سے اور اللہ سب کچھ جانتا
علیم حکیم۔ ان الذین یشترون	ہے حکمتوں والا۔ جو لوگ مول لیتے ہیں اللہ کے
بعھد اللہ وایمانھم ثمنًا	اقرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول، ان کا
قلیلا اولئک لاخلاق لھم فی	کچھ حصہ نہیں آخرت میں اور نہ بات کرے گا ان سے
الاخرۃ ولا یکلمھم اللہ ولا	اللہ اور نہ نگاہ کرے گا ان کی طرف قیامت
ینظر الیھم یوم القیمۃ ولا یزکیھم	کے دن اور نہ پاک کریگا ان کو اور ان کے
ولھم عذاب الیم ۔ فاتقوا	واسطے عذاب ہے۔ سو ڈرو اللہ سے جہاں
اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا	تک ہو سکے اور سنو اور مانو اور خرچ کرو اپنے
وانفقوا خیرًا لانفسکم ومن	بھلے کو اور جس کو بچا دیا اپنے جی کے لالچ سے
یُوق شُحّ نفسہ فاولئک ھم	سو وہ لوگ وہی مراد کو پہنچے اور پورا کرو عہد
المفلحون۔ واوفوا بعھد اللہ	اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں
اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان	کو پکا کرنے کے بعد، اور تم نے کیا ہے اللہ کو
بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم	ضامن۔ اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔
کفیلا۔ ان اللہ یعلم ما تفعلون۔	اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے
ولا تکونوا کالتی نقضت غزلھا	اپنا سوت کاتا ہوا محنت کے بعد ٹکڑے
من بعد قوۃ انکاثا تتخذون	ٹکڑے کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا
ایمانکم دخلا بینکم ان تکون	بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک
امۃ ھی اربی من امۃ انما یبلوکم	فرقہ ہو چڑھا ہوا دوسرے سے، یہ تو اللہ
اللہ بہ ولیبینن لکم یوم القیمۃ	پرکھتا ہے تم کو اس سے اور آئندہ کھول دیگا
ما کنتم فیہ تختلفون ولو شاء	اللہ تم کو قیامت کے دن جس بات میں تم جھگڑ
اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن	رہے تھے اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی فرقہ

يضل من يشاء ويهدي من يشاء
ولتسئلن عما كنتم تعملون - ولا
تتخذوا ايمانكم دخلا بينكم
فتزل قدم بعد ثبوتها وتذوقوا
السوء بما صددتم عن سبيل الله
ولكم عذاب عظيم - ولا تشتروا
بعهد الله ثمنا قليلا ان ما عند الله
هو خير لكم ان كنتم تعلمون
ما عندكم ينفد وما عند الله باق
ولنجزين الذين صبروا اجرهم
باحسن ما كانوا يعملون. يايها
الذين آمنوا اطيعوا الله واطيعوا
الرسول واولي الامر منكم فان
تنازعتم في شيء فردوه الى
الله والرسول ان كنتم تؤمنون
بالله واليوم الآخر ذلك خير
واحسن تاويلا - وعد الله الذين
آمنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم
في الارض كما استخلف الذين من
قبلهم وليمكنن لهم دينهم
الذي ارتضى لهم وليبدلنهم
من بعد خوفهم امنا - يعبدونني
لا يشركون بي شيئا ومن كفر
بعد ذلك فاولئك هم الفاسقون -
ان الذين يبايعونك انما يبايعون

کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جس کو چاہے اور سجھاتا ہے
جس کو چاہے اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام تم کرتے
تھے۔ اور نہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دھوکا آپس میں کہ
ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے، اور تم
چکھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا اللہ کی راہ سے
اور تم کو بڑا عذاب ہو۔ اور نہ لو اللہ کے عہد پر
مول تھوڑا بیشک جو اللہ کے یہاں ہے وہی بہتر
ہے تمہارے حق میں اگر تم جانتے ہو، جو تمہارے
پاس ہے ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے
کبھی ختم نہ ہوگا اور ہم بدلے میں صبر کرنے والوں کو
ان کا حق اچھے کاموں پر جو وہ کرتے تھے۔ اے
ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا،
اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں پھر اگر جھگڑ پڑو
کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے
اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت
کے دن پر یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے
اس کا انجام۔ اور وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں
سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں انھوں نے
نیک کام البتہ پیچھے قائم کردے گا ان کو ملک
میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو اور جما دیگا
ان کے لیے دین ان کا جو پسند کر دیا انکے واسطے
اور ان کو دیگا ان کے ڈر کے بدلے میں امن میری
بندگی کریں گے شریک نہ کریں گے میرا کسی کو اور جو
کوئی ناشکری کریگا اس کے پیچھے سو وہی لوگ
ہیں نافرمان اے پیغمبر! جو لوگ صلح حدیبیہ کیوقت

الله ید الله فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علیٰ نفسه ومن اوفیٰ بما عاھد علیه الله فسیؤتیه اجرًا عظیمًا۔	تمہارے ہاتھ پر لڑنے مرنے کی بیعت کر رہے ہیں وہ تم سے نہیں بلکہ خدا ہی سے بیعت کر رہے ہیں تمھارا نہیں بلکہ خدا ہی کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ جو ایسا پکا قول وقرار کرنے کے بعد اسکو توڑدیگا تو توڑنے کا وبال خود اسی پر پڑیگا اور جو اس عہد کو پورا کرتا ہے

گا جو اس نے خدا کے ساتھ کر لیا ہے تو عنقریب خدا اس کو بڑا اجر دے گا۔

امابعد! خدائے بزرگ و برتر تمھارے اتحاد اور اطاعت سے خوش ہے۔ نافرمانی، نااتفاقی اور اختلاف سے بچنے کی تاکید کرتا ہے پہلے کے لوگوں نے جو کچھ کیا اس کی اس نے تم کو خبر کردی ہے تاکہ اگر تم نافرمانی کرو تو تم پر حجت قائم رہے۔ پس خدائے بزرگ و برتر کی نصیحت قبول کرو اور اس کے عذاب سے بچو۔ تم برباد ہونے والی قوموں میں دیکھو گے کہ ان کی تباہی کا سبب باہمی اختلاف ہے، الّا یہ کہ ان کو متحد کرنے والا کوئی ہو۔ اگر تم متحد نہیں رہے تو متفقہ نماز نہیں پڑھ سکو گے۔ دشمن تم پر مسلط کردیا جائیگا اور تم میں سے بعض بعض کی آبرو ریزی کریں گے اور جب ایسا ہونے لگے گا۔ تو اللہ کے لیے کوئی دین نہ ہوگا اور تم ٹولیوں میں بٹ جاؤ گے۔ اللہ عزوجل نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔

انّ الّذین فرّقوا دینھم وکانوا شیعًا لست منھم فی شیءٍ انّما امرھم الی الله ثمّ ینبّئھم بما کانوا یفعلون۔	اے پیغمبر جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقے بن گئے، تم کو ان کے جھگڑوں سے کچھ سروکار نہیں، ان کا معاملہ بس خدا کے حوالے کردو ان کا حساب لے گا، پھر جو کچھ دنیا میں کیا کرتے تھے ان کا نیک وبد اُن کو بتادے گا۔

میں تم کو خدا کا دیا ہوا حکم دیتا ہوں اور اس کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ شعیب علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

یا قوم لا یجرمنکم شقاقی ان یصیبکم مثل ما اصاب قوم نوحٍ او قوم ھود او	اور بھائیو! میری ضد میں آکر کہیں ایسا جرم نہ کر بیٹھنا کہ جیسی مصیبت قوم نوح پر یا قوم ہود پر یا قوم صالح پر نازل ہو چکی ہے۔ اس جرم کی

قوم صالح وما قوم لوط منکم ببعید۔ واستغفروا ربکم ثم توبوا الیہ ان ربی رحیم ودود۔

پاداش میں ویسی ہی مصیبت تم پر بھی آنازل ہو۔ اور قوم لوط کے کھنڈر تم سے کچھ ایسے دور نہیں ان کو دیکھ کر عبرت پکڑ سکتے ہو اور اپنے پروردگار سے اپنے پچھلے گناہوں کی معافی چاہو۔ پھر آئندہ کے لیے اس کی جناب میں توبہ کرو، بے شک میرا پروردگار بڑا مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔

اما بعد! جو لوگ میرے متعلق یہ سب باتیں کہتے ہیں وہ بظاہر اللہ کی کتاب کی طرف دعوت دیتے ہیں اور حق کی طرف بلاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ دنیا ان کا مقصود نہیں۔ پھر جب ان کے سامنے حق پیش کیا گیا تو لوگ مختلف خیال کے ہوگئے۔ کسی نے تو حق کا دامن پکڑ لیا، کسی نے انکار کیا، کسی نے محض اس شوق میں کہ بجبر اور بلا حق منصب خلافت حاصل کریں، حق کو چھوڑ دیا۔ میری عمر کے ساتھ اقتدار کے لیے ان کی امیدیں بھی طویل ہو چکی ہیں، اس لیے وہ عجلت سے کام لے رہے ہیں، انھوں نے آپ لوگوں کو لکھا ہے کہ وہ میرے وعدے کے سلسلے میں دوبارہ آئے ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ میں نے کوئی ایسی بات چھوڑ دی ہے، جس کا میں نے ان سے عہد کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے حدود جاری کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ایک کے بارے[1] میں تم جاری کرو۔ جس کے متعلق جانتے ہو کہ وہ مجرم ہے جس نے تم پر دور یا نزدیک سے ظلم کیا ہو، اس پر تم حد جاری کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید پڑھا جائے۔ میں نے کہا پڑھے جسے پڑھنا ہے، لیکن جو بات خدا نے نازل نہیں کی ہے اس میں غلو اور تشدد سے کام نہ لے۔ انھوں نے کہا کہ درماندہ اور بے کسوں کی مالی امداد ہونی چاہیئے۔ مال کے ذریعے اچھی اور مفید راہیں نکالنی چاہئیں۔ خمس اور صدقات کے بارے میں بے عنوانی نہیں ہونی چاہیئے، اچھے، قوی، ایماندار اور متقی افراد کو حاکم بنانا چاہیئے مظلوموں کو انصاف ملنا چاہیئے۔ میں نے یہ تمام باتیں منظور کیں، میں ازواج مطہرات رض کے پاس گیا اور ان سے گفتگو کرتے ہوئے سوال کیا کہ مجھے کیا حکم دیتی ہیں، انھوں نے

[1] طبری کے متعدد نسخوں میں اسی طرح ہے۔

کہا کہ عمرو بن العاصؓ رضہ کو حاکم بناؤ اور عبداللہ بن قیس کو اور معاویہ رضہ کو اپنی جگہ رہنے دو۔ ان کو آپ کے پہلے خلیفہ نے حاکم بنایا ہے، پھر ان سے ان کی حکومت کے لوگ خوش ہیں۔ عمرو بن العاص رضہ کو ان کے عہدے پر لوٹا دو۔ ان کا صوبہ ان سے راضی ہے۔ یہ سب باتیں میں نے کردیں لیکن اس نے مجھ پر زیادتی کی اور حق کے حدود سے متجاوز ہوا۔

میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں اور میرے وہ ساتھی جنھیں خلافت کی طمع ہے، جلد بازی سے کام لے رہے ہیں، انھوں نے مجھے نماز سے روک دیا ہے۔ میرے اور مسجد کے درمیان حائل ہوگئے اور مدینے میں لوٹ اور غارت گری مچا دی ہے۔ میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں اور یہ لوگ میرے سامنے تین باتیں پیش کر رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں ہر اس شخص کا بدلہ دوں جس کو مجھ سے بجا یا بے جا نقصان پہنچا ہو، دوسری یہ کہ میں خلافت سے دست بردار ہوجاؤں تاکہ یہ لوگ کسی دوسرے کو خلیفہ بنالیں، تیسری یہ کہ میں ان کے کسی ہم خیال صوبے یا شہر تک چلا جاؤں۔ جہاں میری اطاعت سے گلوخلاصی حاصل کرلیں میں نے ان سے کہا، پہلے کے خلفاء سے بھی بے جا یا بجا غلطیاں ہوئی ہیں لیکن ان سے کسی نے بدلے کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ میں اللہ عزوجل کے کام اور خلافت سے دست بردار ہوجاؤں، تو مجھے یہ گوارا نہیں۔ اس سے زیادہ پسندیدہ میرے لیے یہ ہے کہ مجھ پر کتے چھوڑ دیئے جائیں اب رہا شہروں میں میرا بھیجا جانا جہاں لوگ میری اطاعت سے انکار کریں تو میں ان کا کوئی مختار نہیں ہوں، پہلے بھی میں نے اپنی اطاعت پر ان کو مجبور نہیں کیا تھا انھوں نے تو اپنی اصلاح اور خدا کی خوشنودی کے لیے خود ہی اطاعت کا اعلان کیا، تم میں سے جو بھی صرف دنیا کا طلبگار ہوگا اس کو اتنا ہی ملے گا جتنا خدا نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اور جس کا مقصود اللہ اور آخرت ہے، امت کا مفاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دونوں خلفاء کی سنت ہے تو اللہ اس کو اس کی جزا دیگا۔ میرے ہاتھ اس کی جزا نہیں، اگر میں تم کو ساری دنیا بھی دیدوں تو یہ تمھارے دین کی قیمت نہ ہوگی، پس خدا سے ڈرو اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کا ٹھیک اندازہ کرو۔ تم میں سے جس کو عہد و پیمان توڑ دینا ہو۔ میں اس کے لیے یہ پسند نہیں کرسکتا اور

ل پہلی روایت اور اس بیان میں اختلاف معلوم ہوتا ہے اس پر ہم کتاب کے دوسرے حصے میں بحث کریں گے۔

نہ خدا کو یہ پسند ہے کہ اس کا عہد و پیمان توڑ دیا جائے، مجھ کو جو چیز پیش کی جا رہی ہے وہ حقیقت میں موت ہے اور دوسرے کو خلیفہ بنا دینا، میں اس کو اللہ سبحانہٗ کی نعمت کو پھیر دینا تصور کرتا ہوں اور خونریزی کو، امت میں نفاق کو اور بُرے طریقے کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر تم سے کہتا ہوں کہ صرف حق اور عدل کا دامن پکڑو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس کے معاملے میں عہد کی پابندی کرو ارشاد خداوندی ہے:- اوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولاً۔ یہ میری اللہ سے معذرت ہے شاید تم کچھ نصیحت پکڑو، اما بعد! میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا۔

ان النفس لامارة بالسوء الا ما رحم ربي ان ربي غفور رحيم

میں نے اگر کچھ لوگوں کو سزائیں دی ہیں تو اس سے میرا مقصد بھلائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں اپنے ہر کام سے خدا کی طرف رجوع ہوتا ہوں اور اس سے مغفرت چاہتا ہوں، اس کے سوا کوئی درگذر کرنے والا نہیں میرے رب کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔

انه لا يقنط من رحمة الله الا القوم الضالون۔ انه يقبل التوبة عن عباده و يعفو عن السيئات و يعلم ما يفعلون۔

میں خدا سے تمہاری اور اپنی مغفرت چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس امت کے دل بھلائی پر جمع کر دے اور فسق سے ان کو دور رکھے۔

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته ايها المؤمنون المسلمون

نقوش سیرت

مصنفہ: ڈاکٹر طٰہٰ حسین

ترجمہ: حافظ رشید احمد ارشد مرحوم

حصہ اوّل، دوم یکجا ——— صفحات ۵۲ ،

گولڈن پلاسٹک کور

حیات فاروق اعظمؓ

مصنفہ: ابن جوزی

ترجمہ: شاہ حسن عطا مرحوم ——— صفحات ۴۶۴

بڑا سائز گولڈن جلد

حضرت علیؓ

تاریخ اور سیاست کی روشنی میں

مصنفہ: ڈاکٹر طٰہٰ حسین

صفحات: ۲۸۸ ——— گولڈن جلد

نفیس اکیڈیمی اُردو بازار کراچی